رجسٹرڈ نمبر اے - ۱۵۱۶

# اُردو کا ماہوار رسالہ






بیادگار خان بہادر حضرت لسان العصر

سیّد اکبر حسین صاحب مرحوم الہ آباد

زیر نگرانی

## اراکین انجمن دار الادب

الہ آباد

## مدیر

تسلیم الدین شرقی - بی - اے -

## معاونین مدیر

حسین احمد کشفی - بی - اے - سید طالب علی طالب الہ آبادی - اسرار احمد (فاضل دینیات)

چودھری سید افضال احمد (فاضل ادب)

# جلد (۲) رسالہ اکبر بابت ماہ فروری ۱۹۲۶ء نمبر (۲)



| نمبر شمار | مضمون | مضمون نگار | صفحہ |
| --- | --- | --- | --- |
| ۱ | غزل حضرت شاد بر مطلع اکبر | راجۂ راجان ہز اکسلنسی مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب شاد صوفی مدظلہ العالی | ۲ |
| ۲ | خطوط اکبر | بنام سید عشرت حسین صاحب ڈپٹی کلکٹر | ۳ |
| ۳ | افکار روحی و حسن کلام | مولوی محمد زبیر صاحب روحی و سید ماجد علی صاحب ماجد - بی - اے - ال ال بی | ۶ |
| ۴ | حکماء اسلام | مدیر | ۷ |
| ۵ | حامد العد افسہ | اسرار احمد صاحب معاون مدیر | ۱۸ |
| ۶ | تعلیم بالغان | پروفیسر سید محمد حفیظ صاحب - بی - اے - ال - ٹی - | ۲۸ |
| ۷ | اظہار غم | قمر الدین احمد صاحب قمر - بی - اے - | ۳۲ |
| ۸ | تار گھر | ڈاکٹر اعظم صاحب کریوی | ۳۳ |
| ۹ | غزل | سید جمیل احمد صاحب طاہر حسنی الحسینی | ۳۶ |
| ۱۰ | بچوں کی تربیت | سید افضال احمد صاحب معاون مدیر | ۳۷ |
| ۱۱ | عالم خیال | رسول احمد صاحب خیال | ۴۱ |
| ۱۲ | بات چیت | حسین احمد صاحب کشفی - بی - اے - | ۴۲ |
| ۱۳ | شکوۂ گردوں | محمد اسد خاں صاحب - بی - اے - ملتانی - | ۴۷ |
| ۱۴ | سیاعیات | پروفیسر زبید احمد صاحب - ایم - اے - | ۴۸ |
| ۱۵ | نغمۂ جذبات | سید احسان علی صاحب کوثر علوی | ۵۸ |
| ۱۶ | ایک واقعہ | سید ماجد علی صاحب ماجد - بی - اے - ال ال - بی - | ۵۹ |
| ۱۷ | کلام اعظم | ڈاکٹر اعظم صاحب کریوی | ۶۲ |
| ۱۸ | دربار اکبری | مدیر | ۶۳ |

# مطلع اکبر مرحوم

جدا رہتا تو ہوں تم سے مگر دل خوش نہیں رہتا
جو بس ہوتا جہاں رہتے ہو تم میں بھی وہیں رہتا

## غزل حضرت شاد

وہ ہوں غم دوست جو دم بھر کہیں بھی خوش نہیں رہتا
اگر جنت میں بھی رہتا تو شاید دل حزیں رہتا

نہ ہر گز شاد میں یوں غم کش و اندوہ گیں رہتا
اگر اقبال و اکبر پاس ہوتے میں کہیں رہتا

کہیں بھی ہوں تمھاری یاد سے غافل نہیں رہتا
اگر کعبہ کو بھی جاتا تو بت در آستیں رہتا

نہیں پابند کچھ دیر و حرم کا صلح کل ہو کر
مجھے وحدت پرستی میں خیال دیں نہیں رہتا

حرم میں دیر میں رہتا کہ دشت و کوہ و دریا میں
تمھارا نام لیوا ہی میں کہلاتا کہیں رہتا

اُٹھا کر پردہ آنکھوں سے ادھر آیا ادھر گذرا
خیال یار کیونکر وقت خواب واپسیں رہتا

بڑھی مشق سخن اس کی یہ میری بے نیازی سے
کہ ناصح چاہتا ہے میں قیامت تک یہیں رہتا

ستاتا تھا مجھے ظالم مگر اتنا ستاتا تھا
کہ تیرے دوستوں کو تیری الفت کا یقیں رہتا

ق

نہ کر منعم غرور اتنا کہ دنیا چند روزہ ہے
زمانہ ہر کسی کا ایک حالت پر نہیں رہتا

زمانہ کی دورنگی پر نظر کر چشم عبرت سے
جو کل تھا زیب کرسی آج وہ زیر زمیں رہتا

یہ ہے مانا ہوا سب کا زمانہ ایک حالت پر
نہیں رہتا، نہیں رہتا، نہیں رہتا، نہیں رہتا

فلک پر دیکھتے ہیں ہم کہ ہے خورشید کو گردش
بھلا آسودہ کوئی کب یہاں زیر زمیں رہتا

جگہ کر لی دل سوزاں میں تیری گرمجوشی نے
غلط ٹھہرا کہ پارہ آگ پر قائم نہیں رہتا

مری جانب سے وہمی ہے طبیعت کا وہ شکی ہے
نہیں اس بدگماں کو قول کا میرے یقیں رہتا

اُٹھے پہلے ہی ارباب کمال اے شاد دنیا سے
ہمارے بعد کوئی تو ہمارا جانشیں رہتا

# خطوطِ اکبر

ان خطوط کے جملہ حقوق محفوظ ہیں کوئی صاحب بلا اجازت سید عشرت حسین صاحب ڈپٹی کلکٹر نقل اخذ و ترجمہ کی جرأت نہ فرمائیں۔

۹ جولائی ۱۹۱۹ء روز دوشنبہ — عزیز از جان سلمہ اللہ تعالیٰ

مسٹر حسن علی صاحب جنٹ مجسٹریٹ کروی ضلع باندا کو تبدیل ہوئے شاید تین ماہ بعد آئیں۔ اُن کی گاڑی میرے احاطے میں رہ گئی گھوڑا ساتھ لے جائیں گے، مجھکو اُن کے جانے کا افسوس ہے، بہت سادہ طبیعت کے جنٹلمین ہیں اور ہمدرد بھی ہیں، دلیر آدمی ہیں اور دانشمند۔ راجہ رامپال سنگھ صاحب نے اپنی ممبری کے لئے ووٹ مرزاپور سے حاصل کرنے کے لئے مجھکو تحریر فرمایا تھا۔ میں ساری دنیا سے الگ تھلگ رہتا ہوں، کسی کا احسان لینا نہیں چاہتا تاہم کچھ اشارات کر دئے تھے لیکن یہاں اور رئیسوں کا زور ہے اُن کے لئے ووٹ ہوگا۔ آج راجہ صاحب نے خان بہادر کے خط کے ذریعہ سے مجھلے میاں اور مولوی اقبال علی صاحب کو یہاں بھیجا ہے، یہ لوگ یہاں مقیم ہیں اس وقت اسی کام کی دھن میں شہر گئے ہیں، بارہ بجے شب کو جائیں گے۔ خان بہادر صاحب کو راجہ صاحب کے ارشاد کی تعمیل ضروری تھی۔ مجھکو تعجب ہوتا ہے کہ راجہ صاحب کا راج اور کنارہ دریا اُن کا گاتا بجانا اُن کے مصاحب و مشیر اُن کا اخبار۔ اُن کی قابلیت اُن کو خوش اور آسودہ رکھنے کو کافی نہیں ہے اور وہ ممبری کے لئے زحمتیں اُٹھاتے ہیں۔ اور یہاں ہندوستان کی ممبری محض تماشا ہے، اس پر بھی یہ بندے جان دئے ڈالتے ہیں۔ میں تو خدا کا شکر کروں اگر امن اور خوشی سے فارغ البالی سے زندگی بسر کروں۔ کتب خانہ دل بہلانے کو اور تندرستی خوش رکھنے کو اور خدا کا خوف اور اُس کی یاد مطمئن رکھنے کو کافی ہے۔

"اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ"

(ترجمہ) بیشک خدا کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے۔

قرآن مجید کی آیت ہے

لیکن یہ کہو کہ ہر شخص کی طبیعت ہے، اگر اختلاف مذاق نہ ہو تو دنیا کا کام کیونکر چلے۔ اگر باربرداری کے جانور ہرن کا مزاج اور اُس کی وحشت و رعنائی اختیار کریں تو بڑا حرج ہو۔

ـــہ تعلقہ دار کالا کانکر ضلع پرتاب گڈھ ۱۲

منجھلے میاں نے ہاشم سلمہ کو دو روپیہ دئے۔ ہاشم کو زکام ہوا ہے کھانسی آتی ہے لیکن اب کمی ہے۔ تمھارا خط کل پہنچا ایک نہیں دو۔ مامائیں نہال ہوگئیں کہ تم نے نام بنام سلام لکھا سب دعائیں دینے لگیں۔ حافظ نے بھی تمھارا خط بھیجدیا۔ شعر تم نے خوب لکھا ہے۔ دشمن پیدا۔ الحمدللہ کہ تم موقع پر اشعار پڑھ سکتے ہو۔ تمھارا خط اُردو نہایت ہی اچھا معلوم ہوا گویا چھپا ہوا تھا اس میں تم نے کسی قدر ترقی کی ہے لیکن ایسا خط لکھنے میں دیر لگتی ہوگی لہذا زیادہ التزام ضروری نہیں انگریزی خط تمھارا ہمیشہ سے پاکیزہ ہے۔

۱۰ر جولائی

منجھلے میاں اور مولوی اقبال علی صاحب رات مرغ پلاؤ کھا کر تشریف لے گئے۔ حضرت بخش بھی اُن کے ساتھ تھے

ہاں صاحب تمھارے اُردو خط کی تعریف کردی لیکن ہنوز گنجائش ترقی ہے۔ میم سیدھی نہیں رہتی کیا۔ میم (بیائے مجہول یعنی (maim) ہے کہ خواہ مخواہ ٹیڑھی ہو جاتی ہے

تم نے خوب لکھا کہ جب عشرت وہاں نہیں تو آپ کو عشرت کیونکر ہو۔

حسن میاں عشرت منزل میں بدستور اُسی طرف جہاں پہلے رہتے تھے مقیم ہیں اب کوئی علاج نہیں ہے خدا کے بھروسے پر ہیں۔ درد کی شدت اکثر ہوتی ہے اور بیتاب ہو جاتے ہیں لیکن جب درد نہیں ہوتا تو ایسے ہو جاتے ہیں کہ گویا کچھ خفیف سی شکایت ہے۔ بلکہ کوئی نہ جانتا ہو تو وہ یہ بھی نہ سمجھے کہ یہ علیل ہیں۔ چنانچہ اُنھوں نے خط میں لکھا کہ سہ پہر کو میں چوک چلا گیا تھا۔ دیکھئے خدا کو کیا منظور ہے۔ اگلے سنیچر یعنی ۱۴ر جولائی کو میرا قصد الہ آباد جانے کا ہے خان بہادر صاحب پریانواں سے تشریف لائیں گے یہی مقصود ہے کہ حسن کی عیادت کریں اور آئندہ طریق علاج کے متعلق مشورہ کیا جائے۔

تمھاری ماں تو اصرار کرتی ہیں کہ تھوڑا سا چنبیلی کا تیل اور تھوڑا سا عمدہ عطر بھیجدو لیکن میں بغیر تمھاری تحریر اور طلب کے بھیجنا غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ رات حکیم عزیز احمد صاحب ملیح آباد سے آئے شہر میں کہیں ٹھہرے ہیں اُن کا ارادہ ہے کہ یہاں مختاری کریں۔ امید ہے کہ کامیابی ہو

مولانا شہباز موجودہ مشہور لوگوں کا تذکرہ لکھنا چاہتے حیدرآباد سے مجھکو لکھا ہے کہ آپ اپنے حالات اور منتخب اشعار لکھدیجئے۔ میں نے لکھا کہ خود اپنا حال لکھنا نہایت مشکل ہے لیکن اُنھوں نے

اصرار کیا ہے۔ ارادہ ہے کہ کچھ لکھ بھیجوں۔ مولوی شہباز صاحب نے مجھکو لکھا کہ حیدرآباد میں ایک مولوی حسب فضا کہتے تھے کہ میں میر اکبر حسین کا استاد ہوں وہ مجھ سے عربی پڑھتے تھے۔ یعنی کافیہ۔ میں نے لکھا کہ درست ہے، ایک مولوی صاحب یہاں تشریف فرما تھے، میں اُن سے علم سیکھنا تھا وہ مجھ سے عقل سیکھتے تھے۔ لیکن دونوں ناکامیاب رہے۔ مولانا شہباز نے لکھا کہ میں اس لطیفے پر ہنس پڑا۔ جیلر صاحب نے پھر تمھاری خیریت دریافت کی ہے۔

میں تم کو شاید اس سے پہلے لکھ چکا ہوں کہ تفضل کو میں نے اپنے پاس خاص اپنی خدمت میں رکھا ہے۔ اس مناسبت سے کہ وہ تمھارا خان ساماں تھا میں اُس کو بہت محبت اور مہربانی سے دیکھتا ہوں اور ایک گونہ تسکین ہوتی ہے۔ منشی الطاف حسین کے رہنے سے بھی ایسے ہی خیالات ہیں۔ زاہد میاں کی تبدیلی عنقریب میجا ضلع الٰہ آباد میں ہوا چاہتی ہے۔ اچھا ہے ہم سے قریب ہو جائیں گے۔ معلوم نہیں تم کس قطع کے مکان میں ہو، فرنیچر کیسا ہے، خدام کون ہیں، کوٹھے پر رہتے ہو یا نیچے، موسم کا کیا حال ہے، کھانے میں کیا چیزیں ہیں، ذرا وقتاً فوقتاً ان باتوں کو لکھتے رہو، ہم لوگ بہت مشتاق رہتے ہیں خصوصاً تمھاری ماں۔ کچھ ضرور نہیں کہ تم بہت بنا کر اور قلم روک کر لکھو۔ بے تکلف انگریزی میں خواہ اردو میں خواہ دونوں میں لکھ دیا کرو اور ضرور نہیں کہ ایک ہی خط میں سلسلہ وار لکھو جب دل چاہا کسی امر خاص کی نسبت ایک خط لکھکر پوسٹ کر دیا۔ اچھا ہے دو چار خط ہر ہفتہ پہنچا کریں لیکن یہ صرف ایک سجیشن ہے میں تمھاری آزادی میں خلل نہیں ڈالتا۔ اصل چیز توجہ ہے تحصیل علم کی طرف، جس کے لئے اس عمر میں بہادری کر کے سات سمندر پار گئے ہو۔ خان بہادر صاحب نے ایک میں لکھا تھا کہ "ہمارا بہادر نوجوان"

۱۲ر جولائی ۱۹۱۰ء روز پنجشنبہ

اگرچہ ڈاک کل روانہ ہو گی لیکن آج ہی خط پوسٹ کر دونگا۔ ہاشم میاں اچھے ہیں، تمھاری یاد دلایا کرتے ہیں، اپنے بھائی جان پر پڑا ہے۔ وہی آنکھیں وہی گردن وہی شان۔

دو بکریاں پلی ہیں، چنا کھاتی ہیں، اس لئے کہ خان بہادر آئیں تو عمدہ گوشت میسر آئے لیکن سر دست تو ہاشم میاں اُن سے کھیلتے ہیں۔ ارادہ ہے کہ ہاشم کے لئے ہرن کا بچہ منگا دوں، رات صاحب کلکٹر مسٹر ونڈھم مجھ سے ملنے تشریف لائے تھے، بہت دیر تک بیٹھے رہے تمھاری سسرال سے خوب واقف ہیں۔ یہ صاحب ضلع رائے بریلی میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ تمھارا ذکر رہا۔ تفصیل

اس کی انگریزی چٹھی میں لکھتا ہوں - میں بفضلہ تندرست ہوں -

اکبر حسین



# افکار روحی

گئی فصل گل تو نہ گل رہے نہ گلوں کی جامہ دری رہی
نہ وہ رنگ و بو کی فضا رہی نہ چمن کی جلوہ گری رہی

تری یاد میں تھی وہ بیخودی کہ نہ فکر نامہ بری رہی
مری وہ نگارش شوق بھی کہیں طاق ہی پہ دھری رہی

نہ شباب ہے نہ امنگ ہے وہ زمانہ ہائے کہاں گیا
نہ وہ فصل گل میں جنوں رہا نہ وہ فکر جامہ دری رہی

وہ فغان بلبل زار تھی کہ چمن میں حشر بپا ہوا
مگر آہ وہ مری آہ غم کہ رہین بے اثری رہی

نہ سُنا مجھے مرے ہم نفس نہ سُنا وہ قصۂ فصل گل
نہ وہ دل میں شوق چمن رہا نہ امید بال و پری رہی

میں کلام کیا کروں ہمنشیں کہ نہیں کوئی مرا ہم زباں
کہیں آہ قدر ہنر نہیں وہی قدر بے ہنری رہی

ذرا دیکھ روحیؔ بے خبر وہ نشان صبح ہیں جلوہ گر
تجھے اب بھی خوف خدا نہیں وہی آہ بے خبری رہی

روحی

---

نہیں کچھ حاجت ساماں جنون طرفہ ساماں کو
دعا دیتا ہوں بیٹھا اپنے دامان و گریباں کو

تمنائے جگر دیکھوں کہ دیکھوں دل کے ارماں کو
تمھیں کہہ دو کہاں رکھوں تمھارے ایک پیکاں کو

وہ عزت دی مجھے صحرا نے لیکر اپنے دامن میں
ملاتا ہوں وطن کے پھول سے خار بیاباں کو

مری ناکامی حسرت نہ پوچھ اے پوچھنے والے
دعا دیتا ہوں میں رہکر قفس میں بھی گلستاں کو

کب آئی کب گئی باد بہاری کیا خبر ہم کو
مبارک صحبت گل خوش نصیبان گلستاں کو

اسی اک آرزو میں جان دی ہے مرنے والوں نے
کہ بھولے سے کبھی تم دیکھ لو گور غریباں کو

بس اتنا ہی نشاں عالم میں اپنا آج باقی ہے
کہ ابتک یاد کرتے ہیں وہ میری شام ہجراں کو

دیار غیر میں صبح وطن کا کیا گلہ ماجدؔ
خدا رکھے سلامت لذت شام غریباں کو

ماجد - بی - اے

# حکماء اسلام

دو سو برس کی طول طویل نیند کے بعد اب پھر مشرق بیدار ہو رہا ہے۔ جو ولولے اور جذبات ترک ایرانی، ہندی سولہویں سترہویں صدی میں لیکر اُٹھے تھے اور جو انجام کار اس زمانہ کے تمدن و تہذیب کے موجد ہوئے تھے رفتہ رفتہ کرکے ختم ہو گئے۔ عثمانی، صفوی اور مغل کی لڑائیوں اور فتوحات سے ان کی عمومی طاقت کا غیر معمولی اسراف ہو گیا۔ ان میں وہ پہلی سی تیزی اور ذکاوت باقی نہ تھی۔ انھیں مجبوراً اپنی منتشر قوتوں کو مجتمع کرنے کے لئے ایک عرصہ دراز کے لئے خاموش ہو جانا پڑا۔ لیکن ایام خاموشی میں بھی ایشیا تخیلات کے فضائے آسمانی پر چڑھ کر اپنے شاندار کارناموں کو یاد کیا کرتا تھا۔ اٹھارویں اور انیسویں صدیاں ایشیا کے لئے منحوس کہی جاتی ہیں لیکن سچ پوچھو تو اسی وقت انھیں اپنے پستیوں کا خیال ہوا

اس بیداری کا اثر ایشیا کے تین ٹکڑوں پر زیادہ ہوا۔ چین، ہندوستان اور مغربی ایشیا موخر الذکر اسلام کا وطن ہے۔ آجکل یہاں ہر روز کچھ نہ کچھ ہلا دینے والے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں جن کی آواز بازگشت تمام ہندوستان میں گونج جاتی ہے۔

خود ہمارے ملک میں بھی قومیت کا احساس ہو گیا ہے، یہاں کے لوگوں میں بھی نئی زندگی کا صور پھونک دیا گیا ہے، لیکن ہندوستان کی بیداری صرف سیاسی نہیں ہے، اس لئے ہماری تہذیب و تمدن میں بھی ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ اس کا اثر ہمارے فنون لطیفہ، ادب، فلسفہ و مذہب سب پر پڑ رہا ہے۔ لیکن ہندوستان کی آئندہ تہذیب کسی ایک فرقہ کے عقاید پر مبنی نہ ہوگی۔ ہمارے تمدن کا دارمدار ہندوستان کے ہر فرقہ کی خوبیوں پر ہوگا۔ اپنے گذشتہ کارناموں کے لئے ہندو مسلمان دونوں مل کر ایک متحدہ قومیت کی داغ بیل ڈالیں گے۔

اس لئے ہمیں اِن دونوں فرقوں کے گذشتہ کارناموں کو بہت ہی ہمدردی سے مطالعہ کرنا ہوگا۔ آج کی صحبت میں میں آپ لوگوں کے سامنے اسلام کے زبردست تمدن کا ایک رُخ پیش کرونگا

حضرت محمدؐ بانی اسلام رسول بھی تھے اور مدبر بھی۔ وہ عالم الٰہیات یا فلسفی نہ تھے۔ انکی تعلیم ذاتی تجربہ پر مبنی تھی، وہ بہت ہی سادی اور دلکش تھی، وہ صرف توحید کا پیام دینے آئے تھے۔ جو سلوک لامذہبوں کے ساتھ دوسری دنیا میں کیا جائیگا اس کا تذکرہ وہ اکثر کر دیا کرتے خوف اور شک کی تکالیف سے نجات حاصل کرنے کے لئے اُنھوں نے اپنے آپ کو خدا کی مرضی پر چھوڑ دیا تھا۔ حق و راستی کے متلاشیوں کو امن کی دعوت دیدی۔ آپ نے کہ دیا "اگر تم حیات ابدی کے طالب ہو، اگر تم چاہتے ہو کہ تمھیں سچی اور لازوال خوشی نصیب ہو تو فلسفۂ صبر و رضا کا مطالعہ کرو

آپ کے مذہب میں تین باتیں قابل لحاظ ہیں۔

(۱) خدا کی قربت و طاقت کا یقین کرنا۔

(۲) خدا کی نافرمانی کے نتائج۔

(۳) خدا کے لطف و کرم کی امید۔

درس و تدریس میں آپ شاعرانہ تخیل سے زیادہ کام لیتے، اپنے خیالات کی اشاعت آپ اس پُرزور لہجہ میں فرماتے کہ لوگ خود بخود کھنچے چلے آتے، آپ کے پُرزور کلام میں کوئی منطقیانہ بحث نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کوئی باقاعدہ فلسفہ، الٰہیات پیش کرنے سے قاصر ہے۔

آنحضرت کوئی فلسفہ پیش کرنے کے لئے نہیں آئے تھے، ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ لوگوں میں مذہبی احساس پیدا ہو جائے تاکہ حیات انسانی ارفع و اعلیٰ کرکے وہ عرب کے جنگ جو اور منتشر قبیلوں کو ایک ہی لڑی میں منسلک کر دیں۔ سالہا سال سے اس ملک کے باشندے جہالت اور توہم پرستی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان کے اخلاق خراب ہو گئے تھے۔ عرب کے منتشر و متفرق قبیلوں میں اتفاق و یگانگت نہ تھی۔ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ لیکن آنحضرت نے (اپنی زبردست شخصیت کی مدد سے) انھیں پستی اور جہالت کے عمیق غار سے نکال کر ایک صاف اور خوشگوار فضا میں بٹھا دیا۔ بلاشک یہ ایک زبردست کارنامہ ہے۔ اپنے حین حیات میں متفرق اور منتشر قبیلوں میں اتحاد کی روح پھونک کر ان کے دل و دماغ کو مسخر کر لینا کوئی معمولی کام نہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر

کی اعلیٰ ترین شخصیت کا اثر تھا کہ عرب متحد و متفق ہو گئے۔

آنحضرت کی میعادِ رسالت صرف ۲۳ برس رہی آپ کو اتنا کافی وقت نہ ملا کہ وہ ان کے حسد و حقارت کے بھڑکے ہوئے شعلوں کو ہمیشہ کے لئے بجھا دیتے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کے انتقال کے بعد بغض و حسد کے خوفناک شعلے پھر مشتعل ہو گئے اور عہدِ گذشتہ کی طرح ایک قبیلہ دوسرے سے لڑنے کے لئے تیار ہو گیا۔

آنحضرت کے وصال کے بعد دو جماعتیں ہو گئیں۔ ایک تو وہ جو جمہوریت کے موافق تھے۔ جو کسی خاص فرقہ یا قبیلہ کو برسرِ حکومت نہیں دیکھنا چاہتے تھے بلکہ اُن کی خواہش تھی کہ جو شخص اسکا اہل سمجھا جائیگا وہ خلیفہ بنایا جائے گا۔ دوسرے وہ تھے جو چاہتے تھے کہ خلافت اہلِ بیت کو ملنی چاہیئے۔ ان کی موجودگی میں کوئی دوسرا شخص اس کی اہلیت نہیں رکھتا۔ ان لوگوں کی رائے میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور اُن کی آل و اولاد کو خلافت ملنی چاہیئے تھی۔ اسی زمانہ سے سیاسی نزاع مذہبی مناقشہ میں مبدل ہو گئی۔ حامیانِ علیؓ بنی امیہ کو "لامذہب، ظالم، خدا کے احکام کو ٹھکرانے والے" کہنے لگے۔ خاندانِ بنی امیہ کو برباد کرنا اور ان کے حامیان پر لعن طعن کرنا ان کے مذہب میں داخل ہو گیا۔ بنی امیہ مشرک ہو گئے اور نماز وغیرہ میں ان کی پیروی خلافِ مذہب ہو گئی۔

لیکن حکومت خاندانِ بنی امیہ کو ملی۔ ایسے نازک وقت میں مذہبی قسم کی حکومت کے خواب دیکھنے والوں سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ صاحبِ اختیار دشمنوں کو بُرا بھلا کہیں یہ کہنا کہ ہم شاہِ وقت کو اپنا خلیفہ یا حکمران نہیں تسلیم کرتے آسان تھا لیکن اس پر عمل کرنا دشوار۔ پھر حکومت کی خوش حالی، قوم کا مفاد علمِ بغاوت بلند کرنے سے روکتا تھا اور شاہِ وقت کے سامنے قہراً جبراً جھکنا پڑتا تھا "آمنا بالقدر خیرہ وشرہ" کا خیال کرکے اور بھی خاموش ہو گئے۔ پھر ایک بڑے امام کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز ادا کرنا برا ہو سکتا ہے لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ ہم ایک قانون کے توڑنے والے پر کفر کا فتویٰ لگا دیں۔ اچھا اسلم کی جامع تعریف کیا ہو سکتی ہے۔ کیا مومن کے لئے صرف اعتقاد ہی کی ضرورت ہے یا یہ بھی ضروری ہے کہ اُس کے قول و فعل میں تضاد نہ ہو۔

غرضیکہ سیاسی مسائل نے مذہبی مباحثے چھیڑ دئے۔ عقیدہ، رسوم اور دیگر مذہبی مسائل پر نکتہ چینیاں ہونے لگیں۔

آنحضرت کی وفات کے بعد اسلام کا ہلالی پرچم ایران، شام اور دوسرے ممالک پر لہرانے لگا۔ نومسلمین میں مختلف خیال کے لوگ تھے۔ بہت سے ایسے تھے جن کے نظریہ اہل عرب سے بالکل جدا تھے۔ ان لوگوں نے قرآن کریم کے معنی اور رنگ میں لئے اور فطری طور پر ان کے اور عالم الہیات کے خیالات میں تصادم ہوگیا۔ عیسائی۔ یہودی اور دوسرے فرقوں سے ملنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی مباحثے ہونے لگے۔ یونانی علوم و فنون کے ترجموں نے تحقیقات کے نئے نئے راستے کھول دئے۔

اختلافات علم کے کسی ایک شعبہ تک نہیں محدود رہے۔ اخلاق مابعد الطبعیات قانون سب کے سب مذہب میں مخلوط ہوگئے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں بھی شروع ہی سے دو قسم کے لوگ پیدا ہوگئے۔ ایک وہ جو مذہب میں عقل سے کام نہ لیتے تھے قرآن کریم کے ظاہر لفظوں پر جاتے تھے۔ اُس کے معنی کا خیال نہیں کرتے تھے۔ آنحضرت کے اقوال وغیرہ کو وہ آنکھ بند کرکے تسلیم کر لیتے دوسرے وہ لوگ تھے جو وسیع النظر اور آزاد خیال تھے۔ اُن لوگوں نے اندھی تقلید کے خلاف آواز بلند کی۔ قرآن و حدیث کی ہر باتوں کو وہ تنقیدی نظر سے دیکھتے۔ وہ لفظوں کے ظاہری معانی پر نہ جاتے (اہل روایت واصحاب عقل)

ان دونوں کے درمیان ایک طبقہ اور تھا جس کے اصول اوپر کے دونوں فرقوں سے ملتے جلتے تھے۔ خدا کے متعلق اس تیسرے فرقہ کے ایک حصہ ظاہریہ اور مشابہ کا خیال تھا کہ خدا مجسم ہے تخت پر بیٹھتا ہے۔ اس کے ہاتھ ہیں۔ پیر ہیں غرضیکہ جس طرح قرآن شریف کے چند پاروں میں اس کا تذکرہ کیا گیا ہے اس کو لفظ بہ لفظ ٹھیک سمجھتے اور اس کے ظاہری معانی ہی پر جاتے۔ اہل روایت کے خیالات بھی اسی قسم کے تھے لیکن خدا کے اعضاء و تخت اور انسانی تخت و جسم میں فرق ہے۔ جو ذرا اور آزاد خیال تھے وہ کہتے کہ ہاتھ پیر اور تخت مجازاً استعمال کئے گئے ہیں۔ ان میں بہت سے ایسے بھی تھے جو صفات خداوندی کے متعلق کوئی معقول رائے نہ قائم کرسکے اور عجیب پیچیدہ اصول قائم کئے۔ ان کے نزدیک صفات خداوندی نہ تو اُس کے ذات میں ہیں نہ اُس سے

علاحدہ۔ تیسرے فرقہ کے دوسرے حصہ کا عقیدہ یہ تھا کہ خدا ایک ذات بسیط ہے جس میں کسی قسم کی آمیزش نہیں ہے۔ اس کے صفات و ذات میں کسی قسم کا فرق نہیں۔ وہ عالم الغیب والشہادہ ہے اور لاتدرک الابصار وہو یدرک الابصار اس کا شیوہ ہے۔

فلسفی ایک درجہ اور آگے بڑھ گئے۔ اُن کا خیال تھا کہ بجز وجود کے اور کسی چیز کا اطلاق خدا کی ذات پر نہیں ہوسکتا۔ وجود اور ذات مترادف ہیں اہل تصوف نے تو ہمہ اوست کہ کے منطق کا خاتمہ ہی کر دیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہر شخص فلسفی عالم الہیات وغیرہ سب کے سب مذہبی باریکیوں کو عقل کی مدد سے حل کرنا چاہتے تھے۔ بعد ازاں بہت سے لوگ عقل و تجربہ سے مایوس ہو کر کشف کی طرف راجع ہوگئے۔ اور مسلم تواریخ میں یہ اصحاب کشف کے نام سے مشہور ہوگئے۔ فقہا اور علماء نے ان لوگوں پر بہت مصیبتیں ڈھائیں۔

المختصر یہ کہ مسلم فلسفہ میں تین قسم کے لوگ ہیں۔ اصحاب نقل، اصحاب عقل، اصحاب کشف گو ان تینوں کے عقاید و خیالات میں فرق ہوتا ہم ظاہر ہے کہ یہ لوگ مروجہ اصول و رواسم سے مایوس ہو کر ہر ایک بات عقل کی مدد سے حل کرنی چاہتے تھے۔

معتزلی اس فرقہ کے اولین نمائندہ ہیں۔ وہ اسلام کے غیر متعصب عالم کہے جا سکتے ہیں۔ انکی ابتدا کا پتہ نہیں چلتا۔ اعتزال کے معنی عدول یا پھر جانے کے ہیں اور معتزلہ وہ ہیں جو مروجہ مذہبی عقاید سے منحرف ہوگئے تھے۔ کہتے ہیں کہ اس فرقہ کا بانی واصل بن عطا تھا۔ یہ حسن بصری کا شاگرد تھا۔ ایک روز ایک مسلم قاتل کے انجام پر بحث ہو رہی تھی۔ قبل اس کے کہ حسن بصریؒ اپنے خیالات کا اظہار کریں واصل بن عطا بولا کہ اس کے خیال میں وہ **لا مومن مطلق و لا کافر مطلق**۔ نہ تو مومن مطلق ہے نہ کافر مطلق بلکہ دو درجوں کے درمیاں میں ہے۔ (المنزلۃ بین المنزلتین) اگر قاتل اپنی حیات میں توبہ کر لے گا تو بہشت میں داخل کیا جائیگا ورنہ جب تک کہ وہ اپنے گناہوں کی سزا نہ بھگت لیگا دوزخ میں جلتا رہیگا۔ بعد ازاں واصل اور اُس کے خیال کے لوگ اس مسئلہ پر بحث کرنے کے لئے کمرہ کے دوسرے حصہ میں چلے گئے۔ اس پر حسن بصریؒ نے واصل کو معتزلی کہدیا۔ لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ معتزلی تاریک الدنیا

فقرا کا ایک گروہ تھا۔ خیالات عمر بن عبید اس کی مزید تائید کرتے ہیں۔ مسعودی بروایت عمر کہتا ہے۔" خواہش انسان کو اندھا بنا دیتی ہے۔ موت اس کے جذبات عالیہ چھین لیتی ہے۔ دنیا سرائے فانی ہے جہاں چند دنوں کے لئے انسان اپنا خیمہ نصب کرتا ہے اور پھر چلا جاتا ہے۔ اس کی دلفریبیاں فانی ہیں۔ اس کی خوشیوں میں تکلیف مملو ہے۔ تکلیف ہی اس کا اطمینان ہے۔ اور اس کی بادشاہت بغاوت ہے۔ انسان بازیچہ تقدیر ہے۔ موت اس کا انجام ہے۔ جان بچانے کے لئے وہ بھاگتا ہے موت اس کے گھات میں لگی رہتی ہے۔ اس کا قدم ڈگمگاتا ہے اور وہ گر پڑتا ہے۔ انسان اپنے ورثاء کو فائدہ پہنچانے کی کوشش میں خود کو بھسم کر ڈالتا ہے۔ لحد اس کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔" اس میں تصوف کی جھلک عیاں ہے۔

لیکن بہرحال رفتہ معتزلیوں کے خیالات تصوف سے جدا ہوتے ہوگئے۔ مذہبی علماء سے برابر چلتی رہی۔ یونانی فلسفہ نے اور بھی ان کے خیالات بدل دئے۔ معتزلیوں اور عالموں میں فرق یہ تھا کہ موخر الذکر کی آخری اپیل کتاب اور حدیث پر ہوتی تھی اول الذکر عقل کی طرف دوڑتے تھے۔ یہ تجربہ اور مشاہدات کی طرف جاتے تھے Descartes کی طرح شک کو علم کا پہلا زینہ سمجھتے تھے پچاس شبھے ایک تیقن سے بدرجہا بہتر تھے۔ ان کے نزدیک عقل حواس ستہ تھی۔ بشر بن معتمر ایک نظم معنون بہ عقل میں کہتے ہیں۔

" عقل ایک زبردست شے ہے۔ برائی اور بھلائی میں انسان کی ساتھی ہے۔ ایک منصف ہے جو حاضر و غائب اشیاء پر فیصلہ ناطق صادر کرتی ہے"۔ معتزلی خود کو اہل التوحید والعدل کہا کرتے تھے کیونکہ ان کی مابعد الطبیعیات کا دار مدار خدا کی وحدت پر تھا۔ ان کا اخلاق انصاف پر مبنی تھا۔ ان کا منشا یہ تھا کہ وہ ان خیالات کو جو اہل روایت نے خدا کے متعلق قائم کئے ہیں رد کر دیں۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ اہل روایت بہت ہی مضحکہ خیز مدارج پر پہنچ چکے تھے یہاں تک کہ شیخ تقی الدین ابن تیمیہ ایسے زبردست لوگوں کا خیال تھا کہ میدان حشر میں خدا اس طرح آئے گا جس طرح اس وقت میں ممبر پر سے اتر کر تمھارے درمیان آرہا ہوں (کنزولی ہذا) وحدت کے ثبوت کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ صفات خداوندی کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کر دیتے۔ ان کے نزدیک خدا کی ذات کو اس کی صفات سے علحدہ مان لینا گویا خدا

میں دو مرکب اور ایک سے زیادہ باتوں کا وجود تسلیم کر لینا تھا۔ ابو الہزیل نے اس پر پیچ مسئلہ کی تشریح اس طرح کی۔ صفات ہی کے بھیس میں وجود خدا عیاں ہے یعنی علم ہی عین ذات ہے۔ یہ تشریح مسیحیوں کے hypostasis سے بہت کچھ ملتی ہوئی ہے۔ البشیر نے تشریح وحدت کے لئے پانچ اصول قائم کئے۔ اس کے نزدیک ذریات۔ عارض۔ خالق۔ نوع کا ہونا ضروری تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ غیر ضروری صفات کا ترک کر دینا اور زیادتی صفات کے باوجود بھی مسئلہ وحدت کا قائل ہونا بھی ضروری تھا۔

الجبائی کی رائے میں صفات خداوندی وجود کے نمایاں اور ممیز حصہ ہیں۔ لیکن ذات باری سے علٰحدہ ان کی کوئی ہستی نہیں ہے اور اس حالت میں ان کا معلوم کرنا بھی دشوار ہے کیونکہ ذات صفات ہی سے عیاں ہے اور وہ شے جس کی بدولت وجود صفات عارضی سے منسلک یا علٰحدہ کیا جاتا ہے۔ محض وجود یا صفات عارضی سے متعلق نہیں رہتی۔ خداشناس کے نزدیک صرف صفات ہی وجود رکھتے ہیں۔

معمر ایک قدم اور آگے بڑھ گیا اور وجود صفات کا انکار کر دیا۔ خدا صفت علم سے بالکل بری ہے۔ کیونکہ اس حالت میں وہ فاعل و مفعول کے موافق ہوتا یا ان دونوں سے مرکب ہوتا۔

نظام اور اس کے شاگردوں نے یہ پیچیدہ مسئلہ حل کرنے کے لئے وحدت کے دو شعبہ کئے (۱) خدا کل اور اصل الوجود ہے (۲) اس کا وجود لازمی اور ضروری ہے اور وہ خالق ہے۔ یہاں معتزلیوں کا فلسفہ ویدانت سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ ویدانت نے بھی دو اصول کل اور لازمی قرار دئے ہیں۔ برہمن آیشور۔

تخلیق عالم کے متعلق ان لوگوں نے بہت ہی اچھے اچھے اصول قائم کئے۔ وحدت خداوندی اور عالم میں عقل کی مدد سے رشتۂ اتحاد قائم کرنا معمولی بات نہ تھی۔ یہ معتزلیوں ہی کا کام تھا کہ انھوں نے ان دونوں میں تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ مادہ غیر فانی ہے خدا نے مادہ کو صفات سے مالا مال کر کے قابل نظر بنا دیا۔ قبل الوجود نہ تو وہ ساکت تھا نہ متحرک اس وقت تک اس کی تخلیق ہی نہیں ہوئی تھی لیکن حیز وجود میں آتے ہی اس میں تمام مبہم قوتیں موسوم بہ صفات و عارضیات آگئیں۔ غرضیکہ رنگ، المبائی، ذائقہ، خوشبو وغیرہ مادہ ہی کی پیدا

کردہ ہیں۔ اور کائنات کی مختلف و رنگ برنگ کی شکلیں محض مادہ اولین کے زور نہائی کے طفیل میں نمایاں ہیں۔

خدا کا کام یہ ہے کہ قبل الوجود اور غیر نمایاں مادہ کو حیز وجود میں لائے۔ اس کے ظاہر ہوتے ہی دوسری چیزیں خود بخود ظاہر ہو جائیں گی۔ معتزلیوں نے خدا کو ایک غیر قابل تمیز شخصیت کے سانچہ میں ڈھال کر اس کی شخصیت ہی کا خاتمہ کر دیا۔

اخلاقیات میں معتزلی اختیار مطلق و قدرت کے قائل تھے۔ روح ایک عجیب قسم کا مادہ ہے اور عقل و علم اس کے عارضیات ہیں۔ فطری اور پوشیدہ قوت کی وجہ سے علم ایک صاف شفاف دریا کی طرح رواں ہے اور اس کا انحصار کسی بیرونی شے پر نہیں ہے اسی لئے وہ آزاد ہے اختیار (مرضی) صفات علم میں سے ہے کیونکہ جو کام اپنی مرضی یا خواہش سے کیا جاتا ہے اس کا علم فاعل کو ضرور رہتا ہے اور اس وقت جو کام وہ کرتا ہے اپنی مرضی و خواہش سے کرتا ہے۔ عقل ہی کی وجہ سے انسان آزاد ہے۔ وہ آزادی سے بلاخوف و خطر بلا کسی بیرونی دباؤ کے کسی خاص فیصلہ پر پہنچ سکتا ہے۔ اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ جب تک خدا نبی یا امام اس کو اچھے بُرے کی تمیز نہ بتائے وہ خاموش بیٹھا رہے۔ وہ خود اپنی عقل سے ایک چیز کی بھلائی بُرائی دیکھ کر اس کو بھلا بُرا کہہ سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ خیال کر لینا کہ خدا ایک ظالم حکمراں کی طرح جس وقت جو جی چاہے کر ڈالے درست نہیں ہے۔ دنیا کا باقاعدہ نظام اور ضابطگی قانون اس کے شاہد ہیں۔ ہمارے اور خدا کے تعلقات ایمانداری پر مبنی ہیں۔ انصاف کی اہمیت کو لوگوں کے دلوں پر نقش کرنے کے لئے وہ خود کو اہل العدل کہا کرتے تھے۔ جب انصاف خدا کا لازمی اصول ہو گیا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ رحیم بھی ہے اور انسان کی بھلائی۔ بہبودی و ترقی کا متمنی اس دنیا کی تکالیف و مصائب کا معاوضہ یا اجر انھیں اُس دنیا میں دیا جائیگا۔ ان کی موجودہ تکلیفیں اور تفکرات حیات ابدی کی خوشی سے مبدل ہو جائیں گی ان خوشیوں سے صرف انسان ہی بہرہ اندوز نہ ہوں گے جانوروں کو بھی موجودہ تکالیف۔ غم و الم کا اجر ملے گا۔ ان کا خیال تھا کہ قیام دوزخ بہت ہی عارضی ہوگا کیونکہ دوزخ و بہشت بھی آغاز و انجام رکھتے ہیں۔

المختصر یہ کہ ایمانداری زندگی کا ایک درخشندہ اصول ہے۔ انصاف یا ایمانداری مجموعہ

احکام عقل ہے۔ ابھی تک کوئی ایسا زبردست فتویٰ نہیں صادر ہوا جو انسانی زندگی کا خاتمہ کردے جو قواعد وضوابط اس وقت ہماری سوسائٹی میں رائج ہیں وہ ہماری اور سوسائٹی کی مجموعی دماغ سوزی اور تدریجی ترقیوں کے نتائج ہیں۔ قرآن کریم کے اوامر۔ منہیات۔ وعدہ وعید انسانی ترقی کے لئے ضروری ہیں اور اصول معاشرت کے مطابق۔

دوسرے معاملات میں معتزلیوں کے خیالات بہت ہی غیر متعصب اور وسیع تھے۔ ان کے نزدیک قرآن انسانی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ آسمانی وازلی نہیں تھا۔ اس سے زیادہ شستہ اور عمدہ قرآن تصنیف کیا جاسکتا ہے۔ اس کے واقعات۔ دھمکیاں۔ جھڑکیاں۔ وعدہ ہو اعید واقعات پر مبنی نہیں ہیں۔ ان سب کا مطلب یہ ہے کہ جہلا برائیوں سے بچیں۔ قرآن کا یہ کہنا کہ پل صراط بال سے زیادہ باریک تلوار سے زیادہ تیز ہے جس پر چڑھ کر مومن بہشت میں جائیں گے اور کافر دوزخ میں یا یہ واقعہ کہ بروز حشر لوگوں کے افعال تولے جائیں گے۔ مصنوعی ہے واقعی نہیں ہے۔ اسکی غرض وغایت صرف یہی ہے کہ لوگوں کے دلوں پر خدا کی ہیبت چھا جائے اور وہ برائیوں سے پرہیز کرنے لگیں۔

غرضیکہ فرقۂ معتزلی اسلام میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ وہی حضرات ہیں جنھوں نے مذہب میں بھی عقل کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ ان کا رجحان مذہب کے عملی رخ کی طرف زیادہ تھا۔ انھوں نے دینیات کو پاکیزہ تر بنانے کی بہت کوشش کی اور لوگوں کے سامنے ایک ایسا لائحہ عمل پیش کر دیا جو سوسائٹی کی تدریجی ترقیوں کو اپنے آغوش میں چھپائے ہوئے تھا لیکن باوجود اتنی وسیع النظری اور آزادخیالی کے وہ اپنے اخلاق زمانہ کی مروجہ روش سے بالاتر نہ دکھا سکے۔ مامون رشید کے زمانہ میں جب ان کا عروج ہوا تو انھوں نے علماء و فقہا کیساتھ وہی کارروائی کی جو موخر الذکر نے اپنے زمانۂ عروج میں ان کے ساتھ کی تھی۔

معتزلیوں کو دینیات سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ مسلمانوں میں وہ متکلمین کے نام سے مشہور ہیں۔ درحقیقت اہل فلسفہ وہ تھے جنھوں نے فلسفہ ہی کو اکتساب علم کا واحد ذریعہ مقرر کر دیا تھا اور جن کے نزدیک فلسفہ مذہب سے بلند تر درجہ رکھتا تھا۔ وہ ایک باقاعدہ مکمل مابعد الطبعیات دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے لیکن آخرکار کفر والحاد کے فتوی سے ڈرکر

وہ مذہب اور فلسفہ میں رشتۂ اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ارسطو فلسفۂ عرب پر بلا شرکت غیرے حکومت کر رہا تھا۔ مسلم فلسفیوں نے اس پر شرحیں لکھیں اور خود اپنی تصانیف بھی اسی کی طرز پر شایع کیں۔ ان کے اکثر نظریات اس کے ممنون احسان ہیں۔ لیکن ارسطو کی تصانیف اہل عرب کو سریانی زبان میں ملی تھیں۔ اول تو یہ خود ہی یونانی زبان سے سُریانی زبان میں ترجمہ کرکے لائی گئی تھیں اور جب پھر اس کا ترجمہ سریانی زبان سے عربی زبان میں ہوا تو ان کی وہ بھی رہی سہی خوبیاں ختم ہو گئیں۔

ان ترجموں نے اہل عرب پر بہت ظلم ڈھائے۔ ان کے اصلی اور صحیح خیالات اکثر اہل عرب تک نہ پہنچ سکے۔ یہاں تک کہ وہ Neoplatonic philosophy کو بھی ارسطو کے خیالات کا ایک پر تو سمجھ بیٹھے۔ لیکن پھر بھی ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ ارسطو کی جملہ تصانیف سے اہل عرب بہرہ اندوز نہیں ہو سکے تاہم اس کی منطق مابعد الطبعیات۔ نیچرل فلسفہ سے بہت کچھ واقفیت رکھتے تھے۔ ہاں اگر وہ ناواقف تھے تو اس کی معاشیات اور سیاسیات سے۔

علاوہ تصانیف ارسطو یونانی فلسفیوں کی بہت سی تصانیف مع ترجمہ ان کے پاس موجود تھیں۔ لہذا یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مسلم فلسفہ کچھ تو یونانی فلسفہ اور اُس کے اسکندریہ کے شارحین پر منحصر ہے اور کچھ فلسفہ مشرق پر۔ انھوں نے مختلف خیالات کو منظم کرکے مسلم خیالات کے سانچہ میں ڈھال دیا۔ اسی وجہ سے ان کا فلسفہ بھی جدت اور امتیاز کا پہلو لئے ہوئے ہے۔

مسلم فلسفہ کی ترویج و اشاعت زیادہ تر القندی فارابی۔ ابن مسکویہ ابن سینا۔ ابن بجا ابن طفیل و ابن رشد کا ممنون احسان ہے لہذا ان کے مختصر تذکرے غالباً ایسے موقع پر غیر موزوں نہ ہوں گے۔

ابن یوسف یعقوب بن اسحاق القندی خلفاے مامون و معتصم کے ایام خلافت میں ایک بہت زبردست فلسفی گذرا ہے۔ قندہ کے شاہی خاندان سے اس کا تعلق تھا۔ اس کا باپ المہدی اور رشید کے زمانے میں کوفہ کا گورنر تھا۔ اس کا دادا آنحضرت کے صحابیوں میں تھا اس کے پردادا کا نام قیس تھا جس کی تعریف و توصیف میں شعراے عرب نے زمین آسمان کے قلابے ملا دئے ہیں۔ بغداد و بصرہ میں تعلیم حاصل کی ریاضی۔ علم نجوم۔ طب۔ موسیقی

فلسفہ و سیاسیات کا مطالعہ کیا - یونانی - ایرانی و ہندی فلسفہ میں کافی مہارت حاصل کی - یہ پہلا عرب ہے جس نے ہندی طب کے اصول سے لوگوں کا علاج کیا - خلیفہ نے تصانیف ارسطو کے ترجمہ کے لئے اس کو مقرر کیا - اسے لوگ عرب کا فلسفی کہتے ہیں - اسی لئے ان کے فلسفہ کی ترتیب و تنظیم کی - لیکن انجام کار اس کو اپنی آزاد خیالی کی سزا بھگتنی پڑی - جب متوکل خلیفہ ہوا - القندی کا کتب خانہ ضبط کر لیا گیا اور وہ جلاوطن کر دیا گیا - اس کی تصانیف کے متعلق ہماری واقفیت بہت ہی محدود ہے - لیکن فیثاغورث کے فلسفۂ اعداد سے وہ بہت متاثر تھا - اس کا فلسفہ تخلیق کائنات و قدرت بہت کچھ خیالات Neoplatonic کے زیر اثر تھے - اس میں جدت طرازی نہ تھی وہ کوئی زوردار ذہن نہیں رکھتا تھا - لیکن یہ وہی شخص ہے جس نے سب سے پہلے Sensation and stunlous کے متناسب رشتہ کے خیال کی تردید کی - دینیات کے رو سے تو وہ معتزلی ہے لیکن اس کے نزدیک سقراط اکمل اور قابل تقلید انسان تھا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ افلاطون کی بصارت اور ارسطو کی دانائی کا خواہش مند تھا - وہ علم نجوم اور دیگر توہمات انسانی کو بہت برا کہتا تھا - (باقی آئندہ)

مدیر

---

# تاریخ وفات

## "لسان العصر" سید اکبر حسین صاحب اکبر الہ آبادی

---

گفت با عقل آسد چوں بشنید ۔۔۔ خبر ختم حیات اکبر
چیست تاریخ وفات اکبر؟ ۔۔۔ گفت "تاریخ وفات اکبر"
۱۹ ۲ ۲۱

محمد اسد خاں بی - اے - ملتان

# حامد اللہ افسر

جب دہلی برباد ہوگئی، لکھنؤ کی قسمت کا ستارہ غروب ہوگیا، اردو شعر و شاعری کا تعلق بھی ذوق سماعت ہی تک محدود رہ گیا اور جن روشوں کی بنا میر درد اور غالب نے ڈالی تھیں مرور ایام کی وجہ سے قریب تھا کہ ہندوستان کی شعر نواز زمین سے ہمیشہ کے لئے مٹ جائیں مگر، ہر ابتدا کے لئے انتہا، ہر زوال کے بعد کامیابی فطرت کا خاصہ ہے، جب اردو شاعری زوال اور انحطاط کی آخری منزلیں طے کر چکی، آغاز نے انجام کی شکل اختیار کر لی تو رفتہ رفتہ ظلمت میں تنویر، سیاہی میں روشنی نمودار ہونے لگی، سچ ہے ہر انتہا ابتدا کا پیغام لاتی ہے، ہر زوال عروج کا پیش خیمہ ہے۔

اگر کوئی شخص اردو کے اساتذہ متقدمین و متوسطین کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کرے تو سب سے پہلے جو چیز اُس کو اپنی طرف کھینچے گی وہ ہر شاعر کی ایک امتیازی خصوصیت ہے جو شاعر کے اعمال، اخلاق، عادات اور اعتقادات کی مظہر اور بہترین مفسر ہے۔

اگر آپ میر کے اشعار پڑھیں تو آپ بے تکلف ان کے اطوار، ان کی روزانہ زندگی کا اندازہ لگا سکتے ہیں، آپ ان کے اشعار میں وہی خودداری، وہی بے نیازی اور وہی سادہ دلی پائیں گے جو فی الحقیقت ان کے اندر تھی، اسی طرح آپ درد کا کلام دیکھ کر ان کی معرفت، ہمدردی اور دنیا سے بے تعلقی کا صحیح معیار قائم کرسکتے ہیں، غالب کا سخن ان کے تدبر، عالی خیالی، دقت پسندی کا کامیاب ترجماں ہے، غرضکہ پہلے اُردو شاعری گو کہ ملکی و قومی خصوصیات کا آئینہ نہ تھی مگر شخصی امتیاز تو ضرور اپنے اندر لئے ہوئے تھی، زمانہ کی نیرنگی نے میر و غالب کو کنج گمنامی میں ڈال دیا اقلیم سخن پر امیر و داغ کا سکہ بیٹھ گیا، محققین علم الالسنہ کا خیال ہے کہ جوں جوں زبان پرانی ہوتی جاتی ہے حقیقت اور واقعیت سے بعید اور تکلف سے قریب ہوتی جاتی ہے، اُردو بھی ایک زبان ہے، اسے بھی اس دور منحوس سے سامنا کرنا پڑا، اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ امیر

و داغ نے اُردو زبان کو محض تکلف آشنا کر دیا، نہیں، نہیں، ان حضرات نے اُردو زبان کی اتنی خدمتیں کی ہیں کہ ان کا نام اُردو کی زندگی و موت کیسا تھ وابستہ ہو گیا مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان حضرات نے اپنی زندگی تصویر کے ایک ہی رخ کی درستگی میں صرف کر دی، آمیر و داغ کی توجہات معانی و الفاظ تک محدود تھیں، بے شک معانی و الفاظ کی اُستواری بھی شاعری کا اہم رُکن ہے، مگر شاعری اسی پر ختم نہیں، شاعر کی حیثیت رہنما، رہبر سے کم نہیں، اگر اس میں یہ استعداد و قابلیت نہیں ہے تو کم از کم اپنے مافی الضمیر سے لوگوں کو خبردار کرنا اس کا فرض منصبی ہے جس سے وہ کسی طرح بھی عہدہ برا نہیں ہو سکتا، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ شاعر کو اپنے اشعار میں وہ سب باتیں رکھنی چاہئیں جن کی مدد سے ایک اجنبی اس کے عادات، اخلاق اور نظریات پر اجمالی عبور حاصل کر سکے، افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آمیر و داغ نیز ان کے معاصرین میں یہ امر ناپید تھا، کوئی شخص ان حضرات کے کلام سے ان کے حالات کا واقف نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ انھوں نے شاعری کے ایک ہی رکن الفاظ و معانی پر ساری قوت صرف کر دی تھی، اسی خدمت کے غلو میں وہ اپنے آپ کو بھول گئے تھے اور انھیں اس کا بھی احساس نہ تھا کہ شاعر کا ان کے علاوہ اور بھی کوئی کام ہو سکتا ہے۔

دور متاخرین کے بعد حالی ہی وہ پہلا شخص ہے جس کو اس عالمگیر کمزوری کا علم ہوا۔ اس نے اپنے فرض اور اس کی اہمیت کو اچھی طرح محسوس کیا۔ اس نے سمجھ لیا کہ شاعری کی کائنات اور اس کی دنیا الفاظ و معانی ہی تک محدود نہیں۔ صنایع و بدائع کے بغیر شاعری فضول ہے، وغیرہ وغیرہ، حالی ہی وہ شخص ہے جس نے اشعار کو مافی الضمیر کی ادائگی و اظہار خیالات کا آلہ بنایا اور اپنا پیام اشعار ہی سے قوم کے کانوں تک پہنچایا۔ حالی کے بعد جن حضرات نے اس صنف میں ترقیاں کیں اُن میں سے لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی و ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال خصوصیت سے قابل ذکر ہیں،

حامد اللہ صاحب افسر دور حاضر کے ان چند لوگوں میں ہیں جنھوں نے شاعری کے دونوں رکنوں کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ حضرت افسر کے کلام کو مطالعہ کرنے کے بعد اس کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ آپ شاعری کے لوازم پہ نظر رکھتے ہوئے دنیا کو کوئی پیام دینا چاہتے ہیں اور

اپنے بنی نوع کو کوئی بات بتانا چاہتے ہیں۔ آفسر صاحب کا کلام جملہ اصناف شاعری پر حاوی ہے۔ حمد نعت، غزل، نیچرل نظمیں اور فلسفیانہ خیالات وغیرہ باحسن وجوہ پائے جاتے ہیں۔ اب میں آفسر صاحب کے کلام پر ایک اجمالی اور مختصر نظر ڈالتا ہوں۔

دنیا کا ہر شاعر خصوصاً اگر وہ مشرقی ہے، اپنے اشعار کی ابتدا حمد خدا سے کرتا ہے افسر صاحب بھی اس کلیہ کے پابند ہیں۔

مشرقی علماء مذہب کا خیال ہے کہ انسان جب تک اپنے وجود کو نہ مٹا دے، خودی کا احساس پس پشت نہ ڈالدے خدا کو نہیں پا سکتا۔ دیکھئے اس خیال کو افسر صاحب کس خوبی سے ادا کرتے ہیں

تباہی سے مری اب بھی نشاں اتنا تو ملتا ہے — کہ خود کو کھو کے پایا ہے جسے وہ بے نشاں تم ہو

اسی مضمون کو ایک دوسرے مقام پر کس خوبی سے نظم کیا ہے ؎

ہائے انجام تجسس کی عجائب کاریاں — تم ملے اور ڈھونڈھنے والے تمھارے کھو گئے

فی الحقیقت تجسس اور تلاش کی آخری منزل یہی ہے کہ انسان آپے سے بے خبر اور مطلوب کی ذات میں مل جائے جو تلاش کا ثمر اور عین وصل ہے۔ اس شعر کا حسن بیان داد سے مستغنی ہے ؎

کیا جانے میں ہر در پہ کسے ڈھونڈھ رہا ہوں — یہ بھی مرے بس کی ہے کہ ہر در ترا در ہو

اللہ رے محویت مطلوب و مقصود کا تعین تک نہیں مگر ایک سودا ہے سر میں، ایک خیال ہے دماغ میں، ایک آرزو ہے دل میں جو ہر در پر لے جاتی ہے مگر مطلوب کا نشان نہیں ملتا آخر شاعر مایوسانہ لہجہ میں کہتا ہے ؏ "یہ بھی مرے بس کی ہے کہ ہر در ترا در ہو" جب کسی چیز کی خواہش انتہائے کمال کو پہنچ جاتی ہے تو تلاش کا پیدا ہونا ضروری ہے، پھر تلاش کا عروج اسی صورت میں ممکن ہے جب مطلوب کا خیال دل سے محو ہو جائے اور تلاش کرنے والا عالم محویت میں در در کی خاک چھانتا پھرے پہلے مصرع کے استفہام اور دوسرے مصرع کے التفات و تخاطب نے جو خاص لطف پیدا کر دیا ہے اس کا اظہار الفاظ کے ذریعہ سے ناممکن ہے۔ ان اشعار کی برجستگی و روانی ملاحظہ ہو

ہر پھول کے رنگ و بو میں تو ہے — کونپل میں نمو، نمو میں تو ہے
یہ رنگ خمار کہہ رہا ہے — تو ہے مرے سبو میں تو ہے
ہر چیز میں تو ہے جلوہ فرما — اللہ رے تیری خود نمائی

اسلام کا فلسفہ ہے کہ خدا ہر جگہ ہے، ڈھونڈھنے والا چاہیئے، اسی لئے اسلام نے رہبانیت و ترک دنیا کی شد و مد سے مخالفت کی ہے، افسر صاحب نے اس مذہبی فلسفہ میں کیا رنگ آمیزی کی ہے ؎

تو نے کب پایا خدا بستی میں تھا　　　تجھکو کیا ہے گر خدا جنگل میں ہے

خدا ہر جگہ ہے مگر اسکی معرفت آسان نہیں۔ قلب سلیم اور توفیق کی ضرورت ہے۔ اسرار الٰہیہ پر وقوف لازمی ہے ؎

ذرہ ذرہ میں ترا جلوہ سہی میں کیا کروں　　　ذرہ ذرہ کا جہاں کے رازداں کر دے مجھے

میں نے مانا کہ تو ذرہ ذرہ میں جلوہ نما ہے، مگر مجھے اس سے فائدہ؟ مجھے تو ایسی آنکھ چاہئے جو تجھے دیکھ سکے، ایسے دل کی ضرورت ہے جو تیرا رازدار ہو۔ لعت کا یہ شعر قابل نظر ہے ؎

یہ جانتا ہوں تو نے خدا کا پتہ دیا　　　آگے خدا کو علم ہے اب تیرے حال کا

جیسا کہ میں نے تمہید میں عرض کیا ہے کہ پہلے شعر و شاعری خصوصاً تغزل کا انحصار محض الفاظ و معانی پر تھا مگر حالی نے اس میں بہت کچھ اضافہ کیا اور شعر کو نشر تعلیم اور اپنی پیام رسانی کا عمدہ ذریعہ بنایا۔

افسر صاحب نے بھی غزل گوئی کو گل و بلبل کی داستان تک نہیں محدود رکھا بلکہ مختلف مباحث پر اظہار خیال کیا ہے۔ خالص تغزل کی شان ملاحظہ ہو۔

سامنے تم آ گئے میں دل پکڑ کر رہ گیا　　　میری قسمت سے دوا نے درد پیدا کر دیا
میری میت پر وہ آیا سب ہوئے محو جمال　　　موت کو بھی میری ظالم نے تماشا کر دیا
وحشت گردی کی بدولت چار تنکے چن لئے　　　آشیاں کا میری وحشت نے سہارا کر دیا

پہلا شعر استدلالی شان لئے ہوئے شاعر کی جدت تخیل کا بہترین نمونہ ہے، دوسرے شعر میں یاس کے ساتھ ہی شوخی نے چار چاند لگا دئے ہیں، آخری شعر "دیوانہ بکار خویش ہشیار" کی مفصل تفسیر ہے۔ ؎

یا لاش کو لوگوں نے لپیٹا ہے کفن میں　　　یا خواب میں ہوں میں ترے دامانِ تمنا

موت کو خواب سے تعبیر کرنا تو انتہائی معمولی بات ہے، مگر کفن کا استعارہ "دامانِ تمنا"

سے بدیع اور عدیم النظیر ہے ؎

داغہائے دل نہ ہوں کیونکر سوا دل سے مجھے پھول یہ تم نے دئے ہیں اپنی محفل سے مجھے
ان کے دل کو میں دعائیں دیکے خوش کرتا ہوں روز دیکھنا ہے اب کہ وہ کوسیں گے کس دل سے مجھے

دل سے زیادہ داغ دل عزیز ہے۔ یہ کیوں؟ صرف اس لئے کہ "ہرچہ از دوست میرسد نیکوست" جیسے آپ ہمیشہ دعا دیتے رہئے ناممکن ہے کہ اُس کی زبان کوسنے کے لئے کھل سکے ؎

مرے دلکو تسلی دیتی ہے لب بستگی ان کی الٰہی تو نے خاموشی کے منہ میں بھی زباں رکھدی

خاموشی کی گویائی کس لطیف پیرایہ میں بیان کی گئی ہے۔ دوسرے مصرع کی بے ساختگی شان تخاطب کے ساتھ نہایت عجیب ہے ؎

ترا یوں مجھ سے نظریں پھیر کر خاموش ہو جانا مرا محو خیال گردش ایام ہو جانا

طریق الفت کا آئین ہے کہ ماسوائے مطلوب ہیچ ہے۔ طالب کی دنیا کی وسعت مطلوب تک محدود ہے۔ طالب کی خوشی و رنج ذاتی نہیں، اضافی ہے، یعنی مطلوب سے متعلق ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ "جب تم مجھ سے آنکھیں پھیر کر خاموش ہو گئے، میں گردش ایام کے خیال میں مستغرق ہو گیا"، تم مجھ سے کیا پھرے، دنیا پھر گئی، میں نے تمھاری بے التفاتی کو گردش زمانہ پر محمول کیا اس لئے کہ میری دنیا تمھیں تک ہے۔ اِن دونوں شعروں کی خوبی ملاحظہ ہو ؎

آپ بیتی ہے کہ مر مر کر جیا ہوں بارہا ہائے کتنی روح افزا ہے ادائے کوی دوست
گل صد چاک ہو یا شمع ہو آشفتہ جمال رونق ہوتی نہیں محفل میں پریشانوں سے

مندرجہ اشعار کی سادگی نہایت دلکش ہے اور وہ دن دور نہیں جب یہ ضرب الامثال بن جائیں گے اور بچہ بچہ کی زبان پر جاری ہوں گے ؎

للہ یہ تم دیکھنے والوں سے نہ پوچھو کیا چیز ہو تم دیکھنے والوں کی نظر میں
تصور کی یہ مقصد آفرینی میں سمجھا کوئی سچ مچ آ رہا ہے
سکھ میں ہوتا ہے حافظہ بے کار دُکھ میں اللہ یاد آتا ہے
وہ کہتے ہیں کہ اب باقی رہا کیا مٹایا دل کو تم نے دل میں تھا میں
اب تو دیدے ملے خدا میری دعاؤں میں اثر وہ سمجھتے ہیں بگڑ بونکا خدا ہوتا نہیں

افسر صاحب محبت کے آئین و ادب سے بخوبی واقف ہیں، اور ان کا مشاہدہ اس امر شریف میں حد کمال تک پہنچ گیا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اس راہ و رسم کے تجربہ کار سالک ہیں، انھوں نے فلسفۂ محبت کو مختلف مواقع پر مختلف پیرائے میں بیان کیا ہے ؎

گرہ الفت ہوئیں پھر واسطہ کیا کام کیا ــ کاروان سے، راہبر سے، راہ و منزل سے مجھے
جب دل پہ نہ قابو اپنا کیا صبر کریں کیا ضبط کریں ــ مجھ جیسے کاش وہ ہو جائیں جو آ آ کر سمجھاتے ہیں
دو شخص جب ایسے ملتے ہیں آپس میں جنکو محبت ہو ــ خاموشی طاری ہوتی ہے لب کھل کھل کر رہجاتے ہیں
یہ بھی اک تماشا ہے کارزار الفت میں ــ دل کسی کا ہوتا ہے بس کسی کا چلتا ہے
آغاز ہوا ہے الفت کا اب دیکھئے کیا کیا ہوتا ہے ــ یا ساری عمر کی راحت ہے یا ساری عمر کا رونا ہے
دنیائے محبت کا یہ بھی اک راز ہے ایک معمہ ہے ــ جو دکھ دیتے ہیں ستاتے ہیں وہ اکثر دل میں رہتے ہیں

حضرت افسر نے شاعرانہ حیثیت سے سفر کا مطالعہ بھی کیا ہے (اگرچہ وہ آپ بیتی نہیں) جو غایت درجہ دلچسپ ہے ؎

ہیں سر منزل مگر سودائیان جستجو ــ پھر ہیں سرگرم سفر کہتے ہیں منزل دور ہے
مجھے اے چاند تیری منزلوں پر رشک آتا ہے ــ مسافر وہ نہیں ہے جو سفر کا مدعا سمجھے
سفر کی حد اگر معلوم ہوتی ــ سفر کی کیفیت معدوم ہوتی

فطری طور پر ہر شاعر کے پیش نظر چند ایسے امور رہا کرتے ہیں جو لازمی طور پر اشعار کے وجود و آفرینش کے باعث ہوتے ہیں۔ افسر صاحب بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ ان کے ارکان شاعری کی بنیاد ایک حد تک چاند، ستارہ، بادل، پہاڑ وغیرہ پر ہے جو اگر حد اعتدال سے بڑھ جائے تو دلچسپی قریب قریب معدوم ہو جاتی ہے۔ تاہم اُنھوں نے اس مبحث میں بھی بہت کچھ اچھا کہا ہے ؎

ستارے جھلملا جاتے ہیں میں جب شب کو روتا ہوں
کہ موتی ان سے بہتر چاند کی کھیتی میں بوتا ہوں
محبت کی سفر کی منزلیں اور رات کی وحشت
میں اکثر جنگلوں میں چاند کے ہمراہ ہوتا ہوں

جنگل کی شب مہ اے افسر ہے محو سکون دل کش میں
یا نور کی ہلکی چادر میں ایک حُسن کی دیوی سوتی ہے



وہ آرہے ہیں ستاروں کو نیند کے جھونکے
اثر کسی پہ تو ہوتا مرے فسانے کا

بادلوں کی سرزمیں پر نغمہائے جاں فزا
مرغ خوش پروازہ آزادی اسی کا نام ہے

یاس کی تصویر ملاحظہ ہو ؎

دیکھنا پیچھے کو دیواریں یہ کیوں ہٹنے لگیں
چپ ہے کیوں اے چارہ گر کیا موت کا ہنگام ہے

حُسن شکایت کا پہلو دیکھئے ؎

کس نظر سے آشیاں کو آسماں دیکھا کیا
اور تو اے چارہ ساز بیکساں دیکھا کیا

شوخی ؎

شمع کے پہلو میں نیند آگئی پروانے کو
اپنے مطلب کا بہت ہوش تھا دیوانے کو

وحدت وجود کے مشکل مسئلہ کو کس حسن و خوبی کے ساتھ نباہا ہے ؎

ہوں محو ذات اتنا کہ بیخود ہوں مست ہوں
اب میں خدا پرست نہیں خود پرست ہوں

دیکھئے فلسفۂ موت کی تشریح کتنی صاف اور سلجھی ہوئی ہے ؎

ہم جس کو موت سمجھتے ہیں پیغام حیات جدید ہے وہ
یہ پھول چمن میں جتنے ہیں پھر کھلنے کو مرجھاتے ہیں

حیات و موت دو کڑیاں ہیں اک زنجیر کی افسر
کوئی کیا ابتدا سمجھے کوئی کیا انتہا سمجھے

موت کے خواب کی تعبیر ہے تجدید حیات
یعنی اول سے سُنائیں گے پھر افسانے کو

بعد مرنے کے جو تم پوچھو کہ کیا پیش آئیگا
میں کہوں گا وہ جو پیش آتا ہے پیدائش کے بعد

آفسر صاحب خواہشوں کی فراوانی کو غم کا باعث قرار دیتے ہیں جس سے کوئی اہل عقل انکار نہیں کر سکتا ؎

خواہشیں پوری ہوئیں تو اور تکلیفیں بڑھیں
خواہشوں کے ترک کر دینے سے راحت مل گئی

افسر صاحب کے کلام کا ایک حصہ "پرتو افکار" کے نام سے موسوم ہے۔ جس میں اکثر و بیشتر خود افسر صاحب ہی کی دماغی کاوش کا نتیجہ ہے اگر یہ نظریات قابل قبول نہیں تو ان کے ماننے

میں بھی کوئی خرابی نہیں "فلسفہ گناہ" کے یہ دو شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

یہ خبر تک نہیں ہوتی ہے گنہگاروں کو　کہ گنہ کرتے ہیں ہم اور گنہگار ہیں ہم
شاید احساس تجھے بھی یہ نہیں ہوتا ہے　کہ کرم کرتے ہیں ہر ایک پہ غفار ہیں ہم

تضاد کی اس سے بہترین مثال صحافت اردو میں نہیں مل سکتی۔ عبد، معبود کا فرق نہایت واضح طور سے سمجھایا گیا ہے۔

جس نے گلستان سعدی کی سیر کی ہے، یا نہیں کی، دونوں اس زبان زد مقولہ سے بخوبی واقف ہیں " رہ راست برو اگرچہ دور است" اور فی الواقع لگتی ہوئی بات بھی ہے۔ مگر افسر صاحب بہ ظاہر اس کے خلاف ہیں، جس کا اظہار انھوں نے " رہ راست مرو" کے عنوان سے یوں کیا ہے ؎

اگر تو نہ رستے سے بھٹکے کبھی　تو پھر اور راہیں نہ معلوم ہوں
جو تو ایک رستہ پہ قائم رہے　نشاں سارے منزل کے معدوم ہوں

میرے خیال میں شیخ سعدی علیہ الرحمہ اور آفسر صاحب کے کلام میں کوئی تضاد نہیں، سعدی علیہ الرحمہ کے مقولہ کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے سیدھی راہ چلو اور جان بوجھ کر خطرہ میں نہ پڑو۔ آفسر صاحب کہتے ہیں کہ اگر ہمیشہ ایک ہی راستہ پر گامزنی کی جائے تو اور منزلیں پردہ خفا میں رہیں گی۔ آفسر صاحب کا نظریہ تقلید کی مخالفت میں ہے نہ کہ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کے جواب میں۔ وہ یہ کبھی نہیں کہہ سکتے کہ اپنے کو دیدۂ و دانستہ ورطۂ ہلاکت میں ڈالو۔

فلسفۂ کامیابی کے یہ دو اشعار کس قدر حقیقت آشنا ہیں ؎

خزاں اجاڑیگی جس چمن کو بہار آئیگی اُس چمن میں　اُسے خوشی بھی نہ ہوگی حاصل جسے کبھی غم نہیں ملا ہے
بلندیوں پر وہی چڑھیگا نشیب میں جو اُتر سکے گا　جو چوٹیوں پر گیا ہے رستہ وہ گھاٹیوں سے گذر رہا ہے

اس میں کوئی کلام نہیں کہ عروج و کامیابی، پستی و زوال کی آخری منزلیں ہیں۔

آفسر صاحب بچوں کی زبان بھی خوب لکھتے ہیں، اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو میں کوئی پوری نظم شایع کرتا تاہم بطور نمونہ تین شعر درج کرتا ہوں، نظم کا عنوان "کاغذ کی ناؤ" ہے ؎

دیکھو اماں کیسی اچھی ہے مری کاغذ کی ناؤ　لے چلا ہے ساتھ اس کو مینہ کے پانی کا بہاؤ
مچھلیاں اس واسطے آنگن کے دریا میں نہیں　ڈر کے میری ناؤ سے ساری کی ساری چھپ گئیں

جارہا ہوں گا میں جب کشتی سنبھالے دیکھنا تم کہوگی میرے ننھے ناؤ والے دیکھنا

افسر صاحب کو ازل ہی سے ایسی مقبولیت عطا کی گئی ہے کہ ان کا کلام شایع ہوا اور لوگوں نے تقلیدیں شروع کردیں، زیادہ زمانہ نہیں گذرا کہ آپ کی ایک نظم "بانسری بجائے جا" کے عنوان سے "پیمانہ" میں شایع ہوئی تھی، خدا جھوٹ نہ بُلائے تو اس نظم کے بعد کم ازکم ایک درجن نظمیں اسی کی تقلید میں "پیمانہ" ہی میں نکل چکی ہیں، مگر نقل را چہ عقل ان نظموں میں سوائے تقلیدی شان کے کوئی خوبی نہیں۔ حضرت افسر کی ایک دلکش نظم "مالن" کے چند پرکیف اشعار درج کئے جاتے ہیں ناظرین اس سے ان کے نظموں کا بھی اندازہ لگا سکتے ہیں ؎

بھر کے دامن پھول والی یاسمن لائی ہے تو بیچنے بازار میں حُسن چمن لائی ہے تو
پھول یہ دو چار زینت تھے ترے گلزار کی اب انھیں مرجھائے دیتی ہے ہوا بازار کی
بلبلیں حسرت بھری نظروں سے تکتی رہگئیں بس ہی کیا تھا بیکسی میں سر پٹکتی رہ گئیں
پتے گر گر کر زمیں پہ سر رگڑتے رہ گئے خار تک ظالم ترا دامن پکڑتے رہگئے
غنچہائے مہر بلب تھے یہ کل گلزار میں اب شباب آیا تو بکنے کو چلے بازار میں

افسر صاحب کی ایک نظم "شاعر" "اکبر" کے گذشتہ نمبر میں شایع ہو چکی ہے جو اپنی انتہائی لطافت اور زور بیان کی وجہ سے دنیائے شاعری کا بہترین کارنامہ ہے۔

حضرت افسر محض ناظم اور شاعر ہی نہیں بلکہ اعلیٰ درجہ کے انشاپرداز اور ناثر بھی ہیں آپ کی نثر بھی نظم کی طرح منت غیر سے یکسر آزاد ہے، آپ کی نثر کے ٹکڑے اپنی انتہائی نفاست کی وجہ سے بہت جلد زباں زد ہو جاتے ہیں، ملک کے بعض مشہور انشاپردازوں نے افسر صاحب کی قائم کردہ روش پر خامہ فرسائی کی مگر ناکامیاب رہے۔

جناب خان بہادر میر ناصر علی خاں مدیر "صلائے عام" (دہلی) افسر صاحب کے ایک مضمون کی بابت فرماتے ہیں کہ

"پچھلے پرچہ میں رات کی سرگذشت ہزار افسانوں سے بہتر ہے"

ایک ٹکڑے کے بارے ان کا خیال ہے کہ

"اس ادا سے بیان کو میر حسن کی ہزار مثنویاں بھی نہیں پہنچ سکتیں۔" وہ ٹکڑا یہ ہے کہ
"میاں ایک دفعہ میرے سامنے آجائیں تو خوب قائل کروں گی میں پوچھوں گی اب وہ چاؤ کہاں گیا، وہ محبت کیا ہوئی، میرے بغیر تو ایک منٹ کو بھی جی نہ لگتا تھا، آج پورے پانچ مہینہ اور چار دن بعد صورت دکھائی ہے، میراں جی کے چاند کی چھٹی تاریخ ناٹک کو آگ لگانے گئے تھے، میں تو جب جانتی اب بھی نہ آتے۔"

قاضی بدرالحسن صاحب جلالی مدیر "مدینہ" "ماہ نو" پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ
"اگر منہ پر تعریف کرنے کی شارع نے ممانعت نہ کی ہوتی تو ہم حضرت حامد اللہ صاحب افسر سے کہتے کہ "ششو" کے ترجمہ کے وقت ٹیگور کا وجدان آپ کے دل کے اندر تھا "ششو" کے تمام نغمے بچے کی نفسیات کی ترجمان ہیں۔ مترجم نے کمال کیا ہے کہ ترجمہ اپنی زبان سے نہیں بلکہ بچے کی زبان سے کیا ہے۔"

الحاصل اس میں کلام نہیں کیا جاسکتا کہ افسر صاحب اردو کے زبردست محسن اور عہد حاضر کے کامیاب شاعر و نثار ہیں۔ خدا دن دونی رات چوگنی ترقی عطا کرے۔

میں نے اپنی مختصر تنقید میں تصویر کے ایک ہی رخ کو پیش نظر کرنے کی کوشش کی ہے اگر خدا نے چاہا تو آئندہ کبھی افسر صاحب کی نثر و نظم پر مفصل تبصرہ کیا جائے گا۔

حضرت افسر صاحب تصانیف و تالیفات بھی ہیں، مگر آپ کی بے نیازی سے بہت کم کتابیں چھپ کر شایع ہوتی ہیں، مولفہ کتب کی فہرست درج ذیل ہے۔

"معارف مغلیہ" (زیر طبع) "پیام روح" (زیر طبع) "ماہ نو" (مطبوعہ) "ڈالی کا جوگ" (زیر طبع)، "تاریخ زبان اُردو" (زیر طبع)

اسرار احمد

# تعلیم بالغان

آج کل عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ جب بچہ بالغ ہو جائے تو اس کی تعلیم و تدریس بند کر دینی چاہئے، غالباً آپ لوگوں کے سامنے اس کلیہ کی تردید کی ضرورت نہیں ہے، گو یہ بالکل درست ہے کہ اس وقت تک انسان اکتساب معاش کی قابلیت ضرور حاصل کر لیتا ہے لیکن پھر بھی ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ہماری زندگی کا اصل مقصد صرف یہی نہیں ہے، اگر ہم میں خودداری ہے تو ہمیں قطعی اس امر کا خیال نہ کرنا چاہئے کہ ہماری تعلیم و تربیت کی غرض و غایت صرف اکتساب معاش ہے اسی لئے ہم اتنی ہی تعلیم پر اکتفا نہ کریں گے، اس قدر قلیل تعلیم پر اکتفا کرنا اتنا ہی تمسخر انگیز ہوگا جیسے ایک نوعمر خاتون کو کسی مدرسہ میں بھیجکر یہ خیال کر لینا کہ ان کی تعلیم مکمل ہو گئی۔ یا اگر روپیہ پیدا کرنا ہی مدنظر ہو تو مروجہ طالب علمی کے بعد انسان اپنی زندگی بسر کر سکتا ہے، لیکن ہماری زندگی کا صرف یہی ایک مقصد نہیں ہے بلکہ ہمیں ایک اچھی زندگی گذارنے کے لئے دوسری باتوں کا بھی خیال رکھنا ہوگا۔

تعلیم بالغان سے مراد انسان کی مکمل تعلیم ہے، خواہ اس سے ہم دنیوی ترقی کر سکیں یا نہ کر سکیں لارڈ گاسکن کے نزدیک تعلیم بالغان سے مراد (طرز معاشرت ہے نہ کہ ذریعہ معاش) اس سے ظاہر ہے کہ ہماری تعلیم بچپن ہی سے شروع ہونی چاہئے، یہ بھی ہماری خوش قسمتی ہے کہ جب ہم سن شعور کو پہنچتے ہیں تو ہمارے دماغ اس قدر کافی وسیع ہو جاتے ہیں کہ ہم بلا تکلف جلد اور خوب اچھی طرح سے باتیں سمجھنے لگتے ہیں گو ہمارے معلومات وسیع نہیں ہوتے، اس وقت اگر طالب علم نیکا نئے کے طالبعلم کی طرح ذہین اور طباع ہے تو اس میں دو باتیں رونما ہوں گی، ایک تو اس کا دماغ بہت ہی تیز اور نفیس ہوگا، دوسرے طالب علم کو ادب اور علوم وفنون میں درخور ہو جائے گا، اس کے

اخلاق و کیریکٹر بھی درست ہو جائیں گے جو نہایت ہی ضروری ہیں، لیکن ایسی شاذ حالت میں بھی اگر مدرسہ اور کالج کی تعلیم کے بعد تعلیم جاری نہ رکھی گئی تو بغیر استعمال کے اس کی جملہ قوتیں غفلت کے نذر ہو جائیں گی۔

بہرحال بہت سے ایسے ہیں جو اپنی جہالت کا اعتراف کرتے ہیں لیکن پھر بھی اس کی تردید کا خیال نہیں کرتے، تعلیم و تربیت ان کے لئے ایک مصیبت ہے اور پھر اگر ان سے کہا جائے کہ انسان تعلیم ہی کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور اس کی تمام زندگی تعلیم و تدریس میں صرف ہونی چاہئے تو اس کے صاف و صریح مطلب یہ ہوں گے کہ وہ غریب اپنی تمام عمر تکلیف و مصیبت ہی میں بسر کریں گے، اس سے ظاہر ہے کہ بچپن میں ان لوگوں کے دلوں میں تعلیم کا شوق نہیں پیدا کیا گیا، لیکن اس کے متعلق تو مجھے یہ کہنا ہی نہ چاہئے تھا، یہ تو آج کل کی عام حالت ہے۔

آج کل سولہ برس کی عمر تک توجبریہ تعلیم دلائی جاتی ہے، اکثر اٹھارہ برس کی عمر تک بھی ایسا کرنا پڑتا ہے، اس زمانے تک ممکن ہے کہ زمانہ حال کے اصلاح شدہ طریقہ کے بموجب محلہ کے کل لڑکے علم کی دلآویزی سے متاثر ہو جائیں، بہرحال کبھی نہ کبھی توجبریہ تعلیم کا رواج ضرور بالضرور اٹھ جائے گا اور انسان کی تعلیم اس کی مرضی و خواہش پر چھوڑ دی جائے گی اور انسان خود بخود اپنی طبیعت سے تعلیم کی طرف متوجہ ہوں گے، میں تو کہنے جا رہا تھا کہ وہ خود بخود اپنے دل سے بلا کسی کے اثر یا دباؤ کے تعلیم کی طرف راجع ہوں گے۔

سن شعور پر پہنچکر بھی انسان کو کتب بینی میں مشغول رہنا چاہئے، اس کے بھی بہت سے وجوہات ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کا بھی خیال ہے کہ انسان کی فطرت ایسی واقع ہوئی ہے کہ اُسے صرف وجوہات ہی سے اطمینان نہیں ہوتا۔ اُس کے حسن ذوق اور تخیلات کا بھی خیال کرنا پڑتا ہے۔

اُس غریب کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے جو عجائبات قدرت کو نہ سمجھے، جسے تاریخ سے دلچسپی نہ ہو، جو ادب سے محبت نہ رکھے۔ بچپن میں تو صرف علوم و فنون کا شوق دلایا جاتا ہے، اس کے رگ و ریشے میں علوم و فنون کی روح پیوست کر دی جاتی ہے۔

انسان کی سچی خوشی زیادہ تر اس کی تدریجی ترقیوں پر منحصر ہے۔ روزمرہ کے تفکرات و پریشانیوں کے باعث ممکن ہے کہ ان کی عدم موجودگی کا ہمیں افسوس نہ ہو لیکن ضعیفی میں اس کا احساس ضرور ہوگا اور اس کی وجہ سے آئندہ تکالیف روشن ہو جائیں گی۔ کیا یہ بات قابل افسوس نہیں ہے کہ ہم خود ہی چاہتے ہیں کہ ہمارے آخری دن جانکاہیوں میں گذریں۔ آہ! کیا ہم خود ہی چاہتے ہیں کہ ہماری زندگی کے آخری دن غیر دلچسپ رہیں۔

تعلیم بالغاں کی قدر منزلت کوئی اس کے دل سے پوچھے جس نے اپنی تمام زندگی لوگوں کی اصلاح و تربیت کے لئے وقف کردی ہے، اس تعلیم کی اہمیت و ضرورت صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو دوسروں کو اعلیٰ وارفع بنانے میں مصروف ہیں، والدین کی ذمہ داری خاصکر زمانہ طفولیت میں جب ان کا بچہ تعلیم شروع کرتا ہے بہت زیادہ ہوتی ہے کیونکہ اس وقت احتمال رہتا ہے کہ کہیں طرز تعلیم ایسا نہ ہو کہ بڑے بوڑھوں اور بچوں کے خیالات میں تصادم ہو جائے اگر بچہ نے والدین کی پاکیزہ، شستہ اور مہذب گفتگو اور ہمنشینی سے فائدہ نہیں اُٹھایا تو سمجھ لینا چاہئے کہ اسے اب کوئی دوسری چیز شُستہ و پاکیزہ نہیں بنا سکتی۔

معلم یا استاد کا فرض ہے کہ وہ خوب کتب بینی کیا کرے ورنہ وہ بہت جلد اپنا اثر کھو بیٹھے گا، اس کے شاگرد خواہ وہ سن شعور پر پہنچ گئے ہوں یا نہیں، بہت جلد معلوم کرلیں گے کہ ان کے استاد صاحب گراموفون کی طرح ایک ہی بات کو بار بار کہتے ہیں، ایک ہوشیار اور زندہ دل اُستاد کے معلومات بہت ہی وسیع ہونے چاہئیں جس کا اظہار وہ ایسے ہی کبھی کبھی کردیا کرے اور یہ باتیں اُس وقت میسر ہوسکتی ہیں جبکہ استاد برابر کتب بینی کرتا رہے۔

اُستاد کے برابر کوئی دوسرا شخص تعلیم بالغاں کا موید و حامی نہیں ہوسکتا، اس لئے نہیں کہ یہ پبلک کے لئے نہایت ضروری ہے بلکہ اس لئے کہ انھیں خود اس کی ضرورت ہوتی ہے۔

آجکل مزدور پیشہ کے برابر کوئی دوسرا طبقہ اعلیٰ تعلیم کی اہمیت کا خیال نہیں کرتا۔ ان کے رہنما اعلیٰ تعلیم کی توسیع اشاعت میں انتہائی کوشش کر رہے ہیں، مذہبی پیشوا کے نزدیک اخلاق و کیرکٹر ہی اصل چیز ہے اور اس سے انسان کی حالت کا اندازہ ہوتا ہے لیکن اتنا یاد رہے کہ علم بھی اسی قدر ضروری ہے۔ علم کی اتنی قسمیں ہیں کہ ایک سنجیدہ آدمی

علم کی مختلف قسموں سے حیران ہو جاتا ہے، موجودہ اصول تجارت کو سمجھنے کے لئے بھی تاجر کو تاریخ، جغرافیہ، معاشیات وسائنس میں کافی واقفیت رکھنی چاہئے، لیکن ان کے علاوہ اسے محنت کے مفہوم کو بھی سمجھنا چاہئے، اگر تاجروں کا پیشوا نفسیات سے واقف ہے تو اکثر غلطیوں سے بچ جائے گا لیکن پھر بھی اگر اُس کے معلومات وسیع نہیں تو ضرور وہ نقصان میں رہیگا

کاروبار خواہ وہ ذاتی فائدہ کے لئے شروع کیا جائے یا مشترکہ سرمایہ سے، ہمارے مضمون سے کوئی خاص تعلق نہیں رکھتا، لیکن ہم اتنا کہتے ہیں کہ ایسے کاروبار بھی ہوشیاری اور ٹھکانے کے ساتھ کئے جائیں تو اس کا بھی بہت عمدہ اثر پڑے گا، تجارت و نیز دیگر کاموں میں ایک عمدہ فیصلہ کا انحصار اس قدر مصطلحات پر نہیں ہوتا جیسا کہ دنیا شناسی پر۔ اور یہ علم تو ان لوگوں کو بھی میسر نہیں ہوسکتا جو لڑکپن ہی میں عالم فاضل ہو چکے ہیں۔

اس خیال سے فطرتاً یہ مترشح ہوتا ہے کہ انسان خواہ وہ کسی درجہ یا مرتبہ کا ہو بغیر وسعت علم کے پختہ اور قابل نہیں ہوسکتا، یہ کلیہ معلم و شاگرد، منتخب کنندگان اور منتخب، رہنما اور پبلک سب کے لئے برابر ہے۔

استاد کی حیثیت سے تم نے بہت ترقی کیوں نہ کر لی ہو لیکن اگر تم اپنے شاگردوں سے محبت وخلوص کے ساتھ نہیں پیش آئے اگر تم ایک بیرحم اور ترش رُو استاد ہو تو سمجھ لو کہ تم ناکامیاب رہے، تمھاری ترقیاں میرے نزدیک ہیچ ہیں، اُستاد و شاگرد میں موافقت اور خوب میل جول ہونی چاہئے، اُستاد اپنے شاگردوں کو اس طرح سے نہ پڑھائے کہ لوگ اُسے صاحب الغضب سمجھنے لگیں، تم استاد اس لئے نہیں بنائے گئے ہو کہ شاگردوں کے دلوں پر ایسے قہر و جبروت کا سکہ جماؤ، تم کو درس و تدریس کی دولت اس لئے نہیں دی گئی کہ تم اس پر ناز کرو اور جب تک ان کے مقابلہ میں ہنر کے لئے کوئی اچھی جگہ نہ ملے تم درس و تدریس شروع نہ کرو بہت سی باتوں میں شاگرد تم سے کمتر ہوگا اور بہت سی باتوں میں تم سے بہتر ہوگا، عمر میں تو عموماً وہ تم سے بڑا ہوگا۔

تعلیم بالغاں صرف ہونہار نوجوانوں کے لئے نہیں ہے، یہ وہ تعلیم نہیں ہے جو کسی خاص صنف کے افراد کے لئے مخصوص ہے، دونوں صنف کے افراد خواہ وہ کسی رتبہ

یا عمر کے ہوں بلاتکلف اس تعلیم سے مستفید ہو سکتے ہیں، ستر برس سے زیادہ عمر کے ہوشیار اور طباع طالب علم خود میں نے دیکھے ہیں، ہماری سوسائٹی میں جن کو خدا نے ثروت دی ہے اور ہمارے یہاں بہت موقر ہیں اس تحریک میں حصہ لیکر قوم کی بہت کچھ خدمت کر سکتے ہیں۔ متلاشیان راستی ہونے کی وجہ سے کل متلاشیان علم ایک ہی قسم کے ہوں گے، جس کی نظیر زندگی کے دوسرے شعبوں میں نہیں مل سکتی۔

غرضیکہ تعلیم بالغاں سے مراد وہ تعلیم ہے جو ہم ایام طفولیت سے شروع کرتے ہیں اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہمارے معلومات میں خواہ اکتساب معاش میں ہم منہمک ہوں یا نہیں برابر اضافہ ہوتا رہے، یہ اس قسم کی تعلیم نہیں ہے جس سے لوگ بھاگیں یا پریشان ہوں، اس کی غرض یہ ہے کہ طاقتور جسم میں قوی دماغ کی پرورش ہو، غور و خوض، مشاہدات، کتب بینی سے یہ بڑھتی ہے، اس کی مدد اور محض اسی تعلیم کی بدولت ہماری زندگی کامیاب یا ناکامیاب ہو سکتی ہے۔ (سید محمد حفیظ آبدی)

---

# اظہار غم

رات دن سینے میں رہتے ہیں نہاں آثار غم
کوئی آجائے تو ہو کافور روز تار غم

اے نگاہ ناز اے غارت گر صبر و قرار
کر ادھر بھی رخ کبھی اور لوٹ لے سرکار غم

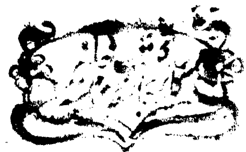
آرزو سے دید کرنا اور پھر قطع خیال
وہ مری دیوانگی کا شغل ہے یہ کار غم

چادر گل پر کوئی عیسیٰ نفس واں محو عیش
یاں شب تاریک ہے اور بستر بیمار غم

اُف ری قسمت ہیں وہ صدر محفل اہل نشاط
وائے مجبوری کہ ہم ہیں حاضر دربار غم

وہ ہیں اور راحت کی راتیں نیند ہے اور چشم ناز
ہم ہیں اور بیداری شب آنکھ ہے اور خار غم

اے قمر اُنکے نہ سُننے کی شکایت ہے عبث
آپ اپنے مُنہ سے جب کرتے نہیں اظہار غم



قمر الدین احمد بی۔ اے



# تار گھر

لالہ باسدیو تار گھر میں نوکر تھے، تیس روپیہ تنخواہ ملتی تھی، اسی میں گھر بھر کا خرچ چلتا تھا، ایک دن اُن کا اکلوتا لڑکا کرشن گوپال جو ابھی چھ برس ہی کا تھا ان کے ساتھ تار گھر گیا اور تار کے انتظامات دیکھکر بہت ہی متعجب ہوا، وہ سوچنے لگا کہ اس کا باپ "گر گٹ" کے آوازوں ہی سے کس طرح خبریں پا جاتا ہے، اُس نے بہت کچھ سوچا لیکن اس کا چھوٹا سا دماغ کچھ سمجھ نہ سکا تو اُس نے اپنے باپ سے دریافت کیا "بابوجی! آپ کس طرح کھٹ کھٹ ہی کے آوازوں سے خبریں سمجھ لیتے ہیں، میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آتا۔"

باسدیو اپنے گوپال کی بھولی بھالی باتیں سُن کر ہنسنے لگا اور جواب دیا "بیٹا اس کا سمجھنا پڑھنے سے ہوتا ہے میں نے سیکھا ہے اسی سے سمجھ لیتا ہوں، جب تم بھی سیکھ لوگے تو تار کا کام تم کو بھی معلوم ہو جائے گا۔"

کرشن گوپال نے کہا "میں روز آپ کے ساتھ آیا کروں گا اور دیکھوں گا کہ آپ کے پاس کیسی خبریں آیا کرتی ہیں۔

باسدیو نے کہا "نہیں گوپال تم ابھی بچے ہو، ابھی یہ سب باتیں نہیں سمجھ سکتے، جب تم بڑے ہو جاؤ گے تب سمجھ لوگے۔"

کرشن گوپال کچھ اُداس ہوا اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں میں اپنے باپ کی انگلیوں کو دبا کر بولا "لیکن میں تو تار کا طریقہ سیکھنا چاہتا ہوں، آپ کے پاس کہاں کہاں سے خبریں آیا کرتی ہیں بابوجی!"

باسدیو۔ دور دور سے، کبھی بمبئی سے کبھی دلی سے اور کبھی کاشی جی سے۔

کرشن گوپال۔ یہ جواب پاکر دل میں بہت خوش ہوا اور بولا "اچھی بات ہے، یہ علم

سیکھ کر میں بھی آپ کی طرح روز یہی کام کروں گا اور روزانہ ایک تار راجہ کو بھیجا کرونگا۔"

باسدیو نے بھی اس طفلانہ خوشی میں اپنے بچے کا ساتھ دیا اور پوچھا "اچھا یہ تو بتاؤ تم اپنے راجہ کو کیا تار دو گے؟"

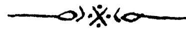
کرشن گوپال - میں یہ تار دوں گا کہ "راجہ جی فوراً میرے پاس آئیے میں آپ کا درشن کرنا چاہتا ہوں۔"

باسدیو (ہنس کر) اور جب تمھارے راجہ آئیں تو اُن سے بہت سارا روپیہ مانگنا اس سے ہم لوگ ایک عالیشان محل بنوالیں گے، تم کو اچھے اچھے ریشمی پوشاک بنوادیں گے اور تمھاری ماں کے لئے سونے کے زیور خرید دیں گے۔

کرشن گوپال کا دل ان باتوں سے مطمئن نہیں ہوا وہ بولا "نہیں بابوجی! میں روپیہ نہیں مانگوں گا، جب راجہ میرے پاس آئیں گے تو میں اُن سے ایک ریشمی خوبصورت رسی ایک چھوٹا سا کھٹولہ جھولا جھولنے کے لئے مانگوں گا اور جھولا جھولنے اور ساتھ کھیلنے کے لئے دو چار ہمجولی لڑکے، بس میں تو یہی چاہتا ہوں۔"

اس قسم کی باتیں کرتے ہوئے شام کو باپ بیٹے گھر واپس ہوئے، کرشن گوپال کی ماں نے اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو چھاتی سے لگاکر پیار کر لیا لیکن گوپال جب تک جاگتا رہا تار گھر کی عجیب و غریب باتیں اپنی ماں کو سُناتا رہا۔

## (۲)



دوسرے ہی دن سے کرشن گوپال نے ایک تار گھر اپنے ہی مکان پر بنایا، اُس نے ایک پتھر کا ٹکڑا لیا اور اُسے میز پر کھٹکھٹاتا، بس اسی طرح وہ تار بھیجتا، اس کی ماں اگر پوچھتی کہ "گوپال کیا کر رہا ہے؟" تو وہ جواب دیتا "میں راجہ کو تار بھیج رہا ہوں۔" اور پھر کھٹ کھٹ تار برقی شروع ہو جاتی، اُس نے اپنی ماں سے طے کر لیا تھا کہ اگر وہ ایک بار کھٹ کرے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ پیاسا ہے، اگر دو مرتبہ کھٹ ہوا تو اُس کا مطلب ہے کہ وہ بھوکا

ہے اور کھانا چاہتا ہے، اور اگر اُس نے تین بار کھٹکھٹایا تو سمجھنا چاہئے کہ اُسے نیند لگی ہے وغیرہ وغیرہ، کچھ دنوں تک یہ طریقہ ٹھیک جاری رہا، ایک دن گوپال کی ماں اپنے دیوتا کی پوجا کر رہی تھی، وہ پوجا میں آنکھیں بند کئے چپ چاپ دھیان میں مگن تھی کہ یکبارگی گوپال کے تار کی آواز کان میں پہنچی، وہ پوجا پاٹ چھوڑ دوڑ کر اپنے بچے کے پاس پہنچ گئی اور کہا "کیا چاہتا ہے گوپال" گوپال کھلکھلا کر ہنس پڑا اور بولا "میں تو تمھارے ساتھ کھیل کر رہا تھا، مجھے تو کچھ بھی نہ چاہئے" ماں نے کہا "پوجا کے وقت تم مجھے نہ دق کیا کرو" یہ کہ کر وہ کچھ خفا ہو کر پتھر کے ٹکڑے پھینکنے لگی گوپال نے پتھر اپنی ماں کے ہاتھ سے چھین کر کہا "اچھی اماں! اسے مت پھینکو اگر تم اسے پھینک دو گی تو میں اپنی خبریں تم کو یا راجہ کو کس طرح سے بھیجونگا، میں تو آزما رہا تھا کہ تم مجھے زیادہ پیار کرتی ہو یا اپنے دیوتا کو" یہ سنتے ہی ماستا کی ماری ماں خوش ہو گئی، اس نے گوپال کو گود میں اُٹھا لیا اور بڑے پیار سے کہا "میرے لال! تم میرے دیوتا میں بھی ہو، میں اس کی پوجا کے ساتھ تمھاری بھی پوجا کیا کرتی ہوں"

کرشن گوپال نہیں سمجھا کہ اس کی ماں نے کس نکتہ کی بات کہی تھی، اُس نے اپنی چھوٹی سی بانسری نکالی اور بجانے لگا اور اُس کی ماں اپنے بھولے بھالے گوپال کی طرف بڑے پریم سے دیکھنے لگی۔

## (۲۷)



کرشن گوپال کی ماں آج بہت اُداس بیٹھی ہے، اس کو خبر ملی ہے کہ جس ریل میں اس کا پتی سفر کر رہا تھا وہ ایک مال گاڑی سے لڑ گئی ہے اور بہت لوگ مر گئے ہیں، گوپال اپنی ماں کو تسلی دے کر کہنے لگا "میں نے راجہ کو تار بھیجا ہے کہ بابوجی کی خبر دیں" اس کی ماں گوپال کی باتوں پر مسکرانے لگی، اتنے میں ایک تار والے نے ایک پیلا لفافہ گوپال کو لا کر دیا، اُسکی ماں پڑوس میں جا کر تار پڑھا لائی، خبر کیا تھی گویا مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، "باسدیو گاڑی کے لڑنے میں مر گئے" وہ غریب رونے لگی، لیکن رونے سے کیا ہوتا ہے، کوئی دنیا سے

جا کر واپس نہیں آتا، گوپال کرشن بڑوں کی طرح سے اپنی ماں کو تسلی دینے لگا، اس نے اپنے باپ کو واپس کرنے کے لئے راجہ کو تار پر تار بھیجا، لیکن کسی کا بھی جواب نہ آیا۔

---

جب گوپال کو اپنے سیکڑوں تاروں کا کوئی جواب نہ ملا تو وہ رو رو کر بیمار پڑ گیا، شام کا وقت تھا اور باہر خوب پانی برس رہا تھا، اس کی ماں زمین پر اپنے بچے کو گود میں لئے بیٹھی تھی، اس کا بچہ بیہوش تھا اور وہ چلا چلا کر اُسے ایک بار آنکھ کھولنے کو کہہ رہی تھی، کچھ دیر کے بعد گوپال کی آنکھیں کھل گئیں اور ایک ہلکی سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی، وہ اپنی ماں سے دھیمی آواز سے بولا "اماں! بابو جی نے میرے تاروں کا جواب بھیجا ہے، وہ مجھے بلاتے ہیں، میں جاتا ہوں، اپنے راجہ سے کہوں گا.........." اتنا کہہ کر اُس کی آواز بند ہوگئی اور وہ اپنی ماں کے گلے سے لپٹ گیا، اس کی ماں گھبرا گئی اور جب وہ پھر اپنے بچے کو جگانے لگی تو اُسے مردہ پایا، وہ کچھ دیر تک تو چپ رہی اور پھر چلا کر روتے روتے بیہوش ہوگئی مٹی کا دیا بھی جو سرہانے رکھا ٹمٹما رہا تھا بجھ گیا۔ (ترجمہ)

اعظم کریوی

# غزل

لے چل بہا کے گریۂ طوفاں اثر مجھے
مرنے پہ بار دوش عزیزاں نہ کر مجھے

آغاز ہی میں کشتۂ تیغ نگاہ ہوں
پہنچا دیا ہے عشق نے انجام پر مجھے

شاید مری وفائیں اُنھیں یاد آگئیں
بیٹھے ہوئے جو روتے ہیں وہ قبر پر مجھے

صورت نشاط و عیش کی دیکھی نہیں کبھی
سہنے پڑے ہیں رنج و الم عمر بھر مجھے

حُسن کرشمہ ساز کی ہیں سحر کاریاں
روز ازل سے ہے جو یہ ذوق نظر مجھے

آئیں گے یاد داورِ محشر کے رُوبرو
بھولیں گے تیرے ظلم نہ بیداد گر مجھے

طاہر یہ کم شرف ہے؟ جہاں میں مرے لئے
کہتے ہیں لوگ عترت خیر البشر مجھے

طاہر



# بچوں کی تربیت



یوں تو ہندوستانیوں میں اور بھی بہت سی باتیں ہیں جو اُن کو قعرِ مذلت کی طرف لیجاتی ہیں، مگر سب سے بڑی وجہ نہیں بلکہ جملہ خرابیوں کی اصل محض ان کے بچوں کی تربیت ہے، جس کا خیال اگر والدین رکھیں تو بچے کبھی گمراہ نہ ہوں، ان کے لئے آسان ہے اور انھیں کے اختیار میں ہے چاہے یہ اپنے بچوں کو سعادت مند اور ہونہار بنائیں یا ذلیل وخوار، نیز ہمارے ملکی بھائیوں میں یہ خیال عالمگیر ہے کہ اگر انسان کو کوئی چیز ترقی کی معراج کمال پر پہنچا سکتی ہے تو وہ علم ہے بچے جب پڑھ لکھ لیں گے تو خود ہی اپنی حالت سدھار لیں گے اور علم اُن کی تمام خرابیوں کو دور کردیگا، لیکن سوال تو یہ ہے کہ وہ علم کیونکر حاصل کریں گے اور علم کی طرف اُن کو کونسی چیز راغب کرے گی؟ کیونکہ علم کا اثر اُن قلوب پر ہوتا ہے جو اصلاح پذیر ہیں، صیقل گر زنگ آلود اور کثیف برتن کو کبھی نہیں چمکا سکتا جب تک کہ وہ پہلے اُس کے زنگ اور کثافت کو نہ دور کرلے یعنی اس کے معنی یہ ہیں کہ برتن میں جب چمکنے کی صلاحیت آجاتی ہے تب ہی وہ چمکتا ہے، اِسی لئے سب سے پہلے اس بات کی ضرورت ہے کہ بچوں کی تربیت درست کی جائے تاکہ وہ علم سے فائدہ حاصل کرسکیں اور اس کے لئے والدین کو چاہئے کہ اُنکے عادات و اطوار برے نہ ہونے پائیں، اُن کو اپنے بچوں کی اصلاح کرنے کے لئے اپنی اصلاح کرنی لازمی ہے، اس لئے کہ بچہ شروع شروع گوشت پوست کا ایک لوتھڑا ہوتا ہے، نہ کسی بات کو سمجھتا ہے نہ جانتا ہے اُس کی مثال بعینہ ایک ایسی نرم اور سبز شاخ کی ہے جس کو آپ نے حالت شادابی میں ٹیڑھی کردی ہو، سوکھ جانے کے بعد پھر اُس کا سیدھا کرنا ناممکن ہوگا، بچہ جوں جوں بڑھتا جاتا

ہے اُس کے فہم و ادراک میں زیادتی ہوتی جاتی ہے لیکن ادراک کا مصرف اگر جائز ہے تو خیر ورنہ کند چھُری کی طرح بیکار ہے، اُس نے جب سے آنکھیں کھولیں دنیا کی تمام تر بُرائیوں کو دیکھتا رہا اور اُن ہی میں پرورش پاتا رہا، بڑھتے بڑھتے اللہ نے جب عقل و تمیز عطا کی تو وہ بھی بیکار ہو چکی تھی اس لئے کہ بُرائیاں طبیعت ثانیہ بن چکی ہیں اس وقت تمیز کرنا ہی اس کا محال ہے جس کا سراسر عذاب اور جس کی ذمہ داری صرف والدین پر ہے اس لئے کہ نا سمجھ معصوم بچہ مُقلد محض ہوتا ہے، ماں باپ کے قدم بقدم چلتا ہے، اُسے کیا علم، وہ کیا جانے، میں کیا کرتا ہوں، مجھے کیا کرنا چاہئے۔

ایک مرتبہ میرے ایک دوست نے لوگوں کی دعوت کی جس میں مَیں بھی شریک تھا، کھانے کا وقت آیا لوگ دسترخوان پر جا جا کر بیٹھ گئے، میرے سامنے ہی ایک صاحب تشریف فرما تھے، اُن کے ساتھ اُنکا ایک لڑکا تقریباً چھ سات سال کا ہوگا بیٹھا ہوا تھا، لڑکا نہایت خوبصورت تھا، چہرے سے ذکاوت کے آثار نمایاں تھے لیکن میلا اور گندہ بہت تھا، اب جو کھانے کا وقت آیا تو بدتمیزیاں کرنے لگا، تمام کپڑے شوربے سے رنگ ڈالے، منہ دیکھو تو متلی معلوم ہونے لگے، اس کے باپ نے جب مجھے دیکھا کہ انھیں یہ سب حرکتیں بُری معلوم ہوتی ہیں، معصوم بچے کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھنے لگے، اُس نے سمجھا کہ ابا جان شاید مجھے کھانے سے روک رہے ہیں، اپنا ہاتھ کھانے سے کھینچ لیا اور دوسری طرف منہ کر کے رونے لگا، اب تو مجھ سے نہ ضبط ہوسکا، میں نے کہا کہ

"حضرت آپ نے اسے کھانے سے کیوں منع فرما دیا" اُنھوں نے جواب دیا کہ "صاحب یہ سخت بدتمیز ہے، دیکھئے، تمام کپڑے خراب کر ڈالے ہیں" فوراً میری نظر اُن پر پڑی، دیکھا تو جناب کی حالت بچے سے کچھ کم نہ تھی، مجھے بچے کی حالت پر بہت رحم آیا، افسوس ایسا ہونہار لڑکا اور ماں باپ کے ہاتھوں یوں خراب ہو، اُنھیں نہ اُس کی صفائی کا خیال ہے نہ سلیقہ کا رفتہ رفتہ وہ اسی گندگی کا عادی ہو جائے گا اور تمام نسلیں اُس کی خراب ہوں گی، اگرچہ اُنھوں نے میرے سامنے اُسے بُرا سمجھا اور بچے کو ڈانٹا بھی لیکن ؏ ہر آنکہ خود گم است کرا رہبری کند، ایسی نصیحتوں کا اثر بہت کم دیکھا گیا، جس پر ناصح خود عمل پیرا نہ ہو۔

بچوں کا نافرمان ہونا بھی اُن کے فلاکت کا سبب ہوتا ہے اور اس کے مجرم بھی والدین ہی ہوتے ہیں، اس لئے کہ اُنھیں غایت محبت میں اس کا احساس تو ہوتا نہیں کہ آیا وہ بچوں کے ساتھ دشمنی کر رہے ہیں یا دوستی، ان کی ادنی اور غیر ضروری ضدوں کو پوری کرتے ہیں، انھیں کیا ابھی وہ بچے ہیں، جس چیز کو دیکھیں گے، مانگیں گے، روئیں گے، چلائیں گے، لیکن اب یہ آپ کا فرض ہے کہ دیکھیں اس کی ضد اس قابل بھی ہے یا نہیں کہ وہ پوری کی جائے، یوں ہی اگر آپ اسے ضدی بناتے رہیں گے تو بالآخر آپ کی وہ کوئی وقعت نہ کرے گا، اور نہ آپ کی موافقت، اور نہ آپ کے دوش بدوش چلے گا بلکہ جو چاہے گا آپ کے خلاف کرے گا، اور آپ منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔

ضد کی وجہ سے بسا اوقات بچوں کی جانیں بھی ہلاک ہو جاتی ہیں، ایک مرتبہ مجھے ریل میں سفر کرنے کا اتفاق ہوا، جس ڈبہ میں میں بیٹھا ہوا تھا اُسی میں ایک بابو صاحب اپنے بال بچوں کے ساتھ ہانپتے کانپتے پہنچے، گاڑی سیٹی دے چکی تھی مگر کسی وجہ سے دو ایک منٹ کے لئے رُک گئی اور بابو صاحب کو اطمینان سے بیٹھ جانے کا موقع مل گیا، بابو صاحب کی گود میں تین چار سال کا بچہ تھا، رونے لگا کہ ہمیں کھڑکی پر لے چلو، وہ بیچارے بہت سمجھایا کئے کہ نہیں وہاں ہوا زور سے آتی ہے، سردی اثر کر جائے گی، وہ نہ مانا اور رونے لگا، بیگم صاحبہ اس کا رونا نہ دیکھ سکیں اور جھپٹ کر بابو صاحب کی گود سے چھین لیا اور کھڑکی پر بیٹھ گئیں، بابو صاحب کھسیائے تو بہت مگر بول ہی کیا سکتے تھے، بیوی کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگے۔

آج سفر کا دوسرا دن ہے، کڑاکے کی سردی پڑ رہی ہے ہوا بھی تیز ہے، بچے کی طبیعت پہلے سے بھی کچھ خراب تھی، ہوا لگنے سے سینہ جکڑ گیا، سانس بمشکل آنے جانے لگی اب کیا تھا، بابو صاحب، اور اُن کی بیوی کے ہوش غائب ہوگئے، رونے لگے، لیکن حیرت یہ ہوئی کہ اُسی ڈبہ میں ایک اور صاحب اپنے بال بچوں سمیت پشاور جا رہے تھے، ان کے پاس ضرورت کے سارے سامان تھے، اُنھوں نے کوئی دوا دی جس کے ملنے سے بچے کو افاقہ ہوا، لیکن یہ مشیت ایزدی تھی اور بچے کی حیات، ورنہ ان لوگوں نے اس کے مار ڈالنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی تھی۔

بچوں کے سامنے کبھی ایسی باتیں نہ کہی جائیں جن کی اتباع اُن کی خرابی کا باعث ہو، بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ ناسزا اور مذاق اور گالیاں بچوں کے سامنے دیا کرتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بھی سیکھ جاتے ہیں اور اپنے بڑوں کے سامنے بھی گالیاں دینا عیب نہیں سمجھتے، لحاظ وادب جو بہت ضروری چیز ہے اُن سے بالکل مٹ جاتا ہے، بلکہ بے غیرت ہو جاتے ہیں۔

جھوٹ اور غیبت یہ ایسا عام مرض ہے کہ جھوٹ بولنے والا یا غیبت کرنے والا اس کو عیب ہی نہیں سمجھتا، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عورتیں پڑوس کی اکٹھا ہوئیں اور ایک دوسرے کی بُرائیاں کرنی شروع کردیں کہ فلانی کے یہاں یہ ہوتا ہے، فلانی ایسی ہے اور فلانی ویسی ہے، یا اگر بچہ رویا تو اُسے جھوٹ جھوٹ وہمی باتوں سے ڈرا کر چپ کرتی ہیں، اب تک عرب کا یہ قاعدہ ہے کہ وہ بچوں کو کبھی نہیں ڈراتے، اُن کا خیال ہے کہ ڈرانے سے بچے بزدل ہوجاتے ہیں، یا اُن سے جھوٹے جھوٹے وعدے کئے جاتے ہیں، اس کا اثر بچے کے اخلاق وعادات پر پڑتا ہے، لڑکے بداخلاق و بدعہد ہو جاتے ہیں، اور خود بھی جھوٹ اور غیبت کرنے لگتے ہیں۔

ماں باپ کی اچھائی اور بُرائی کا اثر تو بچوں پر ہوتا ہی ہے، لیکن اس کے علاوہ اگر کوئی چیز انھیں بنا بگاڑ سکتی ہے تو صحبت، قاعدہ ہے کہ انسان جس چیز سے شوق رکھتا ہے یا عادی ہوتا ہے اُس کے فکر میں رہتا ہے، بچہ جو شروع ہی سے بُرائیوں کا خوگر ہوچکا ہے بُری صحبت میں پڑکر اور بھی خراب ہوجاتا ہے، چونکہ بچوں کی طبیعتیں کچی اور سادی ہوتی ہیں بقول شخصے (بچہ ایک سادہ ورق ہے جس پر ابھی کچھ لکھا نہیں گیا) جس بات کو قبول کرلیتی ہیں مشکل سے چھوٹتی ہیں، لہذا ان کو شروع ہی سے بُری صحبت بُرے لڑکوں اور بُری باتوں سے نفرت دلانی چاہئے تاکہ وہ اپنے کو خراب نہ کرسکیں۔

بچوں کی اصلاح سختی اور دباؤ سے نہیں کرنی چاہئے، اس لئے کہ پست ہمت اور بودے ہوجائیں گے، اُمنگیں نہ رہیں گی تو ترقی دشوار ہوجائے گی، سونے سے پہلے ان کو نصیحتیں کرنی چاہئیں، نیز ایسے قصے اور کہانیاں سُنائی جائیں کہ جن سے اُن کے اخلاق وعادات

درست ہوں، ان کو اپنے ساتھ یا کسی شفیق اتالیق یا دایہ کے ساتھ تفریح کے لئے بھیجنا چاہئے علمی مباحث اور مجلسوں میں شریک کرنا اور اُن کو شوق دلانا چاہئے تاکہ ایک گونہ وہ اس کے خوگر ہوجائیں نیز اس کے فوائد اور بھلائیوں سے واقف کریں اور بتلائیں کہ تم بھی ایسا ہی کرو تاکہ لوگ تمھاری قدر کریں۔

جو لوگ اس قابل ہیں کہ اتالیق رکھ سکیں وہ ضرور کچھ دنوں بچوں کو اپنے گھر پر تعلیم دلائیں اور نہیں تو کسی اچھے مکتب میں پڑھنے کے لئے بٹھا دیں، مگر سب سے پہلے اُن کو مذہبی تعلیم دلانا چاہئے تاکہ وہ مذہب سے بالکل بے بہرہ نہ رہیں۔

آنفضال

# عالم خیال

خون دل آنسو بنے اور بنتے بنتے ٹوٹ جائے
آنکھ سے گوہر گرے اور گرتے گرتے ٹوٹ جائے

غور سے دیکھا تو اپنی ہستی ناپائدار
بلبلہ پانی کا ہے جو بنتے بنتے ٹوٹ جائے

آشیاں تاکا تو بلبل نے کہا پروردگار
دست صیاد ستمگر اُٹھتے اُٹھتے ٹوٹ جائے

کس مصیبت سے بہائی کوہکن نے جوئے شیر
حیف یوں امید شیریں بندھتے بندھتے ٹوٹ جائے

رشتۂ الفت کی بندش بار بار آساں نہیں
اتنا مت کھینچو کہ آخر کھنچتے کھنچتے ٹوٹ جائے

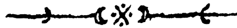
عالم ایجاد میں ہے اُس کی حسرت دردناک
باغ ہستی سے جو غنچہ کھلتے کھلتے ٹوٹ جائے

غیر ممکن ہے غزل لکھنے کو بیٹھے جب خیال
سلسلہ مضموں کا دل میں آتے آتے ٹوٹ جائے

رسول احمد خیال



# بات چیت



پروفیسر ہیڈلے (Hadley) کے قانون روم پر نظر ڈالتے ہوئے محبوب کی آنکھیں تیزی کیساتھ بند ہو رہی تھیں، مضمون غیر دلچسپ ہونے کے سبب سے محبوب نے تقسیم اوقات میں اس کتاب کو آخر میں رکھا تھا، یعنی شب میں سونے سے کچھ قبل، رات کے دس بج چکے تھے اور کتاب رکھ کر محبوب بستر پر جا رہا تھا کہ یکایک اسے کسی کے آنے کی آہٹ معلوم ہوئی، یہ دیکھ کر وہ ٹھہر گیا، فوراً سلیمہ نے چک اٹھا کر آنے کی اجازت مانگی، محبوب ہنستا ہوا آگے بڑھا اور سلیمہ کے لئے کرسی سیدھی کرنے لگا، ہلکی آواز سے اپنے دوست محبوب کا شکریہ ادا کرتی ہوئی وہ کرسی پر بیٹھ گئی اور محبوب بھی ایک قریب کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

اس موقع پر محبوب نے زیادہ گفتگو کرنے سے گریز کرنا چاہا کیونکہ اس کی آنکھیں نیند سے لبریز تھیں، لیکن سلیمہ کی خاطر شکنی کے خیال سے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا (اسے سلیمہ کے اس غیر متوقع آمد پر ضرور تعجب تھا)

مزاج پرسی کے بعد محبوب نے سلیمہ سے اس وقت آنے کا سبب دریافت کیا اور وہ جواب کا منتظر ہی تھا کہ سلیمہ نے نظر اٹھائی اور کہا "میں نے آپ کو ناوقت تکلیف دی لیکن میں امید کرتی ہوں کہ جس مسئلہ کے انکشاف کے لئے میں آپ کے پاس آئی ہوں اس کی اہمیت و نیز اہم سبق ہونے کے لحاظ سے آپ میری اس بے تکلفی کو معاف فرمائیں گے"

محبوب سلیمہ کی ذہانت و سنجیدگی سے بخوبی واقف تھا، چنانچہ وہ سلیمہ کی طرف متوجہ ہو گیا اور معذرت کے جواب میں کہنے لگا "نہیں آپ کے آنے سے مجھے بہت خوشی ہوئی، بیشک اگر کسی مسئلہ کے سلسلہ میں میری رائے آپ ضروری سمجھیں تو میں ہر وقت اس خدمت کے لئے تیار ہوں، اس عزت

افزائی کا شکریہ میں کس طرح ادا کروں "
سلیمہ کی نظریں نیچی تھیں وہ اسی انداز سے کہنے لگی " میں نے آپ کا مضمون عورتوں کے حقوق پر دیکھا ہے، اس کے پڑھنے سے مجھے بہت مسرت ہوئی، لیکن کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ آپ کے خیال کے اور لوگ بھی دنیا میں ہوں گے ؟ "
محبوب :- " کسی حق بات کی تحریک کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ لوگ ہمارے ہم خیال بھی ہوں ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ ہمارا دعویٰ کہاں تک صحیح ہے، اور ہمیں اسی پر جہاں تک ہمارے اخلاقی فرض کا تقاضہ ہے اکتفا کرنا چاہئے، دنیا کے ہر دائرہ میں ہزاروں تحریکیں پیدا ہوتی رہتی ہیں، اگر ان کے بانی اپنے خیالات کو پابندیوں کے حدود سے آزاد نہ رکھیں تو ہمارے لئے ترقی کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا، اور اس مسئلہ کے متعلق جس کا آپ نے ابھی ذکر کیا ہے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس عہد میں ایسے اشخاص کی تعداد زیادہ ہو رہی ہے جو عورتوں کے حقوق کو اُن کے انسان ہونے کے حیثیت سے اپنی ذہانت میں زیادہ فروغ و جگہ دے رہے ہیں جو فی الحقیقت یہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنی جنس کے اُن افراد کو انسان سمجھ کر اُن کے حقوق کے بارہ میں کشادہ دماغی سے کام لیں اور بالآخر جن کا دنیا میں یہی اصول مایۂ ناز ہے کہ ہم سب خواہ مرد ہوں یا عورت، شرقی ہوں کہ غربی خدا کے بندے ہیں جس طرح ہم طبقۂ ذکور سے ہیں اسی طرح وہ طبقۂ اناث سے ہیں، اور ہم مشرق کے باشندے ہیں تو وہ مغرب کے، جو مادی تفاوت ہمارے اُن کے درمیان باعث امتیاز ہو سکتے ہیں ان کی حدود وہیں تک ہیں ۔
سلیمہ :- پھر ہم لوگوں پر کیوں اس قدر زیادتیاں برتی جاتی ہیں، ہم کو کیوں وہی آزادی نہیں دی جاتی جو آپ لوگوں کو ہے ہمیں کیوں دنیا کے ان دلچسپ مجالس سے محروم رکھا جاتا ہے جس میں آپ لوگ حصہ لیتے ہیں، اگر ہم میں سے کسی نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا قصد کیا تو آپ لوگ کیوں معترض ہوتے ہیں اخلاقیات کے لحاظ سے آپ میں اور ہم میں کیا فرق ہے، جب آپ لوگ اپنے لئے علوم و فنون کی تحصیل کو جائز سمجھتے ہیں تو ہمارا طبقہ اس کا نااہل کیوں سمجھا جائے، میرے خیال میں رسوم کی پابندیوں نے ہم کو انسانی معیار سے اس قدر گرا دیا ہے کہ ہمارے دل و دماغ سے یہ احساس ہی جاتا رہا ہے، اور بعض اوقات ہماری حیثیت مثل ایک بے حس مقبوضہ کے سمجھی جاتی ہے "
محبوب :- میں آپ کے ان خیالات کی قدر کرتا ہوں لیکن ساتھ ہی ساتھ میں ان نکات پر تھوڑی سی بحث کرنا

مناسب سمجھتا ہوں "
سلیمہ "بیشک! میں اسی لئے آئی ہوں کہ آپ اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں، گو میں اس طور سے آپکے آرام میں مخل ہو رہی ہوں "
محبوب "نہیں مجھے عین خوشی ہے، اور میں ایسے زندہ دماغ اشخاص کا ہمیشہ متلاشی رہتا ہوں، دیکھئے! کبھی تواریخ عالم میں ایسی مثال آپ کو نہ ملے گی کہ انسان نے اپنے ایک طرز معاشرت کو ترک کر کے ایک جدید طرز معاشرت کو دوسری ہی صبح سے اختیار کر لیا ہو، اس کے لئے وقت ضروری ہے مثلاً جب یورپ میں علوم وفنون کی تازہ زندگی (Renaissance) پھیلی تو اُس کی تحریک مغربی حصۂ یورپ، اٹلی و جرمنی و فرانس سے شروع ہو کر رفتہ رفتہ ۱۴۸۰ء سے ۱۶۰۰ء تک تمام یورپ میں پھیل گئی، اسی سلسلہ میں ہزاروں اختلافات ہوتے رہے، کسی نے آزادی کا جھنڈا بلند کیا، کہیں عورتوں نے ورجل (Virgil)، سیسرو (Cicero) و یونانی فلاسفروں کے کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا، قومی پلیٹ فارم پر ایمیلیا پیا (Emilia Pia) جس سے ممکن ہے شکسپیر نے اپنی مشہور ہیروئن بٹرس (Beatrice) کو اخذ کیا ہو) اور اولمپیا موریٹا Olympia morata جو سولہ سال کی عمر میں فریرہ (Ferrara) کے مقام پر فلسفہ پر لیکچر دیتی تھی ایسی ذہانت کی عورتیں نمودار ہونے لگیں، لیکن یہ سب ایک دن کا کام نہ تھا، پس میرے اس کہنے سے یہ مطلب ہے کہ ہر جدید تحریک خاص کر معاشرتی کامیابی و عام قبولیت کے لئے وقت درکار ہے، آپ کی اس سرگرمی سے میں یہ سمجھ سکتا ہوں کہ اُن رسوم و قیود نے جو ایک عرصہ سے آپ لوگوں پر مسلط ہیں آپ کی طبیعت میں برگشتگی پیدا کر دی ہے، میں اس کو تسلیم کرتا ہوں، یہ فطرت انسانی سے خارج نہیں، اگر آپ ایک اندھیرے مقام سے روشن مقام پر آئیں تو ایک طرف آپ کو خوشی حاصل ہوتی ہے اور دوسری جانب تنفر، لیکن اعلیٰ تعلیم و تربیت کا یہ تقاضہ ہے کہ گذشتہ نقائص سے ہم کو اتنا تعلق ضرور رکھنا چاہئے کہ وہ ہمارے آئندہ اصلاح میں مدد دے سکیں، ہم کو شاہراہ حقیقت پر سفر کرتے ہوئے سابقہ گمراہی کو بالکل نہ بھول جانا چاہئے، مگر اس کے برے نتائج میں محویت بھی چنداں مستحسن نہیں۔

کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ کل آپ شخصی حکومت کے معتقد و کوشاں رہے ہوں، لیکن آج جمہوریت کی آگ آپ کے سینہ میں بھڑک رہی ہو، پس ایسی صورت میں آپ کو اپنے پچھلے اعتقادات پر نہ یا تاسف

کرنا محض بیکار ہے۔

طبقۂ اناث کی تواریخ کے لحاظ سے یہ عہد بہت خصوصیت رکھتا ہے، اس طبقہ میں اب ایک بیداری سی پیدا ہو گئی ہے، کہیں معاشرتی آزادی کا سوال ہے، کہیں نسوانی یونیورسٹی کے افتتاح کا مسئلہ حل ہو رہا ہے، کہیں سیاسی معاملات میں مساوی حقوق کی آوازیں بلند کی جا رہی ہیں، چنانچہ دنیا کے ہر گوشہ میں ایک ہل چل سی پیدا ہے۔

ہم ہیں کہ محو حیرت ہیں، نظر تعصب سے عورتوں کے اس سرعت پذیر ترقی کو دیکھتے ہیں اور اپنے دل میں کہنے لگتے ہیں کہ ہماری ہی تعداد کیا کم تھی کہ ان لوگوں نے بھی ہمارے ہر طریق معاشرت میں حصہ لینا شروع کیا جس سے ہمارے لئے اور بھی گنجائش کم رہ گئی، قانون کے طالب علم اپنے ہم سبق بہن کو دیکھتے ہیں اور حسرت کے ساتھ اپنی آئندہ بہبودی پر نظر ڈالتے ہیں، فلسفی متحیر ہو کر سوچتا ہے کہ اگر زمانہ کا یہی رنگ رہا تو بالیقین ایک روز عورتیں ہم پر حکمراں ہو جائیں گی، اور پھر یہ اندازہ کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اگر بالفرض تمام دنیا میں ان کو عنان حکومت مل گئی تو کیا قومی جنگ و جدال میں کمی واقع ہو جائے گی، یا کس طرح سے یہ عورتیں امور سلطنت کو انجام دیں گی، کیسے ان کی فوجیں مرتب ہونگی کس طرح میدان جنگ میں یہ عورتیں اسلحہ جات سنبھال سکیں گی، کیونکر ان کے دلوں میں قوت ہوگی کہ توپوں اور تباہ کن گولوں کی دہشت ناک آوازوں کو برداشت کر سکیں، جنگی ہوا بازوں میں بیٹھ کر دشمن سے کس طرح مقابلہ کر سکیں گی، یہ سوچتا ہے اور دم بخود ہو جاتا ہے۔

سلیمہ۔ (مسکرا کر) "آپ بھی تو فلسفی ہیں"

محبوب "جی ہاں! لیکن اس حد تک نہیں، میں کسی شے کی ماہیت پر غور کرتے ہوئے عالم امکان سے باہر قدم نہیں رکھتا، میں نے اپنے ان چند جملوں میں موجودہ کیفیت کی تشریح کر دی ہے، اب میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ کس حد تک کونسا خیال صحیح ہے، اور کس حد تک تعصب و لاعلمی کا دخل ہے، اور بالآخر اس مسئلہ کے متعلق میرے نقطۂ نظر سے حقیقت کیا ہے۔

جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ کسی مناسب جدید طریقہ کی تحریک پیروی و اشاعت جو قدیم طریقہ کے خلاف ہو کوئی اخلاقی جرم نہیں، لیکن یہ خیال کرنا کہ لوگ کیوں فوراً ہماری تقلید کرنے پر تیار نہیں ہوتے عبث ہے، اس واسطے کہ ہر تغیر کے لئے وقت کا گذرنا لازمی ہے، شروع میں ایک

جماعت آپ کی مخالفت کرتی ہے، پھر اُن میں سے ذی فہم افراد آپ کے اصول پر غور کرتے ہیں اور اُسے معقول پاکر اُس کی اتباع پر آمادہ ہوجاتے ہیں، اسی طرح بامتداد زمانہ لوگوں کے خیالات تبدیل ہونے لگتے ہیں اور ہر شخص میں وہی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے جو آپ میں ہے اور وہ آپ کا ہم خیال ہوجاتا ہے، وقت کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا، اس لئے کہ اس کا فیصلہ تحریک کی نوعیت پر منحصر ہے، اگر آپ کسی ملک کے نظام حکومت میں بحیثیت ایک رُکن کے کوئی تبدیلی بطور اصلاح کرنا چاہتے ہیں تو ممکن ہے کہ اس مقصد کو آپ ایک یا دو سال میں حاصل کرلیں، اگر آپ کسی معاشرتی یا مذہبی طریقہ میں تغیر و تبدل کا ارادہ کرتے ہیں تو ممکن ہے کہ آپ کو اس کے تکمیل میں صدیاں گذر جائیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ آج ہی کل پردہ نشین مستورات یا وہ جنھوں نے پردہ میں رہ کر تھوڑی بہت مذہبی تعلیم حاصل کرلی ہے بے نقاب باہر نکل آئیں اور کالج واسکول میں داخل ہوکر ہم لوگوں کے دوش بدوش مختلف علوم وفنون حاصل کرنے لگیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ میں اس کی بھی مخالفت کرنے پر ہر وقت تیار ہوں کہ "جو حالت عام طبقۂ نسواں کی اس وقت ہے قابل اصلاح نہیں یا قسام ازل نے عورتوں کے حق میں صرف خانگی انتظام رکھا ہے اور باقی کے ہم مستحق و مالک ہیں"
ان دو متضاد پہلوؤں کی تشریح میں اس طرح پر کرونگا۔

اول جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دنیا مجموعی حالت سے ترقی کی طرف مائل ہے اور قریب قریب ہر جگہ اسی دور کا اثر نمایاں ہے جو یورپ میں چار پانچ سو برس پہلے تھا، ہم کو عوام وخاص کر عورتوں کے دل و دماغ کو ایسی تربیت دینی چاہئے جس سے وہ آنے والے تغیر کے استقبال کے لئے ہر طرح سے آراستہ و پیراستہ رہیں تاکہ اُن کے اخلاقیات میں کوئی تزلزل واقع نہ ہوسکے اور اُنھیں یکبارگی تاریکی سے روشنی میں آنے سے چکاچوندھ نہ معلوم ہو۔

لہذا طبقۂ اناث میں جن کو خانگی طور پر پوری تربیت صحیح معنوں میں مل چکی ہے اور جو واقعی اس لائق ہیں کہ اپنے کو ہر حالت میں دنیا کی بُرائیوں سے بچا سکیں وہ ہر صیغۂ زندگی میں بآسانی قدم رکھ سکتی ہیں اور اُنھیں ہر سیاسی ومعاشرتی مسائل میں وہی حق حاصل ہے جو ہر ذی عقل مرد کو ہے، قانون کے طالب علم اپنے ہم سبق بہن کو کیوں تعصب وحسرت کی نظر سے دیکھیں، یا فلسفی کیوں

ایک خیالی نظام حکومت کا نقشہ دماغ میں جما کر بہت سے خوفناک نتائج پر پہنچے۔

کیا ہم جون آف آرک (Joan of Arc) الیزا بتھ گانزاگا (Eliza-betta Ganzaga) کی ذہانت و جرأت اور اُن کے جنگی کارناموں کو بھول سکتے ہیں، کیا سلطانہ رضیہ اور چاند بی بی کی شجاعت، فوجی کاوشیں ہمارے دماغ سے محو ہو سکتی ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ عورتیں ہر حیثیت سے مردوں کے دوش بدوش چل سکتی ہیں۔

سلیمہ۔ مجھے آپ کی اس تقریر سے کافی مسرت حاصل ہوئی، خدا کرے آپ کے ہم خیال دنیا میں بڑھتے ہی جائیں، رات زیادہ گذر چکی ہے اس لئے رخصت کی اجازت چاہتی ہوں۔

محبوب۔ خدا حافظ!

حسین احمد کشفی۔ بی۔ اے۔

# شکوۂ گردوں

اے فلک اس قدر ستم رانی!　　اس قدر ظلم کی فراوانی

تجھکو کیا مل گیا جو ہم کو کیا؟　　وقف درد و غم و پریشانی

بے سبب رنج و غم تو ہم کو نہ دے　　ہم نے مانا جہان ہے فانی

تجھکو خالق نے سر بلند کیا　　تو نے اپنی نہ قدر پہچانی

تیرے سائے میں ہے جہان آباد　　پر تجھے ہے پسند ویرانی

آہ تو نے ملائے مٹی میں　　سیکڑوں چہرہائے نورانی

بے گنہ تو نے ذبح کر ڈالے　　سیکڑوں بلبلان بستانی

تو ہے اے چرخ بے کمال نواز　　باکمالوں کا دشمن جانی

رحم کرنا تو تیری خو ہی نہیں
مہربانی کی تجھ میں بو ہی نہیں

محمد اسد خاں۔ بی۔ اے ملتان



# رباعیات

شعرائے فارسی میں سے جو عالمگیر شہرت فردوسی، عمر خیام، مولانا رومی، سعدی اور حافظ وغیرہم کو حاصل ہے وہ کسی اور شاعر ایرانی کو نصیب نہ ہوئی، ان میں سے بھی یورپ نے جس شاعر کی سب سے زیادہ قدر کی وہ عمر خیام ہے، اور اس کی وجہ بقول مولانا شبلی یہ ہے کہ خیام کے خیالات یورپ کے موجودہ مادی خیالات سے اس قدر ملتے جلتے ہیں کہ اگر آج موجود ہوتا تو شاید یورپین بن جاتا رباعیات خیام کے متعلق یورپ کی مختلف زبانوں میں ڈیڑھ سو سے زیادہ تصانیف لکھی جا چکی ہیں۔

عمر خیام اور اُس کی رباعیات محتاج تعارف نہیں، اُردو میں بھی اُن کے متعلق کافی لکھا جا چکا ہے، شعر العجم کے علاوہ ایک مضمون پروفیسر ڈاکٹر اقبال کا اکتوبر سنہ ۱۹۲۳ء کے رسالہ اُردو میں شایع ہوا، جس میں شعر العجم کے تذکرۂ خیام پر چند اعتراضات کئے گئے، اس کے بعد دوسرا مضمون مولانا سید سلیمان ندوی کا فروری سنہ ۱۹۲۴ء کے 'معارف' میں چھپا، جس میں ڈاکٹر صاحب کے اعتراضات کا محققانہ و فاضلانہ طریق پر جواب دیا گیا، یہ دونوں مضمون پڑھنے کے لائق ہیں خاص کر سید صاحب کا مقالہ تو لاجواب ہے، ان کے علاوہ وقتاً فوقتاً موقت الشیوع رسائل اور نیز مستقل تصانیف میں عمر خیام کی بابت مختلف مباحث کی ذیل میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اُردو میں اس قدر مواد موجود ہونے کے باوجود اس رند مشرب شاعر کی بابت اب کچھ اور لکھنا تحصیل حاصل ہے، ایک مصری شاعر نے خیام کے خیالات کو عربی کے قالب میں ڈھالا ہے، اس کے متعلق میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔

اس سے پہلے کہ اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوں میرے نزدیک اس کی ضرورت ہے کہ مدیر محترم اور دیگر قارئین کرام کی خدمت میں اس خشک موضوع پر قلم اُٹھانے کی بابت

معذرت کے طور پر کچھ عرض کروں، عام طور پر ہندوستان میں تعلیم عربی کی جس قدر سرد بازاری ہے اُس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا، عربی کے مشکل ہونے میں کچھ کلام نہیں، مگر چونکہ یہ مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے اس لئے اس کا ان پر بڑا حق ہے، چند طلبہ کا اسلامی مدارس میں عربی پڑھتے رہنا ہم کو اس حق کی ادائیگی سے سبکدوش نہیں کرسکتا، جس رفتار سے عربی تعلیم کا انحطاط ہو رہا ہے اگر یہی لیل و نہار ہیں تو بہت جلد عربی ہمارے لئے لیٹن و گریک ہو جائے گی، تاوقتیکہ ہم یہ احساس نہ کریں کہ عربی سیکھنا ہمارا فرض ہے اور تاوقتیکہ عربی سے ہم کو وہی مناسبت نہ ہو جو فارسی سے ہے، اس کا ہمارے یہاں موجودہ زمانہ کی تشویشناک کشمکش حیات میں برقرار رہنا معلوم، دیکھئے سنسکرت عرصہ سے مردہ ہو چکی مگر برادران وطن اس کے احیاء کے لئے کس قدر جد وجہد کر رہے ہیں، اسکولوں اور کالجوں میں السنۂ مشرقیہ لینے والے طلباء کی جماعت میں سنسکرت لینے والے طالب علموں کی تعداد ترقی پذیر ہے اور عربی لینے والوں کا شمار کم ہو رہا ہے، ہندؤں کو تعلیم سنسکرت کی طرف جس قدر اعتناء ہو چلا ہے اور مسلمانوں کو عربی سے جس قدر بے پروائی و بے توجہی ہو رہی ہے اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہندو یونیورسٹی میں سنسکرت لازمی ہے اور مسلم یونیورسٹی میں بجائے عربی کے اُردو کو لازمی کیا گیا ہے، حالانکہ ہندو ہندی کو لازمی کرسکتے تھے مگر اُنھوں نے تعلیم سنسکرت کو زیادہ اہمیت دی، علاوہ بریں اُن کے ہاں ہندی کو قریب قریب سنسکرت بنا دینے کا رجحان ہے، پس ترقیِ ہندی مستلزم احیاءِ سنسکرت ہے، اور ہمارے ہاں بہی خواہانِ اُردو حتی المقدور اُردو کو عربی و فارسی سے بیگانہ یعنی بھاشا بنا دینا چاہتے ہیں، پس اُردو کی یہ مجوزہ ترقی عربی کے لئے سم قاتل ہے ع ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا ہمارے غیر ذمہ دار نوجوان عربی کو اونٹوں کی زبان بتلا کر اس کی تحقیر کرتے ہیں، لیکن اگر قرآن پاک کلام الٰہی ہے اور اگر جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم روحی فداہ رسول خدا ہیں تو عربی کا جو مرتبہ خدا اور خدا کے رسول کے نزدیک ہے اُس کا اندازہ کرنا آسان نہیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب انگریزی مدارس کے نصاب میں عربی داخل ہے تو اُسے چھوڑ کر فارسی کیوں لی جاتی ہے، عربی کے بعد صاحب مذاق سلیم کو فارسی خود بخود آجاتی ہے، اور جس کا مذاق سلیم نہیں ہوتا وہ فارسی پڑھ کر بھی کچھ حاصل نہیں کرسکتا، اس صوبہ کی

گورنمنٹ مسلمانوں کے دلی شکریہ کی مستحق ہے کہ اس نے عربی کے امتحانات قائم کرکے مسلمانوں کو اپنے حق کی ادائگی کا بہت کچھ موقعہ دیا ہے، اس بارہ میں مولانا ضیاء الحسن صاحب علوی انسپکٹر مدارس عربیہ کی مساعی جمیلہ نہایت قابل قدر و سزاوار ہزار تحسین و آفریں ہیں کہ آپ کی بدولت عربی کی تعلیم کی طرف کچھ توجہ ہو چلی ہے۔

جو کچھ اوپر عرض کیا گیا اُس سے میرا مطلب صرف اس قدر ہے کہ مسلمانوں کو عربی کی طرف توجہ کرنی چاہئے، توجہ کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہر مسلمان عربی میں کامل ہو بلکہ ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو اتنی عربی ضرور جاننی چاہئے کہ وہ عربی عبارت کو نیچے دئے ہوئے ترجمہ کی مدد سے سمجھ سکے، اور یہ چنداں مشکل نہیں، اس قدر عربی دانی اُردو اور فارسی دونوں کے لئے نہایت مفید اور کارآمد ہے اس مقصد کے لئے بہترین کوشش یہ ہو سکتی ہے کہ عربی نظم و نثر کے ایسے دلچسپ اقتباسات ترجمہ کے ساتھ رسالوں میں شایع ہوتے رہیں جن سے عربی کی طرف رغبت پیدا ہو، اس میں کچھ شک نہیں کہ نثر سے زیادہ نظم کو پسند کیا جاتا ہے، فارسی نثر اس قدر نہیں پڑھی جاتی جس قدر فارسی اشعار، مگر عربی شاعری کچھ تو خود زبان عربی کے مشکل ہونے کی وجہ سے اور کچھ عرب کے مناظر فطرت اور اُن کا اسلوب بیان مختلف ہونے کے باعث، ہمارے نزدیک عربی شاعری ایسی دلآویزی و دلکشی نہیں رکھتی، اس لئے ہمیں اس سے بہت زیادہ اجنبیت ہو گئی۔

لیکن اگر عربی کے ایسے اشعار جو ہمارے اردو و فارسی شاعری کے مذاق کے مطابق ہوں متواتر پیش کئے جائیں گے تو اُردو فارسی داں ناظرین میں عربیت سے لگاؤ ضرور پیدا ہو جائے گا، اسی خیال نے مجھے آمادہ کیا ہے کہ عمر خیام کے عربی ترجمہ کو، اگرچہ اُسے شایع ہوئے چودہ برس ہو گئے، ناظرین سے روشناس کروں، جو اصحاب اس سے حظ اُٹھا چکے ہیں اُن کے لئے قند مکرر ہے دیگر حضرات کے لئے عربی شاعری کی بیش بہا متاع کا نمونہ، اس قدر طویل معذرت کے بعد آمدم بر سر مطلب۔

مترجم مصری کا نام ودیع آفندی ہے، یورپ کے مشہور کتب خانوں میں جو دیکھا کہ رباعیات خیام کے متعلق وہاں کی مختلف زبانوں میں ایک سو ترپن تالیفات موجود ہیں تو اُن کو شوق ہوا کہ عربی میں بھی ترجمہ کی جائے، فارسی سے زیادہ واقف نہیں، انگریزی و فرانسیسی زبان خوب

جانتے ہیں، اس لئے بجائے اصل رباعیات فارسی کے فنٹز جیرلڈ کے انگریزی ترجمہ سے زیادہ مدد لی، جنھوں نے اس انگریزی ترجمہ کو دیکھا ہے اُن کو خوب معلوم ہے کہ رباعیات خیام انگریزی زبان میں جاکر کچھ کی کچھ ہوگئیں، فاضل مترجم نے اسی انگریزی ترجمہ سے زیادہ استفادہ کیا ہے، پس اگر اصل رباعیات اور عربی ترجمہ کے درمیان نمایاں فرق ہو تو کچھ تعجب کی بات نہیں، تاہم ودیع آفندی نے کمال کیا ہے کہ حتی المقدور رباعیات کے اصل مفہوم کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

رباعیات عمر خیام کی تعداد کے متعلق بڑا اختلاف ہے، شاعر عربی نے مشکوک اور نیز متحد المعنی رباعیات کو چھوڑ کر صرف انشی رباعیوں کی روح کو عربی کے قالب میں ڈھالا ہے، ان رباعیا کو دو نظموں میں تقسیم کیا ہے، نشید اول و نشید دوم، ایک ایک رباعی کا مفہوم ... ہوئی بحر کے سات سات مصرعوں میں ادا کیا ہے، جن کا نام سباعی رکھا ہے، عربی میں اس قسم کی نظم کو موشح سباعی کہتے ہیں یہ موشح سباعی اندلسیوں کی ایجاد ہے، ابتداءً شعر عربی میں قصیدہ، غزل، تشبیب ورجز تک محدود تھا، لیکن جب اندلس میں بنوامیہ کی سلطنت عروج پہ تھی تو عوام الناس کے جوش تغنم و ترنم سے شعر کی دو قسمیں اور پیدا ہوگئیں، ایک موشح دوسری زجل، شروع میں یہ دونوں قسمیں گیت کی حیثیت رکھتی تھیں اور شان ادبیت سے معرا تھیں، لیکن جب ابن عبدربہ صاحب عقد الفرید المتوفی ۹۴۰ھ نے موشح کی، اور ابوبکر بن قزمان المتوفی ۱۱۶۰ھ نے زجل کی تہذیب و اصلاح کی تو پھر ان کی مقبولیت کی کوئی حد نہ رہی، فارسی اُردو شاعری کے لحاظ سے موشح سباعی کو مسمط مسبع کہ سکتے ہیں، قافیہ کا یہ التزام ہے کہ ہر بند میں پہلے تین مصرعے ہم قافیہ پھر چوتھا و پانچواں مصرع ہم قافیہ، چھٹا مصرعہ بلا قافیہ، ساتویں مصرعہ کا قافیہ تمام نظم میں، فارسی مسبع کی طرح ایک ہی ہے، مثلاً پہلے نشید میں عام قافیہ 'جوایا' 'وسحابا' ہے اور دوسرے میں 'خیالا' و 'جمالا'۔

بحر دونوں نشیدوں کی ایک ہے، یعنی بحر خفیف مسدس، فاعلاتن مستفع لن، فاعلاتن، اُردو فارسی میں یہ بحر سالم مستعمل نہیں ہوتی، صرف زحافات کے ساتھ آتی ہے، اور وہ یہ ہے، فاعلاتن مفاعلن، فعلاتن (آخری رکن بہ تحریک عین و بسکون عین ہر دو و نیز بحذف تا جائز) عربی میں اس قدر آزادی ہے کہ ایک ہی نظم میں یہ بحر سالم بھی مستعمل ہوسکتی ہے اور زحافات کے ساتھ بھی، اور زحافات ہر رکن میں آسکتے ہیں، بحر خفیف کی نسبت نعمت خان عالی کے اس شعر سے ؎

در بحر خفیف شاعری کن مفعول مفاعلن فعولن

جو اُس نے وقائع میں کسی نصاب اطفال کو شروع کرتے ہوئے لکھا ہے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے، اس شعر کی رو سے بحر خفیف کا وزن مفعولن مفاعلن فعولن قرار پاتا ہے اور یہ غلط ہے، بات یہ ہے کہ اس شعر میں نعمت خان عالی نے لفظ 'بحر خفیف' اصطلاحی معنی میں استعمال نہیں کیا ہے بلکہ یہ چھوٹی بحر ہے اس لئے بحر طویل کے مقابلہ میں بحر خفیف کہدیا ہے، ورنہ عروض کے لحاظ سے یہ بحر ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف ہے۔

---

یہاں چند سباعیات عربی نمونہ کے طور پر نقل کرتا ہوں، اگرچہ رباعیات عمر کافی تعداد میں ہیں لیکن سب کا قدر مشترک دنیا کی بے ثباتی، خوش دلی و فارغ البالی کی ترغیب، توبہ کا ذکر، مسئلہ جبر کی بحث وغیرہ مضامین ہیں، اس لئے رباعیات کے مضامین میں تشابہ بہت زیادہ ہے سباعیات میں مفہوم کا لحاظ رکھا ہے، جس کی وجہ سے ہر سباعی کے لئے خاص رباعی کا تعین کرنا کافی مشکل ہے تاہم میں سباعیات کے ساتھ اُن کی اصل رباعیات بھی درج کرتا ہوں، تاکہ مقابلہ و موازنہ بآسانی ہو سکے۔

آں قصر کہ بہرام درا و جام گرفت آہو بچہ کرد و شیر آرام گرفت
بہرام کہ گور میگرفتے بکمند دیدی کہ چگونہ گور بہرام گرفت

---

قصر بہرام مربع السلطان
بات ماوی الآرام والغزلان
ومراح الضرغام والسرحان
والملیک الصیاد صید واردی
ومن العرش حط حطا للحد
بقر الوحش فوقہ راتحات
غادیات تحتاج اسرابا

(ترجمہ) قصر بہرام جو بادشاہ کے موسم بہار میں قیام کرنے کی جگہ تھی، اب وحشی جانور مثل ہرن، شیر و گرگ کے رہنے سہنے کا مقام ہوگیا، اور شکار کرنے والا بادشاہ خود (موت کا) شکار ہو کر ہلاک ہوگیا اور تخت بادشاہی کو چھوڑ کر قبر میں جا اُترا، جس کو نیل گایوں کا غول صبح و شام برباد کرتا رہتا ہے۔

(نوٹ) فارسی میں لفظ "گور" کی جو خوبی تھی وہ عربی میں کیونکر باقی رہ سکتی تھی، مگر تاہم الملیک الصیا دصید؛ مزید ار فقرہ ہے۔

آں قصر کہ بر چرخ ہمی زد پہلو — بر درگہ او شہاں نہادندے رُو
دیدیم کہ بر کنگرہ اش فاختۂ — بہ نشستہ ہمی گفت کہ کوکو کوکو

رُبّ قصرٍ ناجت ذرا ہ السماکا — (ترجمہ) بہت سے ایسے محل تھے جن کی چوٹیاں سماک سے باتیں
وتزاءت قبابہ ٢ فلاکا — کرتی تھیں اور جن کے گنبد آسمان (کی طرح بلند) نظر آتے
وملوکٌ کانت تخرّ ھنا کا — تھے، اور جہاں بڑے بڑے بادشاہ سر بسجود آستان بوسی
وتمرّ الجباہ بالاعتاب — کرتے تھے جیسا کہ نماز پڑھنے والے محرابوں میں جبہ سائی
باحترام العباد فی المحراب — کرتے ہیں آج وہ ویران پڑے (اور کبوتروں اور کووں
وھناك الیوم الحمام ینادی — کے مسکن بنے) ہوئے ہیں کہ کبوترا اپنے جوڑے کو آواز دے
یوسفا والغراب یدعو الغرابا — رہا ہے اور کوا کوے کو بلا رہا ہے۔

(نوٹ) فاختہ کی آواز کو فارسی میں کوکو کہتے ہیں، اس نے ایک خاص لطف پیدا کر دیا، جو عربی میں باقی نہ رہا۔

ایں کہنہ رباط را کہ عالم نام است — آرام گہ ابلق صبح و شام است
بزمیست کہ وا ماندۂ صد جمشید است — قصریست کہ تکیہ گاہ صد بہرام است

دار ناصاح خیمۃ فی قفار — (ترجمہ) اے دوست ہماری دنیا (گویا) جنگل میں ایک خیمہ
ذات بابین من دجی و نھار — ہے، جس میں تاریکی و روشنی کے دو دروازہ ہیں اور جو ہر
ومقیلٌ لکل غاد و سار — قسم کے مسافر کے لئے خواہ صبح کا چلا ہو یا شام کا ٹھہرنے
ھناک فانظر آثار عز مأت — کی جگہ ہے، یہاں کے کھنڈروں میں جمشید جیسے سیکڑوں
مثل جمشید بعض ھذی الرفات — بادشاہان اولوالعزم کے آثار حشمت کو دیکھ، اور بہرام کے
وارن وانظر اطلال اربع بھرا — ویران اجڑے ہوئے محلوں پر نظر ڈال اور خیال کر کہ یہاں
وکم من جاء واوجد واذ ھابا — کتنے ہی ایسے آئے اور چلے گئے۔

—

در فصل بہار بابت حور سرشت | یک کوزۂ مے اگر یو بہر لب کشت
ہر چند بنزد عام بد باشد این | از سگ بترم اگر کنم یاد بہشت

(ترجمہ) میرا مقام جنگل میں ایک سایہ دار شاخ درخت کے نیچے ہے، میرا توشہ دو روٹیاں اور شیشۂ مے ہے، اور میرے اہل وعیال دیوان شعر اور وہ محبوب ہے جس کا میرا معیت زدہ دل شیفتہ ہے اور جو دل سوز و جانگداز نغمے گاتا رہتا ہے، میں ان جنگلوں میں ناز و نعم کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہوں، اور (جنت کے محلوں کو) یہاں کے مقابلہ میں کھنڈر سمجھتا ہوں۔

دمقامی غصن مظل بقفر
ورغیفان مع زجاجۃ خمر
کل زادی والاهل دیوان شعر
وحبیب یهواه قلبی لمغنی
بشجی یذیبنی مستغنی
ھکذا اسکن القفار نعیما
دار ی ھذہ القصور خرابا

---

روزے کہ زتو گذشتہ شد یاد مکن | فردا کہ نیامدست فریاد مکن
از آمدۂ و گذشتہ بنیاد مکن | حالے خوش باش و عمر برباد مکن

(ترجمہ) میری زندگی ندیوں کے آب رواں کے مانند ہے، یا فضاے دشت کے سرگرداں ہوا کی طرح، میری شام زندگی قریب آرہی ہے اور زندگی کے دن گذرتے جاتے ہیں، جو دن گذر چکے ہیں جن کا دیکھنا پھر نصیب نہ ہوا، اور جو دن آنے والے ہیں، جن کے دیکھنے کی مجھے امید ہے، ان دونوں طرح کے دنوں میں، میں اپنی زندگی کو رنجوں سے گراں بار کرنا نہیں چاہتا، کیونکہ مجھے سواے موجودہ دن کے اور کسی دن کی پرواہ نہیں۔

ھا حیاتی کالماء فی الانھار
او کریح حیری بعرض القفار
فمسائی دان و ناء نھاری
ولیوم مضی بان لست اراہ
ولیوم لعلنی القاہ
لم اسمها حمل الهموم وانی
لسوی الیوم ما حسبت حسابا

---

دی کوزہ گرے بدیدم اندر بازار | بر تارک گل لگد ہمے زد بسیار
واں گل بزبان حال باوی می گفت | من ہمچو تو بودہ ام مرا نیکو دار

| | |
|---|---|
| امس ابصرت جارنا الخزا فا<br>یجبل الطین کیف شاء عتسافا<br>ویکیل المقدار منہ جزافا<br>وکانی اسمعت بین یدیہ<br>صوت ذات مظلومۃ تشتکیہ<br>الا رفقا فانت طین وماء<br>ایہا المرء لا تسمنی العذابا | (ترجمہ) کل میں نے اپنے پڑوسی کمہار کو جو دیکھا کہ مٹی سختی سے گوندھ رہا ہے اور اٹکل سے گوندے بنا رہا ہے، تو اس کے پاس سے ایک مظلوم کی آواز کان میں آئی، جو اس سے شکایت کر رہا تھا کہ اے آدمی زادہ مجکو اتنا نہ ستا۔ ذرا تو رحم کر کہ تو بھی آخر (میرا ہم جنس) یعنی آب و گل ہے |

---

خیام تنت بخیمۂ مانند راست　　سلطان روح و منزلش دار فناست

فراش اجل ز بہر دیگر منزل　　ویران کند ایں خیمہ چو سلطان برخاست

| | |
|---|---|
| ایہ خیام انما الاجسام<br>للنفوس الموقتات خیام<br>ولحین لھن فیہا مقام<br>ثم یخلینہا الی لا مکانا<br>او مقرا او مدۃ او زمانا<br>وتسل الاطناب یسری منون<br>بیمین تصرم الآجالا | (ترجمہ) اے خیام بدن (گویا) روحوں کے خیمے ہیں، وقت مقررہ تک وہ ان میں ٹھہرتی ہیں پھر وہ ان کو چھوڑ کر لامکان کی طرف، جہاں نہ زمان کی قید ہے نہ مکان کی، چلی جاتی ہیں موت کے بائیں ہاتھ دائیں ہاتھوں کی مدد سے (یعنی موت کے دونوں ہاتھ) اُن خیموں کی رسیوں کو کھینچتے ہیں، اور اس طرح میعادوں کو منقطع کرتے ہیں۔ |

(نوٹ) یہ دوسری نشید کا بند ہے، جس کا قافیہ 'جمالا' و 'خیالا' ہے۔ ذیل میں دو رباعی ایسی درج ہیں جن کے لئے اصل رباعی ذہن میں نہ آئیں۔

| | |
|---|---|
| ملء صدری ادواؤہ والکروب<br>یا ندامی وھی الطبیب العجیب<br>فعن الخمر کیف کیف اتوب<br>فبا وراق کرمۃ کفنونی | (ترجمہ) میرا سینہ امراض و آلام سے پُر ہے، اے ہمنشینو! شراب ہی اس کا علاج ہے، پس اس سے کیونکر توبہ کرسکتا ہوں، جب مرجاؤں تو مجھے انگور کے پتوں کا کفن دو اور انگور ہی کے جڑوں میں دفن کرو اور شراب ہی سے |

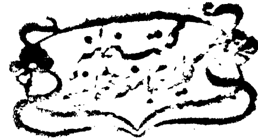
وبکرام بین الاصول ادفنونی
واغسلونی بالخمر فالخمر فاقت
بصفاھا ذاک الزلال الحلالا

غسل دو کیونکہ شراب صفائی میں پاک صاف پانی سے بہتر ہے۔

---

یا ندیمی قد ان موت الندیم
فاذکرنی ذکر الصدیق القدیم
وابکینی بدمع بنت الکرم
وبکاس الرحیق قف فوق قبری
واسکب الخمر فوق عشب وزھری
فرفاتی اذ ذاک زھر وعشب
وانا الشئ کان کونا وحالا

(ترجمہ) اے میرے ہمنشین، دوست کے (یعنی میرے) مرنے کا وقت آگیا، مجھے ایک دوست قدیم کی طرح یاد کیا کرنا، اور دختر رز کے آنسوؤں سے رویا کرنا (یعنی اشک میگوں بہایا کرنا) شراب کا پیالہ لیکر میری قبر پر کھڑے ہونا، اور میری قبر کی سبز گھاس اور پھولوں پر شراب ڈالا کرنا، کیونکہ اُس وقت میری بوسیدہ ہڈیاں سبز گھاس اور پھولوں کی شکل میں ہوں گی، دیکھو، میری تغیر پذیر ہستی ایک شکل میں پیدا ہوئی اور پھر دوسری صورت میں منتقل ہوگئی۔



---

نظم فارسی کو عربی جامہ پہنانے کی یہ پہلی کوشش نہیں ہے، اس سے صدیوں پہلے چوتھی صدی ہجری کی ابتداء میں جبکہ عربی شاعری کا انحطاط تھا اور فارسی شاعری کا عنفوان شباب عربی شعرا فارسی کی ضرب المثلین، مشہور جملے اور نادر مضامین کا ترجمہ کیا کرتے تھے، ابوالفضل سکری مروزی کو اس میں خاص مہارت حاصل تھی، یہ عجیب بات ہے کہ جب فارسی شاعری کا آغاز ہوا تھا تو ابتداءً ایرانی شعرا نے عربی اشعار کے لفظی ترجمہ کو اپنا تختۂ مشق بنایا تھا چنانچہ ابتدائی دور کے فارسی ادب میں بہت سے ایسے اشعار موجود ہیں جو درحقیقت عربی اشعار کے ترجمہ ہیں، اگر اس قسم کی کوشش طرفین سے اب تک جاری رہتی تو عربی و فارسی شاعری کو بڑا فائدہ پہنچتا اور ان کے درمیان اس قدر اجنبیت و مغائرت نہ ہوتی، مگر افسوس ہے کہ آگے چل کر بہت جلد عربی و فارسی میں اس قدر تفرقہ ہوگیا کہ پھر اُن کے ڈانڈے ایک جگہ نہ مل سکے

فارسی کی شاعری ترقی کرتی گئی، اور عربی شاعری رو بانحطاط رہی، تا آنکہ انیسویں صدی کے وسط سے مصر میں علمی انقلاب عظیم رونما ہوا، جس کی بدولت ادبیات عربیہ نے پھر ترقی کرنی شروع کی سب سے پہلے علامہ جبرئیل آفندی جو اسکندریہ میں دفتر خدیوی کا میر منشی تھا اپنی قادر الکلامی و شیوا بیانی سے گلستان سعدی کا (نثر کا نثر میں اور نظم کا نظم میں) ایسا ترجمہ کیا کہ فصاحت و بلاغت میں اصل سے کسی طرح کم نہ رہا، یہ ترجمہ جُلستان کے نام سے مشہور ہے۔

ممکن ہے خیام کی رباعیات کو عربی سباعیات میں دیکھکر ناظرین کرام یہ خیال کریں کہ غالباً عربی شاعری میں فارسی شاعری کے دوش بدوش چلنے کی استطاعت نہیں اور فارسی شاعری عربی شاعری سے بہتر ہے، یہ سوال اس قدر اہم ہے کہ بجائے خود ایک مستقل مضمون کیا بلکہ ایک مستقل تصنیف کا مقتضی ہے، ہم اس موقعہ پر صرف اس قدر کہنا چاہتے ہیں کہ صحیح ترجمہ کسی ایک زبان سے دوسری زبان میں، خاص کر نظم کا نظم میں اس رعایت کے ساتھ کہ اصل کا لطف جوں کا توں باقی رہے قریب قریب محال ہے، کیونکہ ہر زبان کی خصوصیات جدا گانہ ہوتی ہیں۔

علاوہ بریں ودیع آفندی نے رباعیات کا لفظی ترجمہ نہیں کیا، بلکہ اُن کے مضامین و خیالات کو آزادانہ طور پر عربی کے قالب میں ڈھالا ہے اور ایسا کرنے میں اُس نے زیادہ تر فٹز جیرلڈ کے انگریزی ترجمہ کو پیش نظر رکھا ہے، ہم یہاں گلستاں کے شروع کے چند (بلا انتخاب) اشعار کا ترجمہ عربی جبرئیل آفندی کی جلستان سے نقل کرتے ہیں، جس سے عربی زبان کی وسعت کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

فارسی

اے کریمے کہ از خزانہ غیب — گبر و ترسا وظیفہ خور داری
دوستاں را کجا کنی محروم — تو کہ با دشمناں نظر داری

عربی

یا من خزائن غیبہ یعطا ئہ — حبت المجوس و طائف الاقوات
فتحرم الاحباب نظرۃ رافۃ — و تراعد اک برحامدی الاوقات

فارسی

چہ باک از موج بحر آنرا کہ باشد نوح کشتیباں — چہ غم دیوار است را کہ دارد چوں تو پشتیباں

عربی

من حل لنوح فلکہ لم یغرق — ما دمت رکنًا للورٰی فلنستریح

کرم بین ولطف خداوندگار فارسی گنہ بندہ کرد است واوشرمسار

انظر الی کرم الالہ ولطفہ عربی العبد یذنب وھو منہ یستحی

خوف طوالت سے اس نمونہ مشتے از خروارے پر اکتفا کرتا ہوں۔ اس سے عربی کی وسعت کا کسی حد تک اندازہ ہوسکتا ہے، یعنی یہ کہ فارسی کے ایک شعر کا ایک شعر میں، اور رباعی کا چار مصرعوں میں ترجمہ بخوبی ممکن ہے، چنانچہ گلستاں میں جس قدر رباعیات ہیں اُن سب کا چار مصرعوں میں یا کی طرح پابندی قافیہ کے ساتھ ترجمہ کیا گیا ہے۔

ختم مضمون پر خیام کی ایک رباعی کا اردو ترجمہ لکھتا ہوں، جسکو آغا حشر کشمیری نے منظوم کیا ہے، مگر اردو ترجمہ میں وہ بات نہیں۔

این کوزہ چو من عاشق زارے بودست در بند سر زلف نگارے بودست
این دستہ کہ در گردن او مے بینی دستے ست کہ در گردنِ یارے بودست

یہ کوزہ بھی عشاق وفادار میں تھا الجھا ہوا اک طرۂ طرار میں تھا
یہ دستہ جو ہے اُس کے گلے میں وہ ہاتھ ہے جو گردن دلدار میں تھا

زبیدہ احمد

# نغمۂ جذبات

بیمار ہوئے رخصت یہ کہہ کے ستم گر سے اب دادِ ستم لیں گے ہم داورِ محشر سے
آخر مجھے دنیا میں محروم ستم رکھا کیا اور توقع تھی تم جیسے ستمگر سے
اک وہ ہیں تمنائیں مقبول ہوئیں جنکی سو بار پھرے ہم تو محروم ترے در سے
اب بھی ترے ملنے کی امید ہے کچھ باقی اتنا بھی نہ غافل ہو انسان مقدر سے
اللہ رے بے چینی اُن شوخ نگاہوں کی ہے چھیڑ لحد میں بھی جاری دل مضطر سے
یا درد کی ہر لحظہ ہوتی نہ خلش دل میں یا کوئی بدل دیتا دل کو مرے پتھر سے

سادات میں شامل ہوں مستِ مئے وحدت ہوں
نسبت ہے مجھے کوثر یہ ساقی کوثر سے

سید احسان الحق کوثر

# ایک واقعہ

گذشتہ سے پیوستہ

## باب ۴

لکھے نامہ جو طلب کا مجھے وہ غیرت گل
اس قدر تیز چلوں میں کہ ہوا بن جاؤں

ایک بجے دن کا وقت ہے، دھوپ سخت ہے، ہوا گرم چل رہی ہے، خاک اُڑتی ہے۔ مگر دو شخص بائسکل پر سوار جھونسی کی سڑک پر پورب کی طرف تیزی سے بائسکل اُڑائے چلے جارہے ہیں ہرچند کہ تھک گئے ہیں مگر پیر چلا جارہا ہے، ایک اُن میں مرتضیٰ ہے اور دوسرا شہاب الدین نامی ایک لڑکا معلوم ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کئی روز سے ماجد سسرال گیا ہوا ہے، آج مرتضیٰ کے دل میں یہ بات آئی کہ بیندا چلنا چاہئے، شہاب الدین کو ساتھ لیکر چلا ہے، اور تیزی سے چلا جارہا ہے کیونکہ آج شام تک واپسی کا ارادہ ہے، ابھی ایک گھنٹہ ہوا کہ جھونسی سے چلے ہیں اور بیندا کی مسجد دور سے دکھائی دے رہی ہے، دل میں خوش ہو رہے ہیں کہ اُن کی محنت ٹھکانے لگی، ابھی اسی خیال میں تھے کہ مکان کے سامنے پہنچ گئے، بائسکل سے اُترے اور مٹر کی پھلیوں سے شغل کرتے ہوئے مکان کی طرف روانہ ہوئے اُدھر گاؤں میں یہ خبر بہت گرم ہے کہ دو شخص بائسکل سوار گاؤں میں آرہے ہیں، سب لوگ دیکھنے کو نکلے ہیں، ماجد بھی جو اتفاق سے چچا کے مکان پر موجود تھا یہ خبر سنکر کمرہ سے باہر نکل آیا ہے اور گلی کی طرف دیکھتا ہے ناگاہ آنکھیں چار ہوئیں اور وہ اس قدر خوش ہوا کہ اپنے آپ کو بھول گیا۔

ماجد۔ یا الٰہی یہ میں کیا دیکھتا ہوں! دن ہے کہ رات!

مرتضیٰ۔ (ہنسکر) دن ہے بلکہ دوپہر ہے!

ماجد۔ زہے نصیب!

خبرم رسیدہ امشب کہ نگار خواہی آمد
سرِ من فدائے راہے کہ سوار خواہی آمد

مرتضیٰ۔ اچھا یہ سب شاعری آپ رہنے دیجئے، کچھ کھانے کا انتظام کیجئے، ہم لوگ سخت بھوکے ہیں۔

ماجد۔ بہت اچھا بہت جلد کھانا آتا ہے، ذرا تم اچکن تو اُتارو، منہ ہاتھ تو دھوؤ، احمد بھائی گھر میں سے فوراً کچھ کھانے کے واسطے لائیے، ٹھہرئیے پان کی ڈبیا پانوں کے واسطے لیتے جائیے (شہاب الدین سے ڈبیا لیکر دیدیا) مرزوا (نوکر) پانی لا۔

مرتضیٰ۔ پانی ناحق منگواتے ہو، کھانا جلدی منگواؤ، ہم لوگ اسی وقت واپس جانیوالے ہیں۔

ماجد۔ (رنگ فق ہوگیا) کیوں خیر تو ہے؟ کیا آج رات کو قیام نہ کرو گے؟

مرتضیٰ۔ نہیں، ناممکن ہے، کسی سے بتا کر نہیں آئے، دل چاہا، اُٹھے چلے آئے۔

ماجد۔ بہت تھک جاؤ گے اور خصوصاً عزیزی شہاب الدین کا تو فشار ہو جائے گا۔

شہاب الدین۔ شاید، لیکن اگر کھانا کچھ دیر اور نہ آیا تو یقینی ہے۔

ماجد۔ ہا، ہا، ہا، بھائی کھانا جلد لاؤ، عزیزی شہاب الدین بہت بھوکے ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد آگے آگے احمد بھائی اور پیچھے پیچھے مرزوا سینی میں کچھ کھانا لئے نظر آئے کھانا آیا، کافی تھا، کیونکہ ماجد کے سسرال میں خبر فوراً پہنچ گئی تھی کہ ماجد کے اکیلے دوست مرتضیٰ آئے ہیں، ساس سالیوں نے جھٹ پٹ کھانا تیار کرلیا اور چائے کا بھی انتظام فوراً ہوگیا سبھوں نے کھانا کھایا، چائے پی، پان لیا، اور مرتضےٰ چلنے کے واسطے تیار ہو گئے، ماجد بیچارہ اُن کے ساتھ بہت رنجیدہ اُٹھا، اور سڑک کی طرف آہستہ آہستہ چلا۔

ماجد۔ بھائی مرتضیٰ! بھلا ایسے آنے سے کیا فائدہ ہوا، میں نہیں کہ سکتا کہ مجھکو خوشی زیادہ ہوئی یا رنج۔

مرتضیٰ۔ یہ سچ ہے مگر میں مجبور ہوں کیا کروں، تم کو دیکھنا منظور تھا، دیکھ لیا، مگر یہ مجھے بھی نہیں معلوم کہ ایسے دیکھنے سے مجھے تسکین زیادہ ہوگی یا پریشانی؟

اسی طرح باتیں کرتے ہوئے اور سسرال کے متعلق مذاق کرتے ہوئے پکی سڑک پہ پہنچ گئے، مرتضیٰ نے ماجد سے بہت زور سے ہاتھ ملایا، اور رخصت ہوئے، پھر شہاب الدین رخصت ہوئے، دونوں بائسکل پر سوار ہو کر چلے، مُڑ مُڑ کر دیکھتے جارہے ہیں اور رومال ہلاتے جارہے ہیں، ماجد بھی سڑک پر کھڑا یاس سے تک رہا ہے، ہر لحہ فاصلہ زیادہ ہوتا جاتا ہے، آخر کار جب سڑک کے ٹیڑھے حصے پر پہنچے تو نظروں سے نہاں ہو گئے اور ماجد خستہ جگر گھر واپس گیا ۔

# باب ۵

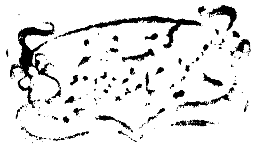
اگر فردوس بر روے زمین است
ہمین است ہمین است ہمین است

جاڑوں کے دن ہیں اور شام کے چار بج رہے ہیں، دارا گنج کی سڑک سے لوگ بکثرت قلعہ کے میدان میں چلے آرہے ہیں، کسی نے یہ خبر اُڑائی ہے کہ آج ہوائی جہاز اُڑیگا، لوگ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے افتاں وخیزاں خیموں کی ڈوریاں پھاندتے ہوئے، نالیوں سے نکلتے ہوئے چلے آرہے ہیں، مدتوں کے بعد اس میدان کے بھی خوب نصیب جاگے، معلوم ہوتا ہے کہ سارے شہر کی رونق کھنچکر یہاں آگئی ہے، چوبیس گھنٹہ میں کسی وقت اس کا جگمگانا کم ہوتا ہی نہیں، باہر کثرت سے خیمے ایستادہ ہیں، ایک طرف قاعدے کے ساتھ ہزاروں بائسکلیں ایک سے ایک عمدہ نظر آتی ہیں، دوسری طرف موٹروں کا جمگٹھ ہے، چوکی پہرہ پھاٹک پر بیٹھا ہوا ہے، ایسی مشین بنا رکھی ہے کہ کیا مجال کوئی شخص بلا ٹکٹ داخل ہو جائے، باہر کا تو یہ حال ہے اندر بہشت نظر آتا ہے، سُرخی کُٹی ہوئی سڑکیں ہیں، گھاس نہایت قاعدے سے اور پھول پتی کے ساتھ لگائی گئی ہے، فیری فاون ٹن کا رنگ برنگ کا پانی عجب بہار دکھلا رہا ہے، کبھی تو کارگاہ کی کھٹ پٹ کی آواز آرہی ہے اور کبھی ٹیڑی کی طرح ہوائی جہاز اور اُس میں ایک آدمی کبوتر سا بیٹھا ہوا اوپر گھر گھر کرتا ہوا دکھائی دے رہا ہے، آگے بڑھئے تو نمایش کے

کمرے شروع ہو جاتے ہیں، ہر چیز کا کمرہ علٰحدہ علٰحدہ ہے، دنیا بھر کی عمدہ چیزیں اُس میں رکھی گئی ہیں، ای آئی آر کے دو انجن بھی آمنے سامنے باہر رکھے ہوئے ہیں، چھوٹی سے لیکر بڑی چیز تک، کوئی چیز ایسی نہیں، جو اچھی سے اچھی اس نمائش میں موجود نہ ہو، ہر قسم کے کھیل تماشے بھی مہیا کئے گئے ہیں، کہیں میری گوراونڈ پر لوگ سوار ہیں تو کہیں جوائے وہیل پر پھسلے پڑتے ہیں، پیسہ چاہیئے، کوئی چیز ضرورت یا تفریح کی ایسی نہیں جو یہاں نہ مل سکے، ان سب چیزوں کو دیکھتے ہوئے بینڈ اسٹینڈ کے قریب پہنچئے تو نگاہ تازہ ہو جاتی ہے، سبز گھاس لگی ہوئی ہے، بے شمار کرسیاں پڑی ہوئی ہیں اور بینڈ بج رہا ہے، بڑی تفریح کا مقام ہے۔ (باقی آئندہ)

---

# کلامِ اعظم



خیر وہ لیگا زمانے میں کیا زمانے کی
نہ ہو امید جسے ہوش میں بھی آنے کی

نہیں ہوں خانۂ بیکس میں ہوں نقشِ مراد
ہوئی ہے لاگ تمھیں کیوں مرے مٹانے کی

قفس کے سامنے جلتا ہے آشیاں اپنا
مگر نہیں ہے اجازت اُسے بجھانے کی

سحر سے شام ہوئی شام سے ہوئی ہے سحر
مجھے امید ہے اب تک کسی کے آنے کی

مجھے دورنگی لیل و نہار نے مارا
ہوائیں دیکھ رہا تھا ابھی زمانے کی

کہوں گا درد و غم اپنا تو حال کیا ہوگا
ابھی تو صرف یہ تمہید ہے فسانے کی

تمھاری یاد مرے دل میں آتی رہتی ہے
مگر تمھیں نہیں فرصت یہاں تک آنے کی

سحر کے ہوتے ہی انوارِ شب ہوئے غائب
رہی نہ شان وہ تاروں میں جگمگانے کی

تمام رات وہ سنتے ہیں جاگ کر اعظم
اب اتنی کرتے ہیں وقعت مرے فسانے کی

اعظم کریوی

# دربار اکبری

---

ہم نے "اکبر" کی اشاعت اول میں عرض کیا تھا کہ "اکبر" کا مقصد کسی خاص قسم یا صنف کے مضامین کی اشاعت نہیں ہے، بلکہ جس طرح لسان العصر اکبر مرحوم حادثات گذشتہ اور واقعات حاضرہ پر آزادی سے اظہار خیال فرمایا کرتے تھے وہی شان رسالہ میں بھی موجود رہنی چاہئے، ہمیں یہ معلوم کر کے حیرت ہے کہ بعض اصحاب رائے "اکبر" کے اجرا کو کسی خاص مصلحت پر مبنی سمجھتے ہیں، ہم اُن کی خدمت میں باادب گذارش کرتے ہیں کہ "اکبر" کا مشرب صلح کل، اس کا کیش تالیف قلوب ہے۔

---

عہد حاضر کی کشمکش سے غریب اُردو کی جان مصیبت میں پھنسی ہوئی ہے، اس کا اندازہ موجودہ رسائل سے بخوبی کیا جا سکتا ہے "اکبر" کا رویہ اس امر اہم میں اعتدال کیساتھ ہے، وہ کسی خاص فرقہ کا مؤید و حامی نہیں ہے۔ ہاں اظہار صداقت میں تامل بھی نہیں، ہم یہ کسی طرح بھی نہیں کہہ سکتے کہ اُردو میں غیر زبانوں کے الفاظ، محاورات کے ترجمے آزادی سے استعمال کئے جائیں، اُردو زبان کی ترکیب عنصری بھاشا، سنسکرت، عربی و فارسی سے ہے، ان کے علاوہ اور بھی چند ایشیائی زبانیں ہیں، اگر اُردو کے خزانے میں کسی چیز کی کمی ہو تو ہمیں سب سے پہلے انھیں زبانوں میں تلاش کرنا چاہئے، بدرجۂ مجبوری اجنبی زبانوں سے استفادہ میں بھی کوئی حرج نہیں۔

---

معنوی حیثیت سے بھی یہی طریقۂ کار اختیار کرنا انسب ہے، اُردو طرز تحریر کو مغربی قالب میں [illegible] اُردو میں مختلف متحد الاصل زبانوں کے اجتماع سے

جوہر دلعزیز شیرینی پیدا ہو گئی ہے وہ مغربی زبانوں کی تقلید و اتباع سے لاکھ برس میں بھی نہیں حاصل ہو سکتی، ہمارے نوجوانوں کو کالج کی چہار دیواری سے نکلتے ہی اُردو کی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے وہ بیچارے سمجھتے ہیں کہ اُردو محض ایک سطحی زبان ہے، جس قدر جلد ممکن ہو اس انگریزی اور فرنچ کے "جواہر ریزوں" سے مالا مال کر دینا چاہئے، ان کی تمام عمر اسی کوشش میں صرف ہوتی ہے اور اگر یہی کاوش چلی گئی تو انشاء اللہ تھوڑے ہی دنوں میں اُردو کی ایشیائی ملاحت مغربی صباحت پر قربان ہو جائے گی۔

---

بعض حضرات کا خیال ہے کہ جب "اکبر" لسان العصر مرحوم کی یادگار میں جاری کیا گیا ہے تو اس میں چند صفحات سنجیدہ ظرافت کے لئے بھی وقف ہونے چاہئیں، اس میں کلام نہیں کہ یہ خیال بہت خوب اور خواص و عوام کی دلچسپی کا باعث ہے، مگر افسوس ہے کہ اس رنگ کے لکھنے والے اُردو میں بہت کم ہیں اور جو ہیں بھی وہ کسی خاص اخبار یا رسالہ سے متعلق ہیں، ایسی صورت میں اس نئی صنف کا اضافہ چند در چند مشکلات کا سبب ہوگا، بہرحال ہم اپنے اوپر اس کی پابندی نہیں چاہتے، ہاں جو حضرات اس قسم کے مضامین ارسال فرمائیں گے شکریہ کے ساتھ درج کئے جائیں گے، اسی سلسلہ میں یہ عرض کرنا بھی مناسب ہے کہ ہر مہینہ لسان العصر مرحوم کے اشعار خواہ مطبوعہ ہوں یا غیر مطبوعہ شایع کئے جائیں، یا محض خطوط ہی پر اکتفا کی جائے، امید ہے کہ ناظرین اپنی اپنی رایوں سے مطلع فرمائیں گے، مطبوعہ اشعار کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ اگرچہ ان کی اشاعت سے قند مکرر کا لطف آ سکتا ہے مگر دوسری طرف تحصیل حاصل بھی بے سود ہے۔

---

جنوری نمبر میں طالب صاحب کو "سودی اور بحریں" میں ایک غلط فہمی ہوئی ہے ؎

یہ اصرار کرتے ہیں بھائی حسن　　کہ میں بھی ہوں اس بحر میں غوطہ زن

حسن سے خواجہ حسن نظامی مراد نہیں ہیں بلکہ لسان العصر مرحوم کے چھوٹے بھائی سید اکبر حسن مرحوم کے فرمایش سے یہ نظم لکھی گئی تھی

تصحیح

---

# سالومی

حضرت مجنوں گورکھپوری نے آسکر وائلڈ کے مشہور ڈرامہ سالومی کا اردو ترجمہ کرکے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ آسکر وائلڈ جس مرتبہ کا لکھنے والا تھا وہ کسی سے مخفی نہیں لیکن سالومی جس رتبہ کا ڈرامہ ہے اسکے متعلق صرف اتنا کہدینا کافی ہے کہ جب یہ شائع ہوا تو برلن میں مسلسل ۲۰۰ راتوں تک کھیلا گیا اور لوگوں کا شوق بدستور قائم رہا۔ سالومی کے ترجمے جرمن۔ انگریزی۔ اطالوی۔ اسپینی۔ روسی۔ پولی۔ ترک۔ ڈچ اور یورپ کی دیگر زبانوں میں ہو چکے ہیں اردو میں اس کو حضرت مجنوں نے پورا کرکے حقیقتاً زبان پر احسان کیا ہے۔

**حضرت نیاز فتحپوری** فرماتے ہیں "میں نے ترجمہ دیکھا اور میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس حدتک سلیس ہے جس حدتک اُسے ہونا چاہیئے۔ کوشش کی گئی ہے کہ آسکر وائلڈ کا زور بیان ترجمہ میں بھی ظاہر ہو جائے اور اس میں حضرت مجنوں کو بڑی کامیابی ہوئی ہے"

سائز $\frac{20\times30}{16}$ لکھائی چھپائی نفیس۔ ضخامت معقول۔ باوجود ان تمام خوبیوں کے قیمت علاوہ محصول ڈاک ۱۲؍

**ملنے کا پتہ۔ منیجر اسٹار الکٹرک پرنٹنگ ورکس۔ الہ آباد**

---

# رسالہ شناخت جعلی نوٹ

اگر آپ ایک نظر میں جعلی نوٹ کو پہچاننا چاہتے ہیں۔ اور جعلی نوٹ بنانے و چلانے والوں کی گرفتاری کا شوق ہے تو سید علی حسن صاحب بی۔ اے (علیگ) ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی الہ آباد کا تصنیف کردہ رسالہ ضرور منگائیے۔ یہ رسالہ سوداگران و اسٹیشن ماسٹران کے لئے بھی بے حد مفید و کارآمد ہے۔ قیمت علاوہ محصولڈاک چار آنہ (۴؍)

**ملنے کا پتہ**

**منیجر اسٹار الکٹرک پرنٹنگ ورکس الہ آباد**

# LECTURES ON DETECTIVE TRAINING

سید علی حسن صاحب بی۔ اے (علیگ) ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ محکمہ سی۔ آئی۔ ڈی الہ آباد نے اس کتاب کو بزبان انگریزی تصنیف فرمایا ہے۔ یہ کتاب افسران پولیس و وکالت پیشہ اصحاب مجسٹریٹ و جج صاحبان کے واسطے بالخصوص نہایت مفید و کارآمد ہے۔ قابل ترین و معزز اصحاب اس کتاب کے مفید ہونے کے متعلق اپنی رائے کا اظہار فرما چکے ہیں۔ تفتیش مقدمات و شناخت جعلی نوٹ و جعلسازی و شناخت نشان انگشت و شناخت خط وغیرہ کے طریقے بہترین صورت میں بتلائے گئے ہیں۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے یہ پہلی کتاب ہے تصاویر و طباعت نہایت دلکش و کاغذ نفیس ہے قیمت مجلد علاوہ محصولڈاک عـــہ؍

مصنف سے طلب فرمائیے

## رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور

یہ رسالہ ۱۲ سال سے متواتر اور باقاعدہ شان و شوکت کے ساتھ جاری ہے یہ رسالہ محکمہ تعلیم کی خدمت مدرسین ٹرینڈ و ان ٹرینڈ کی خیر خواہی اور طالبعلموں کی حقیقی دوستی کا دعویدار ہے اس رسالہ میں ہر قسم کے اخلاقی علمی۔ تواریخی۔ طبی۔ ریاضی اور سائنٹفک مضامین شائع ہوتے ہیں گویا یہ رسالہ سرشتہ تعلیمات ہند خصوصاً مدرسین و طلبہ کا ایک حقیقی و اعلیٰ درجہ کا وکیل ہے رہنمائے تعلیم کے ایڈیٹر صاحبان قابل گریجویٹ اور فاضل ٹرینڈ اصحاب ہیں رہنمائے تعلیم کے نامہ نگار بڑے بڑے قابل و مشہور تجربہ کار افسران معاینہ کنندگان اور ہیڈ ماسٹر صاحبان ہیں جنکے نادر و اچھوتے مضامین ناظرین رسالہ کی ضیافت طبع کا باعث ہوتے ہیں اگر کوئی رسالہ تعلیم و فن تعلیم کا ٹھوس کام کر رہا ہے یا سچے معنوں میں تعلیم کا خادم ہونے کا دم بھر سکتا ہے تو وہ رہنمائے تعلیم اور صرف رہنمائے تعلیم ہی ہے رہنمائے تعلیم کے اندر **گلدستہ اطفال** نامی ایک حصہ ہے جو چھوٹے بچوں اور بچیوں کی قابلیت و استعداد بڑھانے کا شاندار ذریعہ ہے اس حصہ کی لکھائی بھی بچوں کے پڑھنے کیلئے خاص ہوتی ہے اسمیں دلچسپ کہانیاں اور مزیدار لطیفے اور حل طلب انعامی معمے جات بھی درج ہوتے ہیں جو بچہ گلدستہ اطفال کو ایک بار دیکھ پاتا ہے وہ اسیر الفت ہو جاتا ہے ایک شاعر نے خوب کہا ہے سہ لٹ رہے ہیں جواہرات کے ڈھیر + اب بھی شائق نہ لیں تو ہے اندھیر۔ اس رسالہ کی صورت دیدہ زیب مضامین مفید و کارآمد کتابت و کاغذ دلکش ہے

**نوٹ**۔ ہر سال اس رسالہ کے دو چار سپیشل نمبر بھی شائع کیے جاتے ہیں جنکا حجم دو دو سو صفحے تک جا پہنچتا ہے ماہانہ حجم سوا سو صفحہ باوجود ان جملہ خوبیوں کے سالانہ قیمت صرف للعہ پیشگی فوراً اپنے نام جاری کرا کر مشکور کریں نمونہ ۲ ر کے ٹکٹ آنے پر مل سکتا ہے پتہ **ماسٹر جگت سنگھ** پروپرائٹر **رسالہ رہنمائے تعلیم رام گلی نمبر ۵ لاہور**

---

## اردو کا ماہانہ رسالہ شمع۔ آگرہ

جنوری سنہ ۱۹۲۵ء سے شمع نہایت آب و تاب سے شائع ہو رہا ہے لکھائی چھپائی۔ کاغذ غرض ہر لحاظ سے اپنی آپ نظیر ہے۔ ہر مضمون مہذب محرک خیال اور معلومات جدیدہ کا بہترین نمونہ ہوتا ہے ادبی تاریخی سیاسی۔ اقتصادی ادبی مضامین شائع ہوتے ہیں اسکے مقاصد علمی و ادبی ہیں۔ لائق مدیران شمع مسٹر محمد حبیب (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا۔ پروفیسر تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ و مسٹر حسن عابد جعفری (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا۔ آگرہ ہیں یہ حضرات بہترین تعلیمیافتہ ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجہ کے نقاد و ادیب ہیں اور فن اخبار نویسی سے واقف ہیں اور محض ادبی و علمی خدمت کے آرزو میں رسالہ کی ترتیب میں مصروف ہیں انکو کوئی ذاتی فائدہ شامل نہیں ورنہ کسی تجارتی اصول پر اسکو پیش کرنا چاہتے ہیں ہر ماہ میں پابندی وقت سے شائع ہوتا ہے تصاویر بھی شائع ہوتی رہتی ہیں حجم ۱۰۰ صفحہ قیمت سالانہ للعہ نمونہ کا پرچہ ۱۱ر

**المشتہر منیجر رسالہ شمع۔ حسن منزل شاہگنج آگرہ**

---

## دلکش

دار السلطنت پنجاب لاہور سے نہایت آب و تاب سے ماہواری شائع ہوتا ہے جو کہ ادبی دلفریبیوں اور رنگینیوں کا مخزن تھکے دماغوں کیلئے تفریحی علاج رنگین مزاجوں کیلئے ظرافت کا چشمہ تشنگان محبت کیلئے خضر راہ شاعری کے وجد آفریں انتخابات کا مجموعہ دلچسپ معلومات کا ذخیرہ ہے سائز ۲۰×۲۶ لکھائی چھپائی نفیس ضخامت معقول باوجود ان تمام خوبیوں کے سالانہ قیمت معہ محصولڈاک قسم اول تین روپیہ قسم دوم دو روپیہ فی پرچہ قسم اول ۵ دوم ۳ر

**ملنے کا پتہ منیجر رسالہ دلکش لاہور**

---

## مت کہو

کہ گلکروں کا کوئی مجرب علاج نہیں یہ مانا کہ آپکا پیچھے کا شک اور اپریشن کرا کر تنگ آچکے ہیں جہاں آپنے اسقدر تکلیف اٹھائی ہے وہاں صرف ایک بار

---

## رامی سرمہ

مصدقہ سر۔ ڈاکٹر جے۔ سی۔ بوس لابریری کلکتہ کا استعمال کریں گکروں سے ہمیشہ کیلئے نجات ملجاویگی لگانے میں نہ تکلیف اور نہ درد ہو گا آپ حیران جائینگے۔ کہ دیسی ادویات کا عنصر برباد نہیں ہوا۔ اب ڈاکٹر لوگ بیماروں کو اسی کے استعمال کا مشورہ دیتے ہیں۔ قیمت فی ڈبیہ ایک روپیہ چار آنہ

[illegible] رامی سرمہ [illegible] رام [illegible] ڈیرہ اسمٰعیل خان

# بادامی چمبیلی

یہ بازاری تیل نہیں ہے بلکہ طبی اصول سے کارخانہ ہذا کی خاص نگرانی میں چمبیلی کے پھولوں میں بجائے تلی کے بادام بسا کر تیار کرایا جاتا ہے۔ جو نہایت ہی خوشبودار ہے۔ اس کے استعمال سے دردِ سر۔ چکر کا آنا۔ دماغ کی کمزوری۔ خشکی دماغ۔ نزلہ۔ مقوی حافظہ۔ بینائی کو قوت دیتا ہے یہ روغن مخصوص طالب علم وصاحبان وکلاء۔ بیرسٹران ومختاران اور دماغی کام کرنے والوں کے لئے ازبس مفید ہے اور بالوں کو گرنے سے روکتا و ملائم و خوشنما بناتا ہے اور اکثر مستورات کہ جنکو عارضہ سیمبل بائی کا رہتا ہے اس تیل کے روزانہ استعمال کرنے سے بہت ہی فائدہ پہونچاتا ہے۔

قیمت فی شیشی جس میں ڈھا اونس تیل ہے بارہ آنہ۔ محصول پارسل ایک شیشی پر نو آنہ۔

# مہک پری ہیر آیل

رجسٹری کیا ہوا نمبر ۱۱۰۱

یہ تیل اتنا خوشبودار ہے کہ اس کو سر میں لگاتے ہی پاس کے بیٹھنے والے فریفتہ ہو جاتے ہیں یہ دردِ سر و دردِ نیم سر ضعف دماغ کے لئے بیحد مفید ہے طالب علم اور دماغی کام کرنے والوں کے لئے اکسیر ہے۔ بقدر تین ماشہ یا حسب ضرورت ہر روز استعمال کرنا چاہئے۔ قیمت فی شیشی ایک روپیہ۔ محصول ڈاک نو آنہ۔

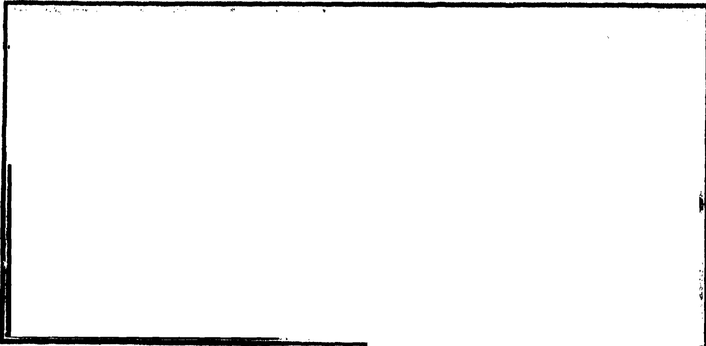
# پدمنی ہیر آیل

رجسٹری کیا ہوا نمبر ۱۱۰۱

یہ نہایت خوشبودار تیل ہے اُس کی بھینی بھینی خوشبو سے دماغ معطر ہو جاتا ہے۔ یہ دردِ سر و دردِ نیم سر ضعف دماغ و طالب علم اور دماغی کام کرنے والوں کے لئے بیحد مفید ہے یہ بالوں کو مثل ریشم کے سیاہ و چمکدار کر دیتا ہے بقدر تین ماشہ یا حسب ضرورت ہر روز استعمال کرنا چاہئے۔ فی شیشی ایک روپیہ محصول ڈاک نو آنہ

**دواخانہ۔ حکیم رام کشن لعل رامچندر لعل مالکان یونانی میڈیکل ہال رانی منڈی الہ آباد**

رجسٹرڈ نمبر اے - ۱۵۲۶

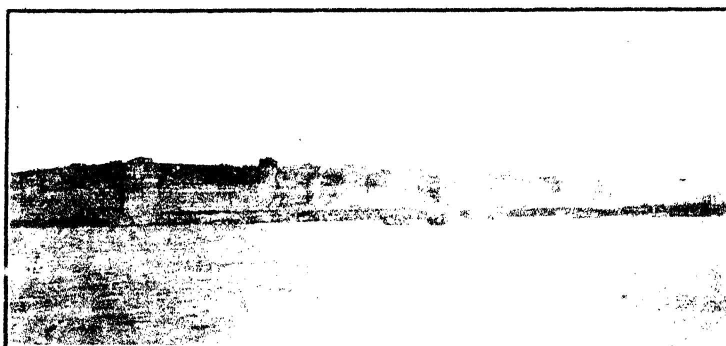


# اکبر

یادگار لسان العصر حضرت اکبر مرحوم الہ آبادی

رجسٹرڈ نمبر اے-۱۵۲۶

انجمن ارباب الادب الہ آباد کا ماہوار رسالہ



# اکبر

بیادگار لسان العصر حضرت اکبر مرحوم الہ آبادی

# شربتِ اکسیر

**اگر آپ اشتہاری دواؤں سے بدگمان ہوگئے ہوں تو ایک روپیہ اور بھی خرچ کرکے ہمارے کارخانہ کا شربتِ اکسیر استعمال کرکے قدرتِ خدا کا تماشہ دیکھیں**

سنئے جناب! یہ شربت اکسیر جسکا اشتہار آپکے زیر نظر ہے اسکا نسخہ مجھے ایک امریکن ڈاکٹر سے ملا ہے اور شربت اکسیر کا اشتہار دینے کے قبل صدہا مریضوں پر تجربے کرکے کامل اطمینان ہوگیا تو اب یہ اشتہار آپ پبلک کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اگر میری تحریر کو لغو نہ سمجھیں تو ایک شیشی شربت اکسیر منگا کر استعمال فرما دیں۔ میری تحریر کی صداقت آپ کو فوراً ہو جاویگی۔ مندرجہ ذیل امراض کیلئے شربت اکسیر واقعی اکسیر ثابت ہوا ہے۔ جریان نامردی اور ضعف باہ کا بہترین ہے۔ کیسا ہی پرانا کیوں نہ ہو شربت اکسیر کے استعمال سے جڑ سے جاتا رہتا ہے۔ جسم میں کمزوری پیشاب کے قبل یا بعد سفید سفید دھات کا گرنا۔ منی کا پتلا ہوجانا۔ احتلام کا ہونا۔ نطفہ کا نہ ٹھہرنا اور درد سر کا برابر رہنا سستی کاہلی اور چہرہ پر بالکل بے خون کا بدن میں نہ پیدا ہونا ان سب مہلک امراض کیلئے شربت اکسیر نہایت مفید ثابت ہوا ہے۔ مقوی دل و دماغ تو ایسا ہے کہ شاید ہی اس کے مقابلہ کی کوئی دوسری دوا ہو۔ ہاضمہ اس قدر ہے کہ آپ ایک ہفتہ کے بعد دونی غذا نوش کرنے لگیں گے ہر موسم میں یکساں مفید ہے۔ عورتوں کیلئے بھی بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ کیا ایک شیشی ارسال خدمت کیجائے

قیمت فی شیشی ایک روپیہ محصول علاوہ۔

---

## سندری سنو کے استعمال سے چھ سال کی بدنما چھائیں وغیرہ دور ہوگئیں!

مسز محمد عالم بٹ بی اے اسسٹنٹ انجینیر بہاولپور اسٹیٹ تحریر فرماتی ہیں کہ سندری سنو کے استعمال سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔ واقعی عورتوں کا کھویا ہوا حسن اس کے استعمال سے دوبارہ حاصل ہوتا ہے۔ میں آپکو اس ایجاد پر مبارکباد عرض کرتی ہوں۔

مجھے عرصہ چھ سال سے چھائیاں پڑی ہوئی تھیں بہت سی اشتہاری چیزیں مثلاً پرکیمال صابون حسن یوسف استعمال کی تھیں مگر کچھ فائدہ نہ ہوا اس کے استعمال سے بہت فائدہ ہوا۔ فی الحال تین شیشی سندری سنو اور بھیجہ دیجئے۔ میں آپ کی دوبارہ شکریہ ادا کرتی ہوں۔

کیا آپ کو اس شہادت کو پڑھ کر بھی سندری سنو کے منگانے میں تامل ہے کیا ایک شیشی ارسال خدمت کیجائے؟




**استعمال کرو** یہ خوشبودار جوہر ہاتھ اور منہ دھونیکے بعد چہرہ وغیرہ پر ملتے ہی جلد میں جذب ہو جاتا ہے اور رنگت کو نکھار دیتا ہے۔ چہرے کے گڑھے اور رخساروں کو بھرتا ہے۔ نہاسے چھیپ چھائیاں داغ دھبہ پھنسی کو دفع کرتا ہے۔ عورت و مرد دونوں کیلئے یکساں مفید ہے۔ قیمت فی پاکٹ ۱۲/

---

**ملنے کا پتہ ایس۔ بی بخشی اینڈ کمپنی موجد شربت اکسیر کوٹھی نمبر ۱۱/۱۴ ... اسٹریٹ ... کلکتہ**

اکبر



HAZRAT NOOH NARVI.

The Imperial Press, Allahabad.

مُدیر
تسلیم الدین شرقی-بی-اے
معاونین مدیر
حسین احمد کشفی بی-اے-سید طالب علی طالب الہ آبادی-اسرار احمد (فاضل ادب ودینیات)
چودھری سید افضال احمد (فاضل ادب)

| نمبر ۴ | رسالہ اکبر بابت اپریل ۱۹۲۶ء | جلد ۳ |
|---|---|---|


| نمبر شمار | مضمون | مضمون نگار | صفحہ |
|---|---|---|---|
| ۱ | مکتوب اکبر | بنام سید عشرت حسین صاحب ڈپٹی کلکٹر | ۲ |
| ۲ | ارتقاء | مشتاق احمد صاحب الہ آباد یونیورسٹی | ۴ |
| ۳ | منصوری (غزل) | سید ماجد علی صاحب ماجد بی-اے-ایل ایل بی | ۹ |
| ۴ | سورت کا قہوہ خانہ | جناب سعیدی بی-اے-(علیگ) | ۱۰ |
| ۵ | رباعی | سید محمد جعفر صاحب قدسی جائسی | ۱۷ |
| ۶ | سُنبل | پروفیسر محمد نعیم الرحمٰن صاحب ایم-اے | ۱۸ |
| ۷ | غپ شپ | غنی صاحب | ۲۵ |
| ۸ | خان بہادر | ڈاکٹر اعظم صاحب کُریوی | ۲۹ |
| ۹ | جذبات محمود | محمود علی خانصاحب عرف آغا علی خاں صاحب رئیس الہ آباد | ۳۲ |
| ۱۰ | حضرت نوح ناروی | مدیر | ۳۳ |
| ۱۱ | دمشق | اسرار احمد صاحب معاون مدیر | ۴۵ |
| ۱۲ | غزل | جناب ریاض صاحب الہ آبادی | ۵۳ |
| ۱۳ | اکبر الہ آبادی و شاد عظیم آبادی | افضال احمد صاحب معاون مدیر | ۵۴ |
| ۱۴ | روحانیات | وحید الدین صاحب سلیم پانی پتی | ۶۱ |
| ۱۵ | واردات قلب | حامد اللہ صاحب افسر بی-اے | ۶۳ |
| ۱۶ | دربار اکبری | مدیر | ۶۴ |

# مکتوبِ اکبر



مرزاپور - ۱۸ ؍ جولائی سنہ ۱۹۰۰ء

پیارے عشرتی تندرست رہو۔ خوش رہو۔ صاحبِ اقبال ہو خدا تمھارے حافظے کو قوی کرے ذہن کو تیز کرے سمجھ کو وسیع کرے تحصیل علم تم پر آسان ہو۔ علوم مفیدہ حاصل ہوں صراط مستقیم پر قائم رہو کامیابی کے ساتھ وطن پہونچو۔ تم نے اپنی ماں کو عربی کا شعر خوب منتخب کرکے لکھا ہے سب لوگ پھڑک گئے واہ جناب مولوی صاحب۔ تمھاری ماں تمھارے خط سے بہت خوش ہوئیں۔

میں بھی لا (law) پس کو ترجیح دیتا ہوں۔ قانون وہ چیز ہے جس کی پابندی سب پر ہے اُس سے قوموں کی تہذیب اور معاشرت کا اندازہ ہوتا ہے وہ ایک مستحکم اور منضبط چیز ہے۔ ہسٹری زیادہ تر اشخاص خاص کا بیان ہے سلطنت یا سلاطین کے نسبت رائے زنی کی جاتی ہے۔ قانون جاننے والا بہ نسبت ہسٹری داں کے زیادہ مفید ہوتا ہے۔ ہمارے لئے زیادہ مناسب ہے۔ رہا فلسفہ۔ بوڑھا آدمی اگر کودن نہ ہو اور غور کرنے کا خوگر ہو خود بخود فلسفی ہو جاتا ہے۔ اور یوں تو ہر علم بجائے خود عمدہ اور بہتر ہے۔

میں تمھاری اس عالی ہمتی سے خوش ہوا کہ تم نے آنرز حاصل کرنے کی کوشش کا ارادہ کیا ہے مقصود تو یہ ہے کہ تین برس وہاں رہکر بہ نسبت یہاں کے انگریزی زیادہ درست ہوگی انگریزی عملداری میں روٹی کمانے اور بھلے آدمیوں کی طرح زندگی بسر کرنے کے مواقع زیادہ ہو جائیں گے۔ صحت میں ترقی ہوگی پس اس کے ساتھ اگر اور کچھ بھی ہو جائے تو خدا کا شکر۔ تم کہتے ہو کہ کچھ ہرج نہ سمجھئے تو ہندوستانی پوشاک بھیجدیجئے۔ میں کیا فیصلہ کر سکتا ہوں جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ کیا ضرورت واقع ہوئی اور کس نے صلاح دی ہے۔ یہاں تو سب نے یہی کہا کہ یہ کپڑے بیکار ہیں عمامہ تک نہ لینے دیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مبالغہ تھا اور تم وہاں اوقاتِ مناسب پر ہندوستانی شریفانہ کپڑوں کا استعمال کر سکتے ہو۔ میں نے کبھی کبھی سُنا ہے کہ ان کپڑوں سے وہاں کی سوسائٹی میں زیادہ عزت ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ لڑکا عمدہ اور شریف ہندوستانی گھر کا ہے۔ دربار میں تو بغیر ان کپڑوں کے بار نہیں ہے۔ لیکن ابھی تو شاید تم کو دربار میں جانے کا نہ خیال ہوگا

نہ موقع بیضرورت - ایسی ضرورت ہوگی تو عمدہ اور مناسب پوشاک تیار کرا کے بھیج دونگا - اگر تم نے یہ سمجھا ہو کہ ہر گاہ ہم اپنے عمدہ ہندوستانی لباس کو استعمال کرسکتے ہیں تو کیا فائدہ ہے کہ بہ صرف کثیر انگریزی جوڑے بنوائیں - اور زید کی روح لیکر نامی نظر آئیں تو اس خیال کا کیا پوچھنا - ایک بات مثالاً کہتا ہوں با معنی لطیفہ سمجھو ایک شمع نے پوچھا کچھ ہرج ہے اگر میں شعلے کا تاج پہن لوں جواب ملا کہ ہرج کیا ہے آپ کا سراپا چمک اُٹھیگا لیکن پروانے گھیر لینگے تم اس زریں لباس میں چمکو گے - نگاہیں پڑینگی - انڈین نواب سمجھے جاؤگے اس نزاکت کو سنبھالنا ہوگا -

بہرکیف تم عقلمند اور صاحب سلیقہ ہو سمجھ بوجھ کر ہر کام کروگے تمھاری زرد اچکن اور سیاہ شیروانی اور زری کی ٹوپی اور بیلدار ٹوپی جس میں مخمل بدلوا کر بیل اُلٹ دی گئی ہے - بذریعہ پارسل کے بھیجتا ہوں - نئی بیل آگرہ سے منگوائی ہے وہ آجائے تو ہفتے دو ہفتے میں ایک اور ٹوپی آسمانی مخمل کی بنوا کر بھیج دونگا - غالباً تم نے یونیفارم جو اودھ کے نواب زادے پہننے تھے طلب نہیں کیا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ تم کو بہت ہی تنگ ہوتی تھی - اگر ضرورت ہو تو اُس قسم کا نیا جوڑا بنوایا جائے لیکن پیمانہ ٹھیک ملنا چاہئے - زرد اچکن جو جاتی ہے بہت ہی شوخ رنگ ہے - سمجھ لیجئے کہیں تھیٹر کا لباس نہ ہو جائے - میں نے مختصر ریمارکس کر دئے - یہ اطمینان ہے کہ اگرچہ تم عمر میں کم ہو لیکن نیچرل طور پر سنجیدہ اور عالی خیال ہو اگر وہاں کی سوسائٹی پسند کرے تو میں خوش ہوں کہ تم نوشاہ میاں بنے رہو چشم ما روشن دل ماشاد .........

چونکہ فرصت کم ہے لہذا ختم کرتا ہوں - ہاشم خیریت سے ہے - حسن کا حال بدستور ہے - بارش ہو رہی ہے -

اکبر حسین

# "گاندھی نامہ"

ہم اس مہینہ سے اکبر مرحوم کے غیر مطبوعہ کلام کا سلسلہ شروع کرتے ہیں، اسکے کچھ اشعار "آئینہ" کا جوہر بن چکے تھے - مگر ہم اُن کو اسلئے جدا نہیں کرتے ہیں کہ اصلی گلدستہ میں کمی محسوس ہوگی اور ربط سلسلہ کا لطف جاتا رہیگا -

بھائی گاندھی کا وسیلہ چاہئے　　ہضم کابل کا بھی حیلہ چاہئے

وہ شیخ کی شیخی رہ نہ گئی اسلام کو بت کا رام کیا　　سرکار خفا کیوں ہوتے ہیں گاندھی نے چوکھا کام کیا

ٹھاکر کی زبردستی نہ رہی دہقان کی وہ مستی نہ رہی　　سرکار کی بھی مرضی تھی یہی گاندھی نے علاقہ خام کیا

اگرچہ شیخ و برہمن اسوقت خلاف اُنکے اُبل رہے ہیں ✦ نگاہ تحقیق سے جو دیکھو تو اُنکے سانچے میں ڈھل رہے ہیں

نہ مولانا ہیں لغزش میں نہ سازش کی ہے گاندھی نے ✦ چلایا ایک رخ اُنکو فقط یورپ کی آندھی نے

اکبر

# ارتقاء

مسئلہ ارتقاء عموماً ڈارون کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے اور عوام کا خیال ہے کہ ڈاروِن ہی اس اصول کا موجد ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ سب سے پہلے جس نے اس مسئلہ کو تسلیم کیا وہ علم حیات کا بانی ارسطو تھا۔ اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ ارسطو نے اس مسئلہ کو اس کی موجودہ صورت میں سمجھ لیا تھا۔ نہیں نہ یہ واقعہ ہے اور نہ ایسا ممکن تھا۔ ارسطو اس سائنس کا پہلا عالم تھا۔ اس کے پاس معلومات کے وہ خزانہ کہاں سے آتے جو اہل علم نے دو ہزار برس میں اپنی پوری پوری زندگیاں وقف کر کے جمع کئے۔ لیکن جب اس نے روئے زمین کے حیوانات اور نباتات کا پہلے پہل جائزہ لیا اور کل جانوروں کو جنس اور نوع میں تقسیم کر کے علم حیات کی ابتداء کی اس وقت مسئلہ ارتقاء اس کے پیش نظر تھا۔ ارسطو کے نزدیک ارتقاء امر واقعی نہ تھا لیکن اس کے منطقی وجود کو وہ تسلیم کر چکا تھا۔ اس کے نزدیک جنس اور نوع لازوال چیزیں تھیں اور ایک نوع حیوانات کا دوسرے پر ترجیح دینا بھی خیالی امر تھا۔ لیکن اس کی منطقی ضرورت کو وہ مانتا تھا۔ سچ پوچھو تو بغیر اس اصول کو تسلیم کئے ہوئے علم وحیات کو ایک سائنس بنانا ناممکن تھا۔

مسئلہ ارتقا کو موجودہ صورت میں پیش کرنے والا پہلا شخص فرانسیسی عالم لمارک (Lamarck) تھا اس نے ۱۸۰۹ء میں اپنے خیالات کا اظہار اپنی کتاب فلاسوفی زولاجک (Philosophie Zoologique) (یعنی علم حیوانات) میں کیا۔ اس کتاب میں اس نے ان باتوں کو حل کرنے کی کوشش کی جن کے ذریعہ سے ارتقاء کا واقعہ ظہور ہوا۔ اس کی رائے تھی کہ نئے اعضاء کا ارتقاء حالات زندگی بدل جانے سے ہوتا ہے۔ حالات بدل جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نئے اعضاء کی ضرورت پیش آتی ہے اور پرانے بیکار ہو جاتے ہیں اس سے اعضاء پیدا ہوتے ہیں اور پرانوں میں تبدیلیاں ہوتی ہیں جس سے وہ نئی طرز زندگی میں کام دینے کی اہلیت پیدا کر لیتے ہیں اس کے نزدیک اعضاء کا بیکار رکھنا یا استعمال کرنا بہت بڑا اثر رکھتا ہے۔ جو اعضاء کام میں رکھے جاتے ہیں وہ نئی نئی خوبیاں پیدا کر لیتے ہیں۔ جو بیکار چھوڑ دئے جاتے ہیں وہ ناقص اور ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ جو باتیں اس طرح پیدا ہوتی ہیں وہ نسل میں قائم رہتی ہیں۔ یہ موجودہ مسئلہ ارتقاء کے بیان کرنے کی پہلے قابل توجہ کوشش تھی لیکن دنیا نے اسے نہیں مانا اور وہم و خیال سمجھ کر ٹال دیا۔

پچاس برس بعد ۱۸۵۸ء میں چارلس ڈاروِن (Charles Darwin) اور اس کے ساتھ ہی ساتھ الفرڈ رسل ویلیس (Alfred Russel Wallace) نے ارتقاء کی تفصیل میں نہایت مدلّل مضامین لکھے۔ دوسرے ہی سال ڈاروِن کی مشہور کتاب دی آریجن آف اسپیشیز (The Origin of Species) نکلی اس کتاب نے مسئلہ ارتقا ساری دنیائے سائنس سے تسلیم کرالیا اور ہر انصاف پسند نے لاجواب ہوکر سر جھکا لیا۔ لیکن قدامت پسند اصحاب نے آج تک نہ مانا اور نہ مانیں گے۔ ان کو خطاب کرکے ڈاروِن کی روح بزبان غالبؔ اتنا کہہ کر خاموش ہوتی ہے:۔

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات　　　دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

مسئلہ ارتقاء کے سمجھنے اور بیان کرنے میں اکثر لوگوں کو جو علم حیات کے طالبعلم نہیں ہیں دقّت ہوتی ہے۔ ارتقاء کی سب سے آسان مختصر اور عمدہ تعریف دو لفظوں میں کی گئی ہے جو "باقاعدہ تدریجی تبدیلی" کے معنی رکھتے ہیں۔ پیروانِ فلسفہ ارتقا کا عقیدہ ہے کہ ہماری دنیا اور اس کی تمام بے جان اور جاندار چیزیں ازل سے دھیرے دھیرے قاعدوں کے مطابق تبدیلیوں سے اپنی موجودہ حالت پر پہونچی ہیں۔ یہ تبدیلیاں ختم نہیں ہوگئیں بلکہ ہر روز اور ہر وقت ہمارے گردو پیش ہو رہی ہیں۔ بقول شاعر

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں　　　ہو رہیگا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

ارتقاء کا عالم مسئلہ کن فیکون پر محققانہ نظر ڈالتا ہے۔ اس کے الفاظ کو ایمان نہیں بنا لیتا بلکہ آزاد خیالی سے کام لے کر اس کے حقیقی معنوں پر پہونچنے کی کوشش کرتا ہے اس کا خیال ہے کہ دنیا کے دریا۔ پہاڑ۔ حیوانات اور نباتات ایکبارگی پیدا نہیں کردئے گئے بلکہ ایک بے شکل مادہ سے رفتہ رفتہ ترقی کرکے اس حالت تک پہونچے ہیں۔ خود انسان بنا بنایا آسمان سے نہیں اُترا بلکہ جاندار مادہ (Protoplasm) کے بنے ہوئے ایک اتنے چھوٹے عضو یا کیڑے سے جو صرف خوردبین سے نظر آسکتا ہے اور جسے انگریزی میں سل (Cell) کہتے ہیں۔ ترقی کرکے اس معراج پر پہونچا ہے۔ انسانیت کے درجہ پر پہونچنے کے لئے اسے جانوروں کے درجہ سے گذرنا پڑا۔ انسان کی ترقی رُک نہیں گئی ہر روز بدل رہا ہے۔ کچھ دنوں میں کہیں سے کہیں جا پہونچے گا۔ بقول اکبرؔ

محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

یہ تبدیلیاں ٹھیک کس طرح ہوئیں۔ ارتقا کیوں ظہور میں آیا۔ ایک صورت تبدیل ہوکر دوسری صورت

کیسے بن گئی۔ ایک خوردبین سے نظر آنے والے کیڑے سے یہ قسم قسم کے جانور اور اشرف المخلوقات کیسے پیدا ہو سکے۔ ان سوالات کے جواب میں علماء میں اختلاف ہے۔ لمارک کے خیالات پہلے پیش کئے جا چکے ہیں۔ ڈارون کے خیالات کا خلاصہ یہ ہے:۔

انفرادی حیثیت سے کوئی دو درخت یا جانور ایک سے نہیں ہوتے۔ ذرا سی تبدیلی ایک جاندار کو حالات زندگی کا مقابلہ کرنے کے لئے دوسرے سے بہتر بنا سکتی ہے۔ زندگی کے سخت مقابلہ میں صرف وہی ٹھہر سکتے ہیں جن میں مقابلہ کرنے کی بہترین قابلیت موجود ہو۔ جو جاندار مقابلہ کرنے کی قابلیت نہیں رکھتے انھیں دوسرے نیست و نابود کر دیتے ہیں زندہ رہنے والے جانداروں میں جو تبدیلیاں اسے زندگی میں مدد دیتی ہیں وہ نسل میں قائم ہو کر آنے والے جانداروں کی وراثت بن جاتی ہیں۔ ہزاروں صدیوں کے عرصہ میں انفرادی تبدیلیاں اس طریقہ سے نئی نسل نئی جنس اور نئی نوع پیدا کر دیتی ہیں۔ اس طرح زندگی ایک سل (Cell) سے ترقی کر کے رفتہ رفتہ سیپیوں، مچھلیوں، سانپوں، چڑیوں اور دودھ پلانے والے جانوروں سے بڑھکر انسان تک پہونچی ہے۔

کہا جا چکا ہے کہ مسئلہ ارتقاء کے متعلق اہل سائنس میں اختلاف ہے لیکن یہ اختلاف ارتقاء کے وجوہ اور ذرائع میں ہے واقعۂ ارتقاء میں کسی کو کلام نہیں۔ اس کی شہادت میں ایسے ثبوت موجود ہیں کہ شک کی جگہ نہیں رہتی۔ اُن اثبات کا خلاصہ یہ ہے:۔

ا۔ حیوانات کے جسم کی ساخت اور ان کی ہڈیوں، رگوں اور پٹھوں پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کل حیوانات (اسمیں انسان کا بھی شمار ہے) ایک ہی نسل سے ہیں۔ انسان اور دوسرے جانوروں کے بدن کی ساخت بالکل ایک ہی سی ہے۔ سب کے ایک ہی سے اعضاء ہیں مثلاً دماغ، دل، پھیپھڑے سب کے پاس موجود ہیں اور ایک ہی کام کرتے ہیں۔ انسان کے ڈھانچہ کی ایک ایک ہڈیوں کا مقابلہ گھوڑے، بندر یا چمگادڑ کی ہڈیوں سے کیا جا سکتا ہے۔ اور انسان کے بدن کے ایک ایک پٹھوں کا مقابلہ دودھ پینے والے جانوروں کے پٹھوں سے کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح انسان کے حسیات، جذبات اور تحریکات طبعی کا مقابلہ دوسرے جانوروں کی دماغی کیفیت سے کیا جا سکتا ہے۔ سب کے حواس خمسہ ہوتے ہیں۔ ان حواسوں کے ذریعے یعنی آنکھ، ناک، کان، زبان اور جلد کی سب میں ایک ہی ساخت ہے۔ سب ایک ہی سے جذبات کا بھی اظہار کرتے ہیں اور خوف و حسد اور غصہ کے علامات سب میں پائے جاتے ہیں۔ بیماریاں بھی سب کو ایک ہی سی ہوتی ہیں اور کیمیاوی اشیا کا اثر بھی وہی ہوتا ہے۔

جو جانور انسان سے سب سے زیادہ ملتے جلتے ہیں وہ بندر یا بن مانس ہیں۔ پھر بھی علما نے کبھی نہیں کہا کہ انسان بندروں کی اولاد ہے تحقیق سے انھیں صرف اتنا خیال پیدا ہوتا ہے کہ انسان اور بندر ایک ہی نسل سے ہیں اور ان کے بڑے غالباً درختوں پر رہتے ہونگے۔

۲۔ روئے زمین کی تواریخ کا مطالعہ علماء جمادات نے پتھروں سے کیا ہے۔ زمانہ کے انقلابات سے جانوروں کے جسم رفتہ رفتہ زمین میں دفن ہوجاتے ہیں اور ہزارہا برس بعد بھی دبے دبائے محفوظ رہتے ہیں۔ ان پرانے دفن شدہ جسموں کو فاسل (FOSSIL) کہتے ہیں۔ کبھی انقلابات زمانہ مثلاً زلزلہ وغیرہ سے یہ قبریں اوپر آجاتی ہیں اور اہل بصارت کو اس بات کا موقعہ دیتی ہیں کہ محنت کرکے اُن پر لکھی ہوئی کہانیوں کو پڑھیں۔ سب نیچے کے چٹانوں کی تہ میں کسی قسم کے فاسل نہیں ملتے۔ یہ اس وقت کا حال بتاتے ہیں جبکہ روے زمین پر زندگی کا نام نہ تھا۔ اس کے اوپر کی تہوں میں زندگی شروع ہونے کے علامات پائے جاتے ہیں ان میں سیپ کی مچھلیوں کے فاسل ہیں اس کے بعد کی تہوں میں (ہر ایک تہ کئی کروڑ صدیوں کا وقفہ ظاہر کرتی ہے) مچھلیاں ملتی ہیں۔ پھر مینڈکوں کی باری آتی ہے۔ اس کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ٹھنڈے خون والے سانپ زمین اور سمندر پر قبضہ کئے رہے۔ سب کے بعد دودھ پلانے والے جانور ملتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ادنیٰ ترین قسمیں پہلے پیدا ہوئیں۔ رفتہ رفتہ ترقی ہوتی گئی یہاں تک کہ حضرت انسان تشریف لائے۔

چٹانوں میں انسان کے نشو و نما کی دلچسپ کہانی کا بھی مطالعہ کیا گیا ہے۔ فلاسفہ نے کم سے کم سات مختلف قسم کے انسانوں کی ہڈیاں جمع کی ہیں۔ یہ انسان ہزارہا برس قبل زمین پر آباد تھے۔ ان کی بابت یہ امر خاص طور سے قابل غور ہے کہ یہ جتنے پرانے ہیں اتنے ہی بندروں سے ملتے جلتے ہیں۔

۳۔ ہر انسان اور جانور اپنی زندگی کے ذرا سے عرصہ میں وہ سب تبدیلیاں دُہراجاتا ہے جو اس کی نسل میں کروڑوں صدیوں کے عرصہ میں ظہور پذیر ہوئیں۔ یہ تبدیلیاں حرف بحرف اس کہانی کی تصدیق کرتی ہیں جو چٹانوں پر لکھی ہوئی ملتی ہے۔ ہر جانور ایک سل کی حیثیت سے زندگی شروع کرتا ہے۔ یہ سل ایک سے دو اور دو سے چار ہوکر اپنی تعداد بڑھاتی جاتی ہے۔ پیدا ہونے سے پیشتر انسان کا بچہ مچھلی، مینڈک، سانپ ابتدائی دودھ پلانے والے جانور اور بندروں سے ملتی جلتی شکلیں باری باری سے اختیار کرتا ہے۔ ایک حالت میں گل پھڑے کے نشانات ہوتے ہیں اور ایک وقت میں دم صاف صاف موجود ہوتی ہے۔ پیدائش سے تین مہینے قبل

اس کا سارا بدن سیاہ نرم بالوں سے ڈھکا رہتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ بچہ دُم سمیت پیدا ہوا ہے۔

پیدائش کے بعد بھی بچہ اسی طرح نشوونما پاتا ہے جیسے علماء کے خیال میں نسل نے ترقی کی تھی۔ جب وہ ہاتھ پانوں استعمال کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ گھٹنوں کے بل چلنے لگتا ہے اور چوپایوں کی طرح زندگی شروع کرتا ہے۔ بعد میں سیدھے کھڑے ہونے کی کوششیں کرتا ہے۔ اس کی زبان سے شروع میں صرف غیں غیں نکلتا ہے۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ بچہ جب شروع شروع میں کھیلتا ہے تو اس کے مذاق سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس کی طبیعت کھو بنانے اور درختوں پر چڑھنے کی طرف راغب ہے اس کو ایسے ہی مشاغل اچھے معلوم ہوتے ہیں جو کہ ابتدائی انسان کے رہے ہونگے۔

۴۔ اس کے علاوہ ارتقاء کی تصدیق انسان کی ساخت سے ہوتی ہے۔ جسم انسانی میں تقریباً دو سو پٹھے اور اعضاء ایسے ہیں جو بحالت موجودہ ہمارے لئے قریب قریب بیکار ہیں لیکن جانوروں میں وہ اب بھی ضروری کام انجام دیتے ہیں۔ ان میں کان ہلانے اور رونگٹے کھڑے کرنے کے پٹھے شامل ہیں۔ ورمی فارم اپنڈکس (Vermiform Appendix) جو گھاس کھانے والے جانوروں کا ایک ضروری عضو ہے انسان کے لئے نہ صرف بیکار ہے بلکہ اکثر خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ یہ اس وقت کی یادگار ہے جب انسان کے بزرگ گھاس کھایا کرتے تھے۔ بدن کے روئیں عقل ڈاڑھ، پیر کی چھنگلیاں سب ہمیں اپنی نسل کی یاد دلاتے ہیں۔ سب تو سب انسان کے ساتھ ساتھ بچھڑی ہوئی دُم کی یادگار چند ہڈیاں بھی موجود ہیں۔ ان سب چیزوں کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ایک وقت میں ہمارے کارآمد تھیں لیکن اب حالات بدل گئے صرف گذشتہ حالت کی یادگار یہ اعضاء باقی ہیں۔

۵۔ ارتقاء کا نظارہ آج بھی موجود ہے اور دیکھا جا سکتا ہے۔ اہل بصارت مطالعہ کر رہے ہیں کہ ایک پشت کے بعد دوسری پشت میں کس طرح تبدیلیاں ہو جاتی ہیں۔ اور ایک قسم کے درخت یا جانور سے چند پشتوں کے بعد مختلف قسمیں کس طرح پیدا ہو جاتی ہیں۔ کولمبیا یونیورسٹی کے مسٹر مارگن (Mr. Morgan) نے دس برس کے اندر بیسیوں نئے قسم کے پھل اُڑتے پھرتے پائے۔ ان پھلوں کا وجود پہلے کبھی نہ تھا۔ کچھ دنوں پیشتر ٹماٹر ایک جنگلی پھل تھا جو زہریلا سمجھا جاتا تھا اور کھانے کے کام کا نہیں تھا آج اس کی کم سے کم ایک درجن قسمیں بوئی جاتی ہیں اور شوق سے کھائی جاتی ہیں۔ آلو جب شروع میں دریافت ہوا تو اخروٹ سے بڑا نہ ہوتا تھا آج اسکی ایک قسم بہت بڑے پھل پیدا کرتی ہے۔

ارتقاء کے اس پہلو سے انسان نے بھی فائدہ اٹھایا ہے اور مناسب ترکیبوں سے سیکڑوں نئے قسم کے پھل اپنے مذاق کے مطابق پیدا کر لئے ہیں۔ جانوروں کی نئی نسلیں انسانی ضرورتوں کے مطابق پیدا کی گئی ہیں۔ یہاں تک کہ انسانی نسل کی ترقی کے لئے یہ اصول کامیابی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔

یہ ارتقاء کے خاص خاص ثبوت تھے۔ ان کی اہمیت کا اندازہ اچھی طور سے وہی کر سکتا ہے جو علم حیات سے واقفیت رکھتا ہو۔ لیکن ان دلیلوں پر کیا منحصر ہے ہماری زندگی کے ہر پہلو میں ارتقاء کا عنصر موجود ہے اور ابتداء سے انتہا تک ہماری زندگی ایک آہستہ لیکن مستقل اور ترقی کن انقلاب ہے۔ انڈہ سے بچہ نکلنا۔ سمندر کا چڑھ کر اتر جانا۔ دریا کا راستہ بدل دینا۔ دن اور رات ہونا۔ ٹوٹے پھوٹے خیالات سے عالیشان فلسفہ کا بننا۔ موٹا کام کرنے کے دیہاتی اوزاروں سے بڑی بڑی کلوں کا ایجاد ہونا۔ ذرا سے بیج سے بڑے بڑے درخت پیدا ہونا یہ سب ارتقاء ہی کا ظہور ہے۔

مشتاق احمد
الہ آباد یونیورسٹی

# منصوری

ترانہ ہا بسرائم ز دار منصوری — دلم فدائے ہوائے بہار منصوری

نہادہ بر سر ہر زخم پنبۂ ابرے — مرعیست دل داعند ار منصوری

کرا خبر زرہ و رسم مذہب و ایماں؟ — بس است بہر نجاتم خمار منصوری

بچشم اہل یقیں بہ زگلستان جہاں — ہزار گونہ بود خارزار منصوری

ترا چو ذوق فنا ہست ماجدا بنگر — بخانۂ دلِ ہر گل مزار منصوری

ماجد بی۔ اے

# سورت کا قہوہ خانہ

شہر سورت میں ایک مشہور قہوہ خانہ تھا جہاں دنیا کے ہر حصۂ ملک سے سیاح اور مسافر آکر ٹھہرتے اور اُس میں تبادلۂ خیالات کرتے تھے۔ ایک دن ایک ایرانی عالم الٰہیات اس قہوہ خانہ میں داخل ہوا۔ اس شخص نے مطالعہ قدرت میں اور وجود اللہ کے متعلق کتابیں دیکھنے میں اپنی عمر کا بڑا حصہ صرف کر دیا تھا، اس مسئلہ میں اس نے اس قدر سوچا، پڑھا اور لکھا کہ آخر کار عقل و خرد جاتی رہی، اور اس کے خیالات میں اس درجہ انتشار ہوا کہ وہ "وجود اللہ" کا منکر ہی ہو گیا، شاہ ایران کو جب یہ خبر معلوم ہوئی تو اُس نے جلا وطن کر دیا، تمام عمر "سبب اول" کے متعلق بحث کر کے اس بد نصیب عالم الٰہیات نے اپنے آپ کو غیر معمولی پیچیدگیوں میں مبتلا کر لیا تھا، اور اس مسئلہ کو حل کرنے کی قوت استدلال سلب ہو چکی تھی، اس نے اپنے نزدیک یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ کوئی اعلیٰ قوت دنیا پر حکمران نہیں ہے، اُس شخص کا ایک حبشی غلام بھی تھا جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہا کرتا تھا، جب عالم الٰہیات قہوہ خانہ میں داخل ہوا تو غلام دروازہ کے باہر ہی ٹھہر گیا، ایک پتھر پر بیٹھے ہوئے سورج کی روشنی میں اُن مکھیوں کو جو اسکے اطراف بھنبھنا رہی تھیں اُڑا رہا تھا، ایرانی عالم خاموشی کے ساتھ قہوہ خانہ کے ایک کونہ میں بیٹھ گیا اور چُسکی (افیون کا پیالہ) کی فرمائش کی، تیزی کے ساتھ اس پیالہ کو پی لیا، اور جب افیون نے اس کی دماغی حالت میں ایک ہیجان پیدا کر دیا تو کھلے دروازہ کی طرف سے اس نے اپنے غلام کو مخاطب کر کے کہا:۔

"ارے بد نصیب غلام کیا تو وجود اللہ کا قائل ہے ؟"

"ہاں میں خدا کے وجود کا قائل ہوں" غلام نے کہا اور فوراً اپنی کمر سے ایک چھوٹا سا لکڑی کا بُت نکالا اور کہنا شروع کیا:۔

"دیکھئے یہی میرا خدا ہے جس نے بچپن سے اب تک میری حافظت کی، ہمارے ملک میں ہر شخص اس درخت کی پرستش کرتا ہے جس سے یہ دیوتا بنا ہے"

قہوہ خانہ کے تمام حاضرین نے اس عالم الٰہیات اور غلام کی گفتگو کو نہایت تعجب سے سُنا، انھیں آقا کے سوال پر حیرت ہوئی اور اس سے بڑھکر غلام کے جواب ...

اُن میں سے ایک شخص جو برہمن تھا اور غلام کی گفتگو کو بہت غور سے سُن رہا تھا، اس نے غلام کو مخاطب کر کے کہا۔
"ارے او بیوقوف! کیا تیرے خیال میں یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص خدا کو اپنی کمر میں چھپا کر لے جا سکتا ہے؟ خدا ایک ہے برہما...... جو تمام دنیا سے بڑا ہے اس لئے کہ اُسی نے یہ دنیا بنائی ہے، خدا ایک ہے اور سب سے بڑا ہے، دریائے گنگا کے کنارے اُسی کی عبادت کے لئے مندر بن (عبادت خانے) تیار کئے گئے ہیں، جہاں اس کے ایماندار پُجاری برہمن اسکی پرستش کرتے ہیں وہ صرف اس خدائے واحد کی پرستش کرتے ہیں اور کسی کی نہیں، ہزاروں سال گذر گئے، پے در پے انقلاب ہوئے، لیکن اب تک برہمنوں کو وہی اقتدار حاصل ہے اس واسطے کہ اس پاک اور سچے خدا نے اُن کی حفاظت کی"

برہمن نے ہر شخص کی تسلی کرنے کے خیال سے اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کیا، مگر ایک یہودی دلال نے جو وہاں موجود تھا کہنا شروع کیا،
"نہیں! سچے خدا کا عبادت خانہ ہندوستان میں نہیں ہے اور نہ خدا برہمن قوم کی حمایت کرتا ہے، برہمنوں کا خدا سچا خدا نہیں ہے بلکہ حضرت ابراہیمؑ حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ کا خدا ہے، وہ صرف بنی اسرائیل کی حمایت کرتا ہے، آفرینش عالم سے اب تک ہماری اور صرف ہماری قوم اس کی محبوب رہی ہے، اگر موجودہ زمانہ میں ہم تمام دنیا میں منتشر ہیں تو اس کا صرف یہی مطلب ہے کہ ہماری آزمائش ہو رہی ہے، اس لئے کہ خدائے پاک نے وعدہ کیا ہے کہ آخر میں ایک دن یروشلم میں اپنے تمام بندوں کو جمع کروں گا...... دنیائے قدیم کے عجائبات ...... پھر اُسی آب و تاب سے اپنی اصلی شان میں نظر آئیں گے، اور تمام قوموں میں اسرائیلی حکومت قائم ہو جائے گی"

اس طرح یہودی نے اپنی تقریر ختم کی، لیکن آخر میں اس کی آنکھوں سے سیل اشک جاری ہو گیا، وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر ایک اطالیہ کے عیسائی نے قطع کلام کرتے ہوئے یہودی کو مخاطب کر کے کہا۔
"تم جو کچھ کہہ رہے ہو یہ صحیح نہیں ہے، تم خدا کو نامنصف ٹھہراتے ہو، خدا تمھاری قوم کو اور قوموں سے زیادہ عزیز نہیں رکھتا، اور اگر یہ صحیح مان بھی لیا جائے کہ زمانہ قدیم میں خدا بنی اسرائیل پر بہت مہربان تھا تو بھی یہ بات صاف ہے کہ اب انیس سو سال کا عرصہ ہونے کو آیا کہ تمھاری حرکتوں نے خدا کو ناراض کر دیا، اور تمھاری قوم پر قہر الٰہی نازل ہوا اور تمھاری قوم منتشر ہو گئی اور اشاعت و تبلیغ کا کام بالکل مسدود ہو گیا سوائے اس کے کہ کبھی کبھی کوئی ایک یہودی کہیں نظر آ جاتا ہے، خدائے پاک سوائے اُن لوگوں کے اور کسی قوم پر رحم نہیں کرتا جو رو ملکے کیتھولک چرچ

(کلیسائے روم) کے زیر پناہ ہے، اور صرف اُسی کو نجات اُخروی حاصل ہوگی"

ایک پروٹسٹنٹ پادری جو اتفاقاً یہاں موجود تھا، یہ سُنکر پیچ و تاب کھا رہا تھا، جب اطالوی شخص نے اپنی گفتگو ختم کی تو اُس نے اس کو مخاطب کر کے کہا :-

"تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ صرف تمھارے طریقہ پر چلنے والوں کو نجات ملے گی، صرف وہی لوگ بخشے جائیں گے جو گاسپل (انجیل) کے اصول کے مطابق جوش و خلوص کے ساتھ خدائے پاک کی اطاعت کرتے ہیں اور مسیح علیہ السلام کے کہنے پر عمل"

پھر ایک ترک نے جو سورت کے چُنگی خانہ کا عہدہ دار تھا اور اب تک خاموش بیٹھا پائپ پی رہا تھا نکمنت آمیز وقار کے ساتھ دونوں عیسائیوں کو متوجہ کر کے اس طرح کہنا شروع کیا :-

"مذہب روما کے متعلق تمھارا عقیدہ بالکل باطل ہے، تیرہ سو سال پیشتر مذہب عیسائیت کی جگہ پاک مذہب اسلام نے لی، تم کو سوائے اقبال کے مفر نہیں ہے، اس واسطے کہ تم جانتے ہو کہ اسلام، یورپ، ایشیا اور تہذیب یافتہ ممالک میں کس طرح اشاعت پا رہا ہے، تمنے خود یہ بیان کیا ہے کہ خدائے پاک نے یہودیوں پر غضب نازل کیا، جس کی شہادت میں تم نے یہ واقعہ پیش کیا کہ یہودی ہر جگہ ذلیل ہوئے اور اس مذہب کی اشاعت بھی مسدود ہوگئی، پھر اب تم کو اسلام کی صداقت کا قائل ہو جانا چاہئے۔ دنیا کے ہر گوشہ میں یہ مذہب اشاعت پا رہا ہے، سوائے ختم المرسلین کی اُمت یعنی مسلمانوں کے اور کسی کی نجات نہ ہوگی اور وہ بھی متبعین حضرت عمرؓ (سُنّیوں) کی اور متبعین حضرت علیؓ (شیعہ) کی نہیں اس لئے کہ اُن کا مذہب جھوٹا ہے"

اس کے جواب میں ایرانی عالم الٰہیات کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس وقت تمام مختلف مذاہب اور قوموں کے افراد میں ایک قسم کی جنگ چھڑ گئی، وہاں پر حبشی، عیسائی، رومی، اسماعیلی اور آتش پرست سب ہی موجود تھے، ان سب نے خدا کی صفت اور طریقۂ عبادت کے متعلق بحث کرنا شروع کر دی، ہر شخص اس بات کا دعویٰ کر رہا تھا کہ صرف اسی کے ملک میں سچے خدا کے ماننے والے اور اس کی عبادت کرنے والے ہیں، ہر شخص نے اپنے دلائل بیان کئے اور خوب شور و غل مچانا شروع کیا لیکن صرف ایک چینی کنفوشس[۱۵] کا پیرو خاموش قہوہ خانہ کے ایک کونے میں بیٹھا رہا، اس جھگڑے

---

[۱۵] کنفوشس ایک زبردست چینی فلاسفر گذرا ہے، جس نے لوگوں کو اخلاقی حالت کی طرف توجہ دلائی، وہ سچائی کی تعلیم سکھاتا تھا اور کسی ایک خدا کی عبادت کی تلقین نہیں کرتا تھا۔ مترجم

میں اس نے کوئی حصّہ نہ لیا۔ وہ چاء پی رہا تھا اور لوگوں کے دلائل سُن رہا تھا لیکن اس نے خود کچھ بھی نہ کہا۔

ترک نے اُسے خاموش بیٹھے ہوئے دیکھ لیا اور اُسے متوجہ کرکے کہنا شروع کیا:۔

"اچھے چینی، تم میرے بیان کی تائید کرسکتے ہو اگرچہ اب تم خاموش ہو لیکن میں جانتا ہوں کہ اگر تم کچھ کہو گے تو ضرور میری موافقت ہی میں کہو گے، تمھارے ملک سے آنے والے تجار جب میرے ہاں امداد کے واسطے آتے ہیں تو یہ بیان کرتے ہیں کہ گو چین میں بہت سے مذاہب رائج ہوئے مگر تم چینی لوگ صرف اسلام کو سب سے اچھا مذہب سمجھتے ہو، اور اُسے بخوشی قبول کرتے ہو پھر دیر کس بات کی ہے، اُٹھو اور خدائے پاک اور اس کے برگزیدہ رسول (صلعم) کے متعلق میرے بیان کی تائید کرو"

سب لوگوں نے اس سے کہنا شروع کیا "ہاں، ہاں، ہم اس مسئلہ کے متعلق تمھارے خیالات معلوم کرنا چاہتے ہیں"

یہ چینی شخص تھوڑی دیر تک آنکھیں بند کئے سوچتا رہا، پھر آنکھیں کھولدیں، انگرکھے کی آستین کھینچتے ہوئے دونوں ہاتھ سینہ پر باندھ لئے اور نہایت سنجیدگی، متانت اور آہستگی سے یوں کہنے لگا:۔

"معزز حضرات! میرے خیال میں صرف غرور اور تعصب کی وجہ سے انسان دوسرے مذاہب سے اتفاق نہیں کرتا، اگر آپ لوگ غور سے سنیں تو میں ایک قصہ بیان کروں گا جو تمثیل کے ساتھ اس مسئلہ کو حل کردیگا۔

میں ایک انگریزی جہاز میں جو دنیا کے اطراف پھر چکا تھا جزیرہ سماترا میں پہونچا، جہاں ہم تازہ پانی کے لئے مشرقی ساحل پر ٹھہر گئے، چونکہ دوپہر کا وقت تھا اس لئے ہمارے ساتھیوں میں سے چند لوگ درختوں کے سایہ میں بیٹھ گئے، جو آبادی کے قریب ساحل دریا پر واقع تھے، اُن ساتھیوں میں مختلف قوموں اور جماعتوں کے لوگ تھے، ہم لوگ وہاں بیٹھے ہوئے ہی تھے کہ ایک اندھا شخص معہ ایک غلام کے آیا، بعد میں ہم کو معلوم ہوا کہ سورج کی طرف ایک عرصہ تک بغور دیکھنے سے اس کی بینائی زائل ہوگئی تھی، وہ سورج کی حقیقت معلوم کرنا چاہتا تھا تاکہ سورج کی روشنی سے اچھی طرح متمتع ہوسکے، اس نے ایک مدت اسی جد و جہد میں گذار دی تھی، ہمیشہ سورج کی طرف گھورتا رہا لیکن اس کا صرف یہی نتیجہ نکلا کہ اس کی آنکھوں کو نقصان پہونچا اور وہ اندھا ہوگیا۔

اُس اندھے شخص نے خود کو مخاطب کرکے کہنا شروع کیا:۔

"سورج کی روشنی مایہ نہیں ہے اس لئے کہ اگر وہ مایہ ہوتی تو ایک برتن سے دوسرے برتن میں ڈالی جاسکتی، اور پانی کی مانند ہوا اُس کو حرکت میں لاتی، اور نہ وہ آگ ہے اگر آگ ہوتی تو پانی اسے بجھا دیتا، اور نہ روشنی کوئی بھوت ہے اسلئے کہ ہم اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھ سکتے ہیں، اور وہ مادّہ بھی نہیں ہے اسلئے کہ وہ حرکت نہیں کرتی، لہذا جب کہ سورج کی روشنی مایہ ہے نہ آگ، نہ بھوت ہے نہ مادّہ...... تو پھر کچھ بھی نہیں ہے"

اسی طرح وہ اپنے دلائل بیان کرتا رہا، سورج کی طرف ہمیشہ گھورتے رہنے اور اسی کا تصور کرنے کی وجہ سے بینائی اور قوت استدلال دونوں جاتے رہے اور جب وہ بالکل اندھا ہوگیا تو اُسے اِس کا کامل یقین ہوگیا کہ سورج کا وجود ہی نہیں ہے، اس اندھے آدمی کے ساتھ جو غلام تھا اس نے اپنے آقا کو ناریل کے درخت کے سایہ میں بٹھا کر زمین پر سے ایک ناریل اُٹھالیا اور اس کی شمع بنانے لگا، ناریل کے تار کو بل دیکر بتی بنالی اور اسی ناریل کے کٹورے میں تیل ڈالکر شمع روشن کردی،

جب کہ غلام اس کام میں مشغول تھا، اندھے آدمی نے ٹھنڈی سانس لیکر کہا،

"اے غلام! کیا میں نے تجھ سے نہیں کہا تھا کہ سورج کا وجود نہیں ہے؟ کیا تو نہیں دیکھتا کہ کیسا اندھیرا ہے؟ لیکن تعجب ہے کہ پھر بھی لوگ کہتے ہیں کہ سورج ہے...... اگر ایسا ہی ہے تو پھر وہ کیا ہے؟"

غلام نے کہا "میں خود بھی نہیں جانتا کہ سورج کیا ہے، اور یہ میرا کام بھی نہیں ہے تاہم میں جانتا ہوں کہ روشنی کیا ہے، دیکھئے میں نے یہاں روشنی کا انتظام کرلیا ہے جس کی مدد سے میں آپ کی خدمت کرسکتا ہوں اور ہر ضروری چیز جھونپڑے سے نکال سکتا ہوں" غلام نے ناریل کی شمع کو اُٹھالیا اور کہنے لگا "یہی میرا سورج ہے"

ایک لنگڑا آدمی جو چند لاٹھیاں لئے قریب ہی بیٹھا تھا یہ سُن کر ہنسنے لگا اور اندھے کو مخاطب کرکے کہا:-

"معلوم ہوتا ہے کہ تم تمام عمر اندھے ہی رہے اور تم کو یہ تک نہ معلوم ہوا کہ سورج کیا ہے، میں تمھیں بتاؤنگا کہ وہ کیا ہے، سورج آگ کا گیند ہے جو ہر روز صبح دریا سے برآمد ہوتا ہے اور ہر شام مغرب کو ہمارے جزیرہ کے پہاڑوں میں غائب ہوجاتا ہے، ہم نے خود یہ سب دیکھا ہے، اور اگر تمھاری بینائی ہوتی تو تم بھی دیکھ سکتے"

ایک ماہی گیر جو یہ گفتگو سُن رہا تھا اُس نے کہا:-

"اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تم نے اپنے جزیرہ سے باہر قدم نہیں رکھا، اگر تم لنگڑے نہ ہوتے اور میری طرح ماہی گیر کی کشتی میں کہیں باہر جاتے تو تم کو معلوم ہوتا کہ سورج صرف ہمارے پہاڑوں میں غروب نہیں ہوتا ہے بلکہ جس طرح

وہ صبح کو سمندر سے طلوع ہوتا ہے اسی طرح مغرب کو دریا میں غروب ہوتا ہے' میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں یہ بالکل سچ ہے اس لئے کہ میں ہر روز اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرتا ہوں"

پھر ایک ہندوستانی جو ہماری جماعت میں سے تھا قطع گفتگو کرتے ہوئے کہنے لگا:۔

"مجھے تعجب ہے کہ ایک معقول پسند آدمی اس قسم کی لغو بات کہے' یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ آگ کی گیند پانی میں غروب ہو اور بجھ نہ جائے؛ سورج ہرگز آگ کی گیند نہیں ہے' بلکہ "دیو" نام ایک دیوتا ہے جو ہمیشہ اپنی رتھ میں سوار ہو کر سنہرے پہاڑ میرو کے اطراف پھرتا ہے' اکثر موذی سانپ راگو اور کیتو اس پر حملہ کرتے ہیں اور اسے نگل جاتے ہیں اسی وجہ سے زمین پر اندھیرا چھا جاتا ہے' ہمارے پجاری دیوتا کے جلد نجات پانے کے لئے دعا کرتے ہیں اور وہ چھوٹ جاتا ہے' صرف تم جیسے جاہل لوگ جو اپنے جزیرہ سے باہر کہیں نہیں گئے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ سورج صرف انھیں کے ملک کو روشن کرتا ہے"

ایک اور شخص نے کہنا شروع کیا:۔

"نہیں تم بھی غلطی پر ہو' سورج دیوتا نہیں ہے اور نہ صرف ہندوستان اور سنہرے پہاڑ کے اطراف چکر لگاتا ہے بلکہ میں نے بحر اسود میں بہت سفر کیا ہے' ساحل عربستان اور میڈاگاسکر اور فلپائن' سگر تک گیا ہوں' سورج نہ صرف ہندوستان کو اپنی روشنی سے منور کرتا ہے بلکہ ساری دنیا کو' وہ کسی ایک پہاڑ کے اطراف چکر نہیں لگاتا بلکہ دور مشرق میں جزیرہ جاپان کے پرے طلوع ہوتا ہے اور مغرب میں جزیرہ انگلستان کے پرے غروب ہوتا ہے' اسی واسطے جاپانی اپنے ملک کو "ہن" یعنی سورج کی جائے پیدائش کہتے ہیں' میں اسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں اسلئے کہ میں نے خود بہت کچھ دیکھا ہے اور اپنے دادا سے بھی بہت کچھ سنا ہے جس نے دریا کے آخری سرے تک کا سفر کیا تھا" وہ اسی طرح اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتا لیکن ایک انگریز ملاح نے دخل دیتے ہوئے کہنا شروع کیا:۔

"کوئی ایسا ملک نہیں ہے جہاں لوگ سورج کی حرکات کے متعلق معلومات نہ رکھتے ہوں جس طرح انگلستان والے' جس طرح کہ انگلستان میں ہر شخص جانتا ہے سورج نہ کہیں طلوع ہوتا ہے نہ غروب بلکہ وہ ہمیشہ زمین کے اطراف گردش کرتا رہتا ہے اور ہم اس پر یقین کر سکتے ہیں اس واسطے کہ ہم نے خود زمین کا طواف کیا ہے اور کہیں بھی سورج سے مڈ بھیڑ نہیں ہوئی' جہاں کہیں بھی ہم گئے ہم نے دیکھا کہ یہاں کی مانند صبح میں سورج نمودار ہوتا ہے اور شام کو غائب" اسکے بعد انگریز نے ایک چھڑی اٹھالی اور ریت پر دائرے کھینچتے ہوئے بیان کرنا شروع کیا کہ سورج کس طرح

آسمان پر گردش کرتا ہے اور زمین کے اطراف پھرتا ہے، لیکن وہ اچھی طرح سے بیان نہ کرسکا اور ایک ملاح کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگا:-

"یہ شخص مجھ سے زیادہ جانتا ہے اسلئے بہت اچھی طرح سے یہ مسئلہ بیان کریگا"

یہ ملاح ایک ذہین اور چالاک شخص تھا جو خاموشی سے اب تک دوسروں کی گفتگو سنتا رہا اور اب جب کہ لوگوں نے اس کو اپنی رائے ظاہر کرنے پر مجبور کیا تو کہنے لگا:-

"تم سب آپس میں ایک دوسرے کو فریب دیتے ہو اور آخر میں خود دھوکا کھا جاتے ہو، سورج زمین کے اطراف گردش نہیں کرتا بلکہ زمین سورج کے اطراف پھرتی ہے، اور سورج کے اطراف پھرتے ہوئے ہر چوبیس گھنٹوں میں وہ نہ صرف جاپان، فلپائن اور سوماترا (جہاں ہم بیٹھے ہوئے ہیں) بلکہ افریقہ، یورپ، امریکہ اور دیگر ممالک کو سورج کے سامنے پیش کرتی ہے، سورج صرف کسی ایک پہاڑ، جزیرہ یا کسی ایک دریا کو یا کسی ایک زمین کو منوّر نہیں کرتا بلکہ زمین کے علاوہ دوسرے سیّاروں (اجرام فلکی) کو بھی روشنی پہونچاتا ہے۔ اگر تم بجائے زمین کی طرف دیکھنے کے آسمان کی طرف دیکھو تو پھر سب کچھ تمھاری سمجھ میں آجائیگا اور پھر تم اس خیال میں مبتلا نہ رہو گے کہ سورج صرف تمھارے لئے یا تمھارے ملک کے لئے روشن ہوتا ہے"

اس طرح اس عقلمند ملاح نے گفتگو کی جس نے دنیا کا بہت کچھ سفر کیا تھا اور جو آسمان کی طرف بھی بہت کچھ گھور چکا تھا۔

اس کے بعد چینی نے کہنا شروع کیا "حضرات! اسی طرح مذہبی مسائل میں بھی تکبّر ہی کی وجہ سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اور یہ لوگوں میں نفاق ڈالتا ہے، جس طرح سورج کی حالت ہے اسی طرح خدا کی ہے، ہر شخص چاہتا ہے کہ اسکے واسطے یا کم سے کم اسکے وطن کے لئے ایک مخصوص خدا ہو، اور ہر قوم چاہتی ہے کہ خدا کو اپنے ہی عبادت خانوں تک ہی محدود کرے، جس کو کہ ساری دنیا بھی محدود نہیں کرسکتی،

کیا کوئی عبادت خانہ اس خدا کے بنائے ہوئے عبادت خانہ کا مقابلہ کرسکتا ہے جسے خدا نے تمام مختلف قوموں کو ایک دین اور ایک مذہب میں منسلک کرنے کے لئے تعمیر کیا ہے، تمام انسانی عبادت خانے خدا کے بنائے ہوئے عبادت خانہ کی وضع پر بنائے گئے ہیں جو کہ خود خدا کی دنیا ہے، ہر ایک عبادت خانہ کے پانی کا برتن علحدہ ہے، اسکے گنبد نما چھت، اس کے فانوس، اس کی تصاویر یا مورتیں، اس کی تحریرات اور کتبات اس کی قانونی کتابیں، اسکے

ایثار، اس کی قربان گاہیں، اس کے پجاری بھی جدا جدا ہیں لیکن کیا کسی عبادت خانہ میں سمندر کے مانند پانی کا برتن ہے؟ اور آسمان کے مانند گنبد کی چھت؟ سورج کے مانند فانوس؟ یا کوئی مورت یا تصویر ایسی ہے جسے محبت پرور اور ہمدرد انسان کے ساتھ تشبیہ دیجا سکے؟ کسی جگہ خدا کی عنایات کے ایسے ریکارڈ نہیں ہیں جیسے خدائے پاک نے انسان کی خوشی کے لئے دنیا کی تمام چیزوں پر پھیلا دیا ہے، کونسی قانونی کتاب اس قدر صاف اور واضح ہے جس طرح انسان کا دل، کونسے ایسے ایثار ہیں جو محبت پرور مرد اور عورت کی قربانیوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟ ایک نیک آدمی کے دل سے جہاں خود خدائے پاک قربانیوں کو قبول کرتا ہے کونسی قربان گاہ کو تشبیہ دیجا سکتی ہے۔

جس طرح انسان کا تخیل خدا کے متعلق اعلیٰ وارفع ہوتا جائیگا اسی طرح وہ خدا کو بہتر طور پر سمجھتا جائیگا، جب وہ خدا کو اچھی طرح سمجھیگا تو وہ پھر اس کا قرب حاصل کرتا جائیگا اور اس کی نیکی، اس کی رحمدلی، اور محبت جیسے صفات اختیار کر لیگا، اسواسطے جو شخص سورج کی روشنی کو ایک عالم کو منور کرتے ہوئے دیکھے اُسے چاہئے کہ اس شخص کو جو اپنے دیوتا میں اسی روشنی کی ایک کرن دیکھتا ہے بُرا بھلا نہ کہے اور اس کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھے اور اس شخص کو بھی بُرا نہ کہے جس کو اس مسئلہ کے متعلق کسی بات کا یقین نہ ہو اور اندھا ہو جانے کی وجہ سے سورج کو نہ دیکھ سکتا ہو"

اس طرح چینی نے اپنی تقریر ختم کی اور تمام لوگ جو اس قہوہ خانہ میں موجود تھے خاموش بیٹھے رہے اور مذہب کے متعلق کوئی جھگڑا نہ کیا۔

سعیدی - بی - اے (علیگ)
از حیدر آباد

---

# رُباعی

دل سینہ میں منزل گہِ جانانہ ہے		نورِ احدی رونق کا شانہ ہے
جس دل میں رہے اللاتِ اصنام وہ دل		بتخانہ ہے بتخانہ ہے بتخانہ ہے

سید محمد جعفر قدسی جائسی

# سُنبل

نومبر ۲۵ء کا "اکبر" ملاحظہ فرمائیے

(بہ سلسلۂ گذشتہ)

اس پودے کے متعلق اب تک جو کچھ لکھا جا چکا ہے اُس میں آپ نے اس کی ماہیت، اصلیت، کیفیت اور استعمال کے باب میں انگریز علماء کے خیالات اور اُن کے تجربہ کا اندازہ کیا ہوگا۔ لیکن یہ مضمون تشنہ رہ جائیگا اگر اس کے متعلق اہل یونان اور اُن کے رشید اہل عرب کی تحریروں کو بھی نہ دیکھ لیا جائے۔

اب سے قریب اُنیس سو برس پیشتر کا واقعہ ہے کہ ایک دلیر و جوان ہمت یونانی[۵۱] نے بحیرۂ احمر، خلیج فارس اور بحر ہند میں سفر کیا تھا اور اُس نے اپنے سفر کے دوران میں نہ صرف اُن سمندروں کا حال لکھا اور اُس کا نقشہ تیار کیا ہے بلکہ جن جن بندرگاہوں سے اُس کا گذر ہوا ہے ان کا کچھ کچھ حال بھی قلمبند کیا ہے۔ یہ سفر تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ سنہ ۶۰ء اور سنہ ۶۵ء عیسوی کے درمیان کا واقعہ ہے، اور سیاح نے اپنے اس مختصر مگر نہایت دلچسپ اور پُر از معلومات تحریر کا نام "بحر ہند کا خاکہ" رکھا ہے۔

جیسا کہ اس سے پہلے آپ دیکھ چکے ہیں، مغربی علماء نے اس پودہ کو دو ناموں سے یاد کیا ہے :—

(۱) نرڈ یا نارڈ (۲) اسپائک نارڈ۔ ان ہی ناموں سے "خاکہ" کا مصنف بھی اس کو موسوم کرتا ہے۔ جس وقت وہ بحر احمر اور خلیج فارس کو عبور کرنے کے بعد بحیرۂ عرب میں پہونچتا ہے، تو دریائے سندھ (یا اٹک) کے دہانہ اور اُس کے قرب و جوار کے بندرگاہوں کا ذکر کرتے ہوئے وہاں کی درآمد اور برآمد کی اشیاء کا بھی ذکر کرتا ہے۔ لکھتا ہے کہ "یہاں کے بازاروں میں باہر سے جو چیزیں آتی ہیں وہ یہ ہیں :— باریک کپڑے (مگر خراب قسم کے)، نقش دار کپڑے، نیلم، مونگا، اسٹورکس[۵۲]، خوشبوئیں، شیشے، چاندی اور سونے کے برتن، اور کچھ شراب

---

[۵۱] افسوس کہ اس شخص کا نام باوجود کوشش کے نہ معلوم ہو سکا۔ ھیڈل برگ کے کتب خانہ میں اس کتاب کا جو قلمی نسخہ ہے اس میں ایرین (Arrianus) کو اصل مصنف بتایا گیا ہے جو ۱۳۱ء میں قبیلہ و ثنیہ کا گورنر تھا۔ لیکن تحقیقات سے ثابت ہوا کہ یہ امر غلط ہے۔ بہر حال، اصل مصنف کا نام اب تک معلوم نہیں ہے۔

[۵۲] ایک قسم کا پودا ہے جس کا گوند دوائیوں میں کام آتا ہے۔

برعکس اسکے اس بندر سے جو اشیاء باہر جاتی ہیں ان میں کوسٹش[51] الیسیم[52]، نارڈ، فیروزہ، سنگ لاجورد، کھالیں، سوتی اور ریشمی کپڑے اور نیل شامل ہیں۔ پھر جب وہ وہاں سے جنوب کی طرف سفر کرتا ہوا بمبئی کے قریب بھڑوچ کے بندر پر پہونچتا ہے، تو وہاں کی بھی درآمد و برآمد کی چیزوں کا ذکر کرتا ہے۔ چنانچہ برآمد کی اشیاء میں وہ سب سے پہلے اسپائکٹ نارڈ کا ذکر کرتا ہے۔ بہر نوع ان بیانات سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ (۱) سُنبل بلاشبہہ ہندوستان کا پودا ہے اور یہ کہ (۲) اب سے ہزاروں سال پہلے سے غیر (اور خصوصاً) مغربی ملکوں کے باشندے اسے یہاں سے منگاتے اور (جیساکہ ہم پہلے سُن چکے ہیں) بطور خوشبو کے استعمال کرتے تھے۔ اب رہا یہ امر کہ اسپائکٹ نارڈ کا اصلی وطن ہندوستان میں کہاں ہے، اس کے متعلق ہم پہلے ہی سن چکے ہیں کہ ہمالہ پہاڑ اور دریائے گنگا کی شمالی سرحدیں اس کی پیدائش اور نشو و نما کے مقامات ہیں "خاکہ" کے مصنف نے بھی اس کی ایک مقام پر تصدیق کی ہے۔ چنانچہ اپنے بیان کی فصل ۵۶ میں جہاں وہ گنگا کے بندرگاہ کا ذکر کرتا ہے، وہاں پھر ایک مرتبہ وہ برآمدنی اشیاء میں اسپائکٹ نارڈ کا ذکر کرتا ہے اور اُسے گنگا کا "اسپائک نارڈ" بتاتا ہے۔

یونانی سیاح کے اس "خاکہ" کو شوف نے ایک مقدمہ اور تعلیقات کے ساتھ شایع کیا ہے[53]۔ یہ شوف شہر فلڈلفیا (ریاستہائے متحدہ، ملک امریکہ) کے تجارتی عجائب خانہ کا سکرٹری ہے، اور اس نے نہایت تحقیق اور کاوش سے اس "خاکہ" پر نوٹ لکھے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم نارڈ اور اسپائکٹ نارڈ کے متعلق اس کے خیالات بھی سُن لیں:-

(۱) نارڈ:-

(۱) سُویٹ رُش[54] (Sweet Rush) کے پودے کا حال لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ پلنی[55] نے اس پودے کی پیدائش وغیرہ کا حال لکھا ہے۔ اُس کا بیان ہے کہ بہترین سویٹ رُش مصر سے آتا ہے؛ اور خوشبو میں نارڈ سے بہت ملتا جلتا ہے۔

---

[51] یہ بھی ایک پودا ہے جو کشمیر میں پیدا ہوتا ہے اور وہاں سے اٹلی وغیرہ مغربی ممالک کو جاتا تھا۔ [52] یہ بھی ہمالہ کا ایک پودا ہے [53] سنہ شیوع ۱۹۱۲ء۔ [54] صفحہ ۱۱۱۔ [55] پلنی (Pliny) نام کے دو شخص گزرے ہیں؛ جو آپس میں چچا بھتیجے تھے۔ ایک پلنی نہایت زبردست عالم نباتات و حیوانات تھا۔ اور وہی یہاں مقصود ہے۔ وہ ۷۹ء میں اٹلی کے آتش فشاں پہاڑ وِسُووِیس کی آتشباری میں ہلاک ہوا۔ دوسرا یعنی اس کا بھتیجا، اپنے خاص تاریخی خطوط کے لئے مشہور ہے وہ ۱۱۳ء میں مرا ہے۔

(۲) گلگونہ[۱] وغیرہ کی خوشبوؤں کے ذکر میں اُسی پلینی کے حوالہ سے کہتا ہے کہ خوشبوؤں اور گلگونوں کی دو قسمیں ہوتی تھیں:- ایک تو وہ جس میں طرح طرح کے روغن اور عرق شامل ہوتے تھے اور دوسری وہ جو سخت اور منجمد ہوتے تھے قسم اوّل میں جہاں اور طرح طرح کی خوشبودار اشیاء کا ذکر ہے ان ہی میں نارڈ بھی شامل ہے۔

(۳) کوسٹس[۲] کے (جس کا ذکر اوپر آچکا ہے) بیان میں کہتا ہے کہ اہل روما کوسٹس کو ریڈکس (Radix) یعنی جڑ کہتے تھے اور نارڈ کو فولیم (folieem) یعنی پتہ۔ شاید یہاں یہ بیان کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ شوف کے خیال میں کوسٹس سنسکرت زبان کے لفظ کُشٹھ سے ہیں۔

(۴) لفظ نارڈ[۳] کی تشریح میں لکھتا ہے:-

نارڈ (یعنی جڑ جو ترائیوں میں پیدا ہوتی ہے، نہ کہ اسپائکنڈ نارڈ۔ پتہ یا پھول۔ جو پہاڑوں میں پیدا ہوتا ہے اور ایک جداگانہ چیز ہے) یہ ایک گھاس کی جڑ ہے۔ اسے سِمبوپوگن شینان تھس (Cymbopogon Schoenanthus) کہتے ہیں۔ یہ مغربی پنجاب، ہندوستان، بلوچستان اور ایران میں ہوتا ہے:- اور اس کی دوسری قسم جو ورانکش (guarancush) مشرق اور جنوب میں زیادہ ہوتی ہے۔ اس گھاس کی جڑ سے ایک تیل نکالا جاتا تھا جو اہل روما کی تجارت میں دوائی اور خوشبو کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور گلگونوں میں بھی ڈالا جاتا تھا۔ اس میں بالکل شک نہیں کہ یہ وہی نارڈ ہے جو سکندر کی فوج کو اپنے وطن کی طرف کوچ کرتے ہوئے غدروسیہ کے ملک میں ملا تھا، اور جس کے متعلق (ایرین[۴] کہتا ہے کہ "اس صحرا میں نارڈ کی طرح طرح کی خوشبودار جڑیں پیدا ہوتی ہیں، جن کو اہل فینیقیہ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن بہت سے پودے فوج کی نقل و حرکت میں کچل گئے تھے، اور کچلنے سے ان کی میٹھی میٹھی خوشبو دور دور پھیلتی تھی۔ اس سے ان پودوں کی کثرت کا اندازہ ہو سکتا ہے!"

(۵) اہل[۵] روما کی عورتیں جو ہار اور مالائیں استعمال کرتی تھیں، ان کے متعلق پلینی کا بیان ہے کہ اس کے زمانے میں ہندوستان سے بہت سی مالائیں آتی تھیں اور ان میں کپڑوں پر نارڈ کے پتے بنے ہوتے تھے۔

(۶) سیاہ[۶] مرچ پر نوٹ لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ "شہنشاہ قسطنطین نے کلیسا کو جو نذریں دی تھیں ان میں

---

[۱] صفحہ ۱۱۳ - [۲] صفحہ ۱۶۹ - [۳] صفحہ ۱۷۰ - [۴] رومی مورخ اور سیاح - [۵] صفحہ ۱۹۱
[۶] صفحہ ۲۱۴-

قیمتی ظروف، خوشبودار گوند، مصالح، دارچینی، زعفران، سیاہ مرچ اور نارڈ شامل تھے۔"

(۷) دارچینی[۵۱] (Malabathrum) کے ذکر میں لکھتا ہے کہ یہ اہل روما کے ہاں خوشبوؤں میں بہت کثرت سے استعمال ہوتی تھی، اور یہ کہ اس کی خوشبو قریب قریب ایسی تھی جیسی نارڈ میں ہوتی ہے۔

(۸) ریشمی[۵۲] کپڑوں کے بیان میں اسی پلنی کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ "عیش پرستی اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ اگر کسی ہار میں صرف نارڈ کے پتے ہی پتے نہ گندھے ہوئے ہوں تو اس کی کوئی قدر نہیں ہوتی، ابھی قریب ہی زمانے سے وہ ہندوستان سے بلکہ وہاں سے بھی اور دور سے منگائے جاتے ہیں۔ جن ہاروں میں نارڈ کے پتے لگے ہوئے ہوں اُن کو بہترین تحفہ خیال کیا جاتا ہے ...... آخر ہمارے ہاں کی عورتوں کی عیاشی اور نفاست پسندی اسی حد کو پہنچ گئی ہے!"

## (ب) اسپائک نارڈ:-

(۱) خوشبودار[۵۳] گلگونوں اور اُبٹنوں کے بیان میں لکھتا ہے کہ ملک پارتھیا کے بادشاہوں کے لئے جو گلگونے اور اُبٹن تیار کئے جاتے تھے ان میں علاوہ اور خوشبوؤں کے اسپائک نارڈ بھی شامل تھا۔

(۲) اسپائک[۵۴] نارڈ پر نوٹ ہے کہ :- "نارڈوسٹیکس جٹاماسی (Nardostachys Jatamansi) یہ کوہ ہمالیہ کے پُر درخت علاقہ کی ایک سدا بہار بوٹی ہے۔ یہ علاقہ گڑھوال تک پہنچتا ہے اور علم میں سترہ ہزار فٹ کی بلندی تک ہے" پھر واٹ کے حوالہ سے لکھتا ہے:- "اس بوٹی کی جڑ ایک گرہ سی ہوتی ہے جس میں سے اور بہت سی چھوٹی چھوٹی جڑیں نکل کے ہر طرف پھیلتی ہیں۔ اس کی موٹائی چھوٹی انگلی کی سی ہوتی ہے، اور اس کے اردگرد سرخی مائل بھورے ریشے ہوتے ہیں۔ خوشبودار اور تلخ ہوتی ہے۔ اس میں سے تیل بھی نکلتا ہے۔ ہندوستان میں دوائی کے روغنوں میں عموماً اس کی زمین دی جاتی ہے، اور وہاں کے لوگوں کا عام خیال ہے کہ اس کے استعمال سے بال بڑھتے ہیں اور سیاہ رہتے ہیں" اس کے بعد پلنی کا یہ قول نقل کیا ہے "نارڈ کے پتوں کی قیمت اُن کی مقدار کے مطابق کم و بیش ہوتی ہے۔ اس کی جو قسم ھادروسفیرم (Hadrosphaerum) کہلاتی ہے اور جس کے پتے بڑے بڑے ہوتے ہیں، [illegible] دینار فی رطل کے حساب سے فروخت ہوتی ہے، اور جس کے پتے چھوٹے ہوتے ہیں اُسے [illegible]

---

[۵۱] صفحہ ۲۱۷ - [۵۲] صفحہ ۲۶۵ - [۵۳] ۱۱۲ - [۵۴] صفحہ ۱۸۸ -

(Mesosphaerum) کہتے ہیں اور وہ ساٹھ کے حساب سے بکتی ہے۔ لیکن اس کی بہترین قسم وہ سمجھی جاتی ہے جس کو مائکروسفیرم (Microsphaerum) کہتے ہیں، اور جس کے پتے بہت ہی چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔ اُس کی قیمت پچھتر دینار فی رطل ہے۔ نارڈ کی ان سب قسموں میں نہایت خوشگوار خوشبو ہوتی ہے، اور جب یہ تازہ ہوتے ہیں تو نہایت تیز ہوتی ہے۔ پُرانی نارڈ اور خصوصاً وہ جو سیاہ ہو بہترین خیال کی جاتی ہے۔"

اس کے بعد کہتا ہے کہ پلینی کے قول کے مطابق اہل روما کے ہاں اسپائکٹ نارڈ کا اُبٹن اور گلگونہ بہترین چیز سمجھا جاتا تھا۔

انجیل مقدس میں مرقس باب ۱۴۔ آیت ۳ تا ۵ میں ایک خوشبوؤں کے بکس کا ذکر ہے جس میں سُنبل کا اُبٹن بھی تھا۔ اور جس کی قیمت وہاں اُن دنوں تین سو دینار فی رطل تھی!

(۳) صفحہ ۲۵۱ پر ایک[۵۱] یونانی سیاح کوس ماس انڈیکو پلوسٹیز Cosmas Indicopleustes کی شہادت موجود ہے کہ اُس نے ہندوستان کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ "وہ ہندوستان (سندھ) جہاں مُشک اور سُنبل پیدا ہوتا ہے"۔

(۴) مشہور سیاح مارکوپولو[۵۲] (Marco Polo) ملک مالابار کے حال میں لکھتا ہے کہ "اس ملک میں ریشمی اور طلائی کپڑے، سونا، چاندی، لونگ، سنبل اور طرح طرح کے مصالحے آتے ہیں"۔

اب ہم عربوں کو لیتے ہیں۔ اس ضمن میں علامہ[۵۳] ابن بیطار کی کتاب المفردات ہی کا مطالعہ کافی ہوگا۔ اس کتاب کی تیسری جلد[۵۴] میں سنبل کے بیان میں لکھتے ہیں:۔

"**سُنبل**:۔ اس کی تین قسمیں ہیں: ہندی، رومی اور جبلی (پہاڑی) سب سے پہلے ہم سُنبل الطیب یعنی ہندی سے شروع کرتے ہیں۔ یہی عصافیر ہے۔ دیسقوریدوس[۵۵] اس کو ناردین کہتا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں ایک کو ہندی اور دوسری کو سوری کہتے ہیں۔ اُسے سوری اس وجہ سے نہیں کہتے کہ وہ سوریا میں

---

[۵۱] صفحہ ۲۵۲۔ [۵۲] مارکوپولو۔ اٹلی کے شہر وینس کا باشندہ تھا ۱۲۵۶ء میں پیدا ہوا تھا اور چین، ہندوستان وغیرہ مشرقی ممالک میں خوب گھوما تھا۔ عموماً اس کے اقوال اور بیانات نہایت معتبر خیال کئے جاتے ہیں ۱۳۲۳ء میں فوت ہوا۔ [۵۳] یعنی ضیاء الدین ابو محمد عبداللہ ابن احمد الاندلسی المالقی۔ [۵۴] صفحات ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ مطبوعہ قاہرہ (مصر) ۱۲۹۱ھ۔

[۵۵] مشہور یونانی حکیم و طبیب (Dioscorides) ہے۔ اس سے عرب بہت مستفید ہوئے ہیں۔

پائی جاتی ہے، بلکہ اس لئے کہ جس پہاڑ میں ہوتی ہے وہ سوریا کے قریب ہے۔ اس کی ایک اور قسم وہ ہے جو بلاد ہند کے قریب کے ملکوں میں ہوتی ہے سوری قسم میں بہترین وہ ہوتی ہے جو تازہ، خفیف، گچھے دار بھوری نہایت خوشبودار ہوتی ہے اور اس کی خوشبو سعد کی سی ہوتی ہے، اُس کی بالیں چھوٹی چھوٹی اور کڑوی ہوتی ہیں، اور زبان کو خشک کرکے اینٹھا دیتی ہے۔ منہ میں رکھنے اور دیر تک چبانے سے بہت اچھی خوشبو نکلتی ہے۔ پھر ہندی قسم کی دو قسمیں ہیں ایک وہ ہے جسے غامغیطس کہتے ہیں، اور اس کا یہ نام اس لئے ہو گیا ہے کہ جس پہاڑ کے قریب یہ پیدا ہوتی ہے اُس طرف ایک ندی بہ کر جاتی ہے جسے غیغیطس کہتے ہیں اور اُسی کے قریب یہ ہوتی ہے۔ چونکہ اُن مقامات میں رطوبت ہے اس لئے اس کی قوت کم ہوتی ہے، مگر زیادہ لمبی ہوتی ہے اور بالیں زیادہ ہوتی ہیں۔ اس کی بالیں ایک ہی مخرج سے نکلتی ہیں اور اُس میں بہت سے گچھے ہوتے ہیں جو ایک دوسرے پر لپٹے ہوئے اور کسی قدر بدبودار ہوتی ہیں اسی کی اور قسم وہ بھی ہے جو پہاڑ کے اندر پائی جاتی ہے۔ وہ اس مذکورہ بالا قسم سے بہتر اور زیادہ خوشبو ہوتی ہے، اس کی بالیں چھوٹی اور خوشبو سعد کی سی ہوتی ہے۔ اس میں ناردین سوری کی تمام صفتیں پائی جاتی ہیں۔

"اس کے علاوہ ایک اور بوٹی ہے جسے ناردین سقاریطیقی کہتے ہیں۔ اس کا نام بھی اُن مقامات کے نام کی وجہ سے ہو گیا ہے جہاں وہ پیدا ہوتی ہے اور بکثرت ہوتی ہے۔ اس میں بہ نسبت اُن قسموں کے جو ہم پہلے بیان کر آئے ہیں سفیدی زیادہ ہوتی ہے۔ اُس کے بعض پودوں میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اُس کے درمیان میں ایک اور تنہ ہوتا ہے۔ اس کی خوشبو بیلش[1] کی سی ہوتی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اس قسم کو چھوڑ دیا جائے"

"اکثر ناردین اس طرح بکتی ہے کہ اُسے پانی سے دھوکر صاف کر دیا جاتا ہے اور اسی سے اُس کی بالوں کی سفیدی اور لمبائی کا اندازہ ہوتا ہے، کیونکہ اُس پر سے مٹی ہٹ جاتی ہے۔ کبھی ایسی حالت میں ملتی ہے کہ پانی میں سُرمہ اور شکر ملا کر اُس پر لگا دیا جاتا ہے تاکہ وہ جم جائے اور بھاری ہو جائے۔ چاہئے کہ ضرورت کے وقت اُسے خوب دیکھ لیا جائے اور اگر اُس کی جڑوں میں کچھ لگا ہوا ہو تو اُسے خوب صاف کر دیا جائے، کیونکہ وہ ہاتھ دھونے کے لئے بہت عمدہ چیز ہے۔

"جالینوس کا بیان ہے کہ یہ درجہ اول میں گرم اور درجہ دوم میں خشک ہے اس کا جوہر قابض کثیر المقدار ہے اور جوہر حار تیز ہے مگر کثیر المقدار نہیں ہے ...... اور چونکہ وہ ان قویٰ سے مرکب ہے اس لئے ضروری ہے کہ اسکا پینا جگر[2] اور خم معدہ

---

[1] ایک زہریلی گھاس ہے۔ [2] تب تو کچھ تعجب نہیں کہ محبوبوں سے سنبل تاباں عاشقوں کے دل و جگر کو تسکین پہنچے۔ بشرطیکہ پلا دیا جائیں!

فائدہ دے۔ اور اگر اُسے خارجی طور پر رکھا جائے تو مدّر ہوتی ہے۔ یہ معدہ کی سوزش کو بھی فائدہ دیتی ہے، اور معدہ اور آنتوں میں
جو مواد اُتر آتا ہے اُسے خشک کرتی ہے۔ اسی طرح جو مواد سر اور سینے میں جمع ہو جائے اُسے بھی نفع بخشتی ہے۔
"اس بارے میں قوی ترین سُنبل وہ ہے جسے سُنبل ہندی کہتے ہیں، اور اُس میں سُنبل رومی سے زیادہ سیاہی ہوتی ہے"
اسکے بعد ابن بیطار نے اُسی دیسقوریدوس کے حوالہ سے اِسے (۱) مسخن (۲) میبس (۳) مُدرّ بول (۴)
قاطع النزف (۵) زخموں کے لئے مجفف الرطوبۃ (۶) غشیان اور خفقان کے لئے مسکّن (۷) قاطع نفخ (۸) دافع یرقان
(۹) گُردہ کے لئے مفید (۱۰) اَورامِ حارّہ کے لئے فائدہ مند (۱۱) پلکوں کے گر جانے کو روکنے والی وغیرہ بتایا ہے
اور کہتے ہیں کہ یہ معجونوں اور آنکھوں کی دوائیوں میں بھی مستعمل ہے۔ اسکے بعد لکھتے ہیں کہ "وہ دوا جسے ناردین اقلیطی
کہتے ہیں، وہ سنبل رومی، سنبل اقلیطی اور منحوشہ ہے" پھر اسکے بعد ہی دوبارہ دیسقوریدوس کا یہ بیان نقل کرتے ہیں:۔
"یہ اُس مُلک میں پیدا ہوتی ہے جسے لیغوریا کہتے ہیں، اور خود وہاں کے باشندے اُسے الیی لیغفا کہتے ہیں اور
یہ سوریا میں بھی ہوتی ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی بوٹی ہوتی ہے بعض دفعہ اُس کی جڑ سمیت اُکھاڑ لیا جاتا ہے۔۔۔۔۔۔
اسکے پتّے لمبے لمبے ہوتے ہیں، رنگ بھورا ہوتا ہے اور اس کا شگوفہ زرد ہوتا ہے۔ اُس میں سے صرف اُس کا تنہ اور جڑ استعمال
میں آتی ہے، اور ان میں بہت اچھی خوشبو ہوتی ہے اور فائدہ مند چیزیں ہیں۔ کرنا یہ چاہئے کہ پہلے ایک دن ایک مُٹھی بھر لیکر
اسکی مٹی صاف کر کے کاغذ میں لپیٹ کر کسی بھیگی ہوئی جگہ میں رکھ دیا جائے پھر دوسرے دن اُسے صاف کیا جائے کیونکہ ابھی تک
اُسکے بھلے بُرے کی تمیز نہیں ہو سکتی اور اسکے ساتھ اور بھی کچھ لکڑیاں ایسی لگ جاتی ہیں جو اپنی بو کی وجہ سے بیش سے مشابہ بتائی
جاتی ہیں اور اُن کو پہچاننا آسان ہے۔ پہچان یہ ہے کہ اُن میں ڈنڈیاں نہیں ہوتیں اور اُن کے پتّے اصلی اقلیطی ناردین کے
پتّوں سے چھوٹے ہوتے ہیں، اور اُن میں وہ تلخ جز اور عمدہ خوشبو بھی نہیں ہوتی۔۔۔۔۔۔ ان سب میں بہترین وہ قسم ہے
جو تازہ، خوشبو اور گچھے دار ہو۔۔۔۔۔۔ جس دوا کا نام ناردین جبلی ہے اُسے بعض لوگ بولا قیطس اور بلیرس بھی
کہتے ہیں۔ وہ قلیقیا اور سوریا میں ہوتی ہے۔ اس کا پتہ اور شاخ ترسمنہ کے سے ہوتے ہیں: صرف اتنا فرق ہے
کہ یہ زرد ہوتی ہے اور کھردری اور کانٹے دار نہیں ہوتی۔ علاوہ اس کے اُس میں دو جڑیں ہوتی ہیں؛ بلکہ زیادہ، اور اُس میں
سیاہی اور خوشبو بھی زیادہ ہوتی ہے"
غالباً سنبل کا یہ بیان کافی ہوگا

محمد نعیم الرحمان

# غبِ شب

فیروزہ کے باپ سعید خاں فوج میں پنجہزاری رسالدار تھے۔ خاندان مغلیہ کا آخری تاجدار صبح کا ستارہ بنا ہوا تھا۔ دربار کی زبان فارسی تھی مگر فوج کی بات چیت اردو میں ہوا کرتی تھی۔ اس سادہ زبان کی لڑیوں میں عربی فارسی ہندی اور بھاشا کے انمول جواہر پروئے جاتے تھے۔ تاکہ افغان۔ عرب۔ ایرانی۔ راجپوت۔ سکھ سب ایک دوسرے کی سمجھ سکیں اس وقت کا ہندوستان آج کے ہندوستان کے سامنے کچھ بھی نہ تھا۔ کاغذی رسالوں کی یہ بھرمار جو آب ہے نہ تھی۔ تعلیم بھی عام نہ تھی۔ مگر جتنی تعلیم ہوتی تھی پوری ہوتی تھی ادھوری نہیں۔ صنعت و حرفت شیطنت و حکمت کی یہ گرم بازاری نہ تھی فیکٹری۔ ریل۔ موٹر۔ ٹریموے۔ ہوائی جہاز ان کا نام بھی کوئی نہ جانتا تھا۔ کھانے پینے کی چیزیں غیر ملکوں سے اتنے قسموں کی اور اتنی زیادہ نہیں آتی تھیں۔ مگر لوگ تھے ایماندار اور چیزیں گھر کی گھر ہی میں رہتی تھیں۔ پانچ روپیہ کی آمدنی والا اپنی بیوی بچوں سمیت ایسی شان سے رہتا تھا جو آج ۵۰ روپیہ پانے والوں کو بھی میسر نہیں ہے۔

سعید خاں نہایت سج دھج کے پٹھان تھے۔ عہدہ بھی بہت اونچا تھا۔ گھر میں خدا کا دیا سب کچھ موجود تھا۔ لڑکے بھی کئی ہوئے مگر جسکی امانت تھے اُس نے جب چاہا لے لیا۔ اب خاں صاحب کی عمر ۶۰ سے اونچی ہو چکی تھی میاں بیوی کے بڑھاپے کا سہارا، آنکھوں کا تارا، پندرہ برس کی اکلوتی لڑکی فیروزہ تھی۔ اُس کی شادی کے چرچے ٹولے محلے میں دن رات ہوا کرتے تھے مگر خانصاحب کی شرط ایسی ٹیڑھی تھی کہ لوگ نسبت کے پیام بھیجتے ہوئے کانپ کانپ جاتے تھے۔ شرط یہ تھی کہ دولھا سچی اُردو کا معیار بتا سکے۔

مثل مشہور ہے کہ سورج بادلوں میں نہیں چھپتا۔ درخت کی گھنی ہوئی پتیاں۔ چاندنی کو روک نہیں سکتیں۔ انبیا بوری اور کوئل نے کوکو مچادی۔ بیر پھلے اور ڈھیلے چلے۔ دور دور سے نسبت کے پیام آنے لگے۔ کانپور۔ آگرہ پیشاور۔ اعظمگڈھ۔ حیدرآباد۔ لکھنؤ۔ لاہور۔ بدایوں۔ الہ آباد۔ بھوپال۔ علیگڈھ۔ دہلی۔ امرتسر۔ کشمیر۔ تمام سے خطوط چلے۔ مگر بعض ہرکاروں کے نذر ہو گئے اور بعض بغیر پڑھے ہوئے ردی کی ٹوکری میں پھینک دئے گئے۔ بعض خطوں کے ساتھ ہندی، انگریزی، روغنی، سادی، ہنسکھہ اور روانی تصویریں بھی نتھی رہتی تھیں مگر بہت کم

ایسی تھیں جن سے دل و دماغ کو لطف مل سکے۔ بہر حال چند خطوں کے نمونے آپ بھی دیکھئے۔ حضرت ذرا آنکھیں بند کرکے بس طے کر لیجئے کہ ہم آپ دونوں نیروزہ کی خواب گاہ کو چلمن کی آڑ سے دیکھ رہے ہیں

جادو محل

(آہنی قلم میں)

"میری ادب نوازی کا حال ہندوستان کے کہنہ مشق اکہنہ دماغ اکہنہ خیال اشخاص سے پوچھ لیجئے "بزرگی بسال است" کا مقولہ مجھ پر صادق آتا ہے، مجھکو شجرہ بھی بہت یاد ہیں جو ادارہ ادبیہ کے بیش بہا جواہر ہیں"

نیروزہ اس خط کو دیکھتے ہی رحم بھری ادا سے مسکرائی اور "بڑھاپے کی لنک" کہہ کر مومی بتی کی لو سے لگا دیا۔

مجلہ عروس

(بیروت کے ٹائپ میں)

"میں تواب التحریر ہوں مجھکو غیر مرئی ذرات کے التہاب امتزاجی کا ارتعاش لطیف ارتقاء ادب کی ...... بلند ترمنازل ——— پر پہونچا دیتا ہے۔ میرے ایک خاص دوست * * * * عربی میں مایۂ ناز دستگاہ رکھتے ہیں۔ میں اپنے سامنے ——— نہیں سمجھتا میرا نظریہ مخصوصہ یہ ہے کہ بہت سے دماغ اور قلم میرے لئے تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے ——— ہیں ——— سو ——— جس چیز کو چاہوں اپنی کر دکھاوں — میں ——— اعتراف گناہ — سے متعرض نہیں مگر رسن بسوخت و شکنج نہ رفت کے ساتھ"

نیروزہ کی تیوریوں پر بل آگئے اور انگلیوں نے بلا قصد عریضہ ادب کو معہ لفافہ کے دھجیاں کر دی

فسانہ خانہ

میرا من تیرے پریم میں اُداس رہتا ہے۔ میں جب تیرے دھیان میں آسنی جاتا ہوں تو سُمدرک اپسرا کی شکل میری آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے۔ میرا سنگھی مجھکو زمانہ میں چمکائے ہوئے ہے۔ میں اُردو لکھنے پڑھنے والوں کا دل نقدی سے بھی بڑھاتا رہتا ہوں۔

نیروزہ کے ہونٹ قہقہہ کے ساتھ کھل گئے اور اسقدر کہ دو ہلالوں کے دائرے نے چودھویں کا ایک چاند بنا دیا اور یہ خط ایک کنارے ڈالدیا گیا۔

**ستارہ گھر**

میرا ہر لفظ بلکہ ہر حرف اردو کی حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے۔ ظرافت میری فطرت میں ہے موقعہ ہویا نہو اپنے دوستوں کی تالیف قلوب کے خاص رنگ میں ضرور لکھتا ہوں۔ میں ایسے خطہ میں رہتا ہوں جو مردم خیزی میں شیراز سے کم نہیں ہے۔

فیروزہ کی زبان سے بے اختیار نکلا " اتنا تو کافی نہیں ہے " اور خط پر سیاہ صلیب جلوہ گر تھی۔

**نگار نفسیات!**

نسائیات کا پیکر سیمیں۔ جوشش لرزاں کے ساتھ سجدہ نیاز اور پرستش غلوص!!

مَیں میکدۂ ادبیات میں کیفیات خمریات و خرابیات کا مست شباب واحد جرعہ کش ہوں میری تعلیمات و تربیات ناطورہ فطرت نے کافرہ درسیات و باغیانہ عمریات سے دامن بہ کنار رکھا ہے میری سرشت مستی باغوش وعریانی بہ کنار۔ سیماب وشی تقلیدات وعصمت نگاہی نقلیات اپنا ماحول مقدم جانتی ہے زمانہ کی ترشیاں میرے نسخہ الوہیات کو پانی بھرا رہی ہیں مگر بتدریج "طبیعت"

فیروزہ کے چہرہ پر حقارت کے آثار نمایاں ہوئے اور پورا خط کمرہ ور پیمانہ کی طرح چور چور تھا۔

**چورنگ پور**

مجھکو تراجم کا مالیخولیا ہے۔ میری سبک تحقیق میں دولابہ اصطرلابی اور آلمقیاس الحرارہ وغیرہ کے لالی مکنون بصارت فروز رہتے ہیں۔

فیروزہ نے "معلوم شد" کہہ کے اس ایک خط کو بھی چورنگ کر دیا۔

**املی کدہ**

میرے ادب میں مذہب و تواریخ کا پہلو بہت نمایاں رہتا ہے۔ محیر العقول چیزیں احاطہ ترقیم میں مجال دخل نہیں پاتیں۔ شعر فہمی اور انتخاب غیر فطری طور پر میرا حصہ ہیں میری تصنیف و تالیف کا بہترین حصہ کتب قدیمہ و مجلہ ہائے حاضرہ ترکیہ و عربیہ کا شرمندہ ہے۔

فیروزہ کی روشن خیالی نے اس بدوی مذاق کو نہایت بے نیازی سے السلام کہا اور دوسری طرف متوجہ ہوگئی۔

وارالانشائے لطیف

مختصر فسانوں میں مجھکو ید طوبیٰ بلکہ ید بیضا ہے - فرانسیسی - بنگالی - لاطینی اور انگریزی روش مرغوب ہے علمی باتوں سے بھی نفرت نہیں مگر اصلیت کی جھلک بھی نہ ہو اور کوئی خاص فائدہ نہ ہو سکے میں تلون طبع ضرور ہوں - مگر نئے رنگ میں اس طرح ڈوب جاتا ہوں جیسے گرگٹ شریف -

فیروزہ نے اس تحریر کو بھی دامن مجنوں بنا دیا -

آخری خط نہایت سادہ کاغذ پر تھا - شان تحریر بھی کچھ ایسی اچھی نہ تھی مگر جانے کیا بات تھی کہ لفظ لفظ پر فیروزہ کا رنگ ومکتا جاتا تھا -

قیصر آباد

"میری اردو ہندوستانیوں کی بول چال ہے - مجھکو کسی فرقہ سے کوئی خصوصیت نہیں ہے - میرے نزدیک بُرائی جہاں کہیں ہو بُری ہے، بھلائی جس چیز میں ہو بھلی ہے - میرے کسی حرف کا مطلب کبھی یہ نہیں ہوتا کہ کسی کا دل دُکھے - مگر مجھکو ہٹ دھرمی اور سچائی کے چھپانے سے بَیر ہے"

فیروزہ نے اس خط کو کئی بار پڑھا - نرگسی آنکھیں پھریں - نازک انگلیوں کو جنبش ہوئی اور دو صاد ص بنا دیے گئے -

اندھیرے مُنہ، سورج کی پہلی کرن اس خط پر پڑی، خط کے حروف نورانی بن گئے ص کے حلقے چمکنے لگے اور فیروزہ چودھویں کا چاند بن گئی -

دولھا تاروں کی چھاؤں میں، فیروزہ، اردو کی متوالی فیروزہ کو بیاہ لایا اور دونوں پھلے پھولے -

کہئے کچھ سمجھ میں آیا ؟

---

## قطعہ تاریخ وفات لسان العصر حضرت اکبر مرحوم الہ آبادی

"غیبی"

زمرگ سید اکبر حسین سحر بیان شد است قوم ہمہ مبتلائے رنج و ملال

سروش غیب مرا زد ندا کہ اے طاہر بگو - سخنور قومی بمردہ وائے - بسال

طاہر جودھپور

# خان بہادر

(۱)

سید فصاحت حسین تھے تو انسپکٹر لیکن درجہ اول کی کوتوالی پر تعیناتی کی وجہ سے آنریری ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ بنادیے گئے تھے۔ پولیس میں کانسٹبل کی حیثیت سے بھرتی ہوئے۔ لیکن اپنی کارگزاری سے بیس برس کے عرصہ میں اس عہدہ پر پہونچ گئے۔ پڑھے لکھے تو بہت کم تھے لیکن اس پر بھی اپنے ماتحتوں پر اپنی علمیت کا سکہ بٹھائے تھے۔ جب سے انگریزی میں صرف "یس" "نو" لکھنا سیکھ گئے تھے اس وقت سے تو اور بھی اپنی قابلیت کے آگے کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ دن رات آپ وردی پہنے رہتے تھے شاید اس میں ان کی کوئی خاص مصلحت تھی ورنہ کچھ بیڈول ہونے کی وجہ سے جب وہ وردی پہن لیتے تھے تو اور بھی برے لگتے۔ رشوت بھی لیتے تھے مگر اس شان سے کہ حکام بالا تک اس کی خبر نہ پہنچتی۔ تحریک عدم تعاون کے زمانہ میں سیاسی لیڈروں کی گرفتاری میں آپ نے نہایت استقلال سے کام کیا تھا جس میں خاص شہرت ہوگئی تھی۔ حکام کی حضوری میں وہ اپنے پیدا کرنے والے کو بھی بھول گئے تھے۔ مگر ان کو اس بات کا نہایت قلق تھا کہ اتنی خوشامد اور چاپلوسی پر بھی سرکار نے انھیں کوئی خطاب نہیں دیا تھا۔ جب تحریک عدم تعاون کا جنازہ نکل چکا تو کوتوال صاحب کو امید ہوئی کہ اب وہ ضرور کوئی خطاب پا جائینگے۔ جنوری کا مہینہ جُوں جُوں قریب آتا جاتا تھا ان کی بیتابی بڑھتی جاتی تھی۔ خطاب ملنے کی لالچ میں انھوں نے معزز افسروں کا تو کیا ذکر ان کے خادموں کو بھی ڈالیاں نذر کیں۔

(۲)

آج نوروز ہے کوتوال صاحب حکام ضلع کی سلامی سے فراغت پاکر اپنے کمرے میں آرام کرسی پر دراز ہیں، سگریٹ پیئے جاتے ہیں اور اس کے دھوئیں سے جو منہ اور نتھنوں سے نکل رہا ہے دل بہلاتے جاتے ہیں، چہرہ کے اُتار چڑھاؤ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کسی فکر میں مبتلا ہیں۔ کوتوالی کے چودھری یعنی دیوان جی کمرہ میں داخل ہوئے بڑے ادب سے سلام کیا اور کہا "حضور کو "خان بہادر" کا خطاب مبارک ہو۔ یہ کہہ کر دیوان جی نے گزٹ جس میں خطاب پانے والوں کے نام لکھے ہوئے تھے کوتوال صاحب کے سامنے رکھدیا۔

کوتوال صاحب مارے خوشی کے جامہ سے باہر ہوگئے انھوں نے گزٹ کو بڑی مضبوطی سے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ "کہاں لکھا ہے...... دکھاؤ! دکھاؤ! - واللہ سرکار نے میرے ساتھ انصاف کیا..... مگر میں انگریزی میں اتنا باریک خط نہیں پڑھ سکتا۔ میری عینک اس وقت میرے جیب میں نہیں ہے اور تم بھی انگریزی نہیں جانتے۔ انگریزی نہ پڑھنے کا اگر افسوس ہوا تو آج ہوا۔ خیر کسی انگریزی داں داروغہ کو بلاؤ۔" کوتوال صاحب انتہائے مسرت سے پاگل ہو رہے تھے، دیوان جی ان کی حالت دیکھ کر مسکرائے اور داروغہ جی کو بلانے کے لئے کمرہ سے باہر نکلے ابھی وہ دس قدم بھی گئے ہونگے کہ کوتوال صاحب دوڑتے ہوے اُن کے پاس سے یہ کہتے ہوئے "دیوان جی ٹھہرو میں خود پڑھائے لاتا ہوں"، آگے نکل گئے۔ جس عزت اور ادب سے وہ اس وقت گزٹ کو ہاتھ میں لئے ہوئے تھے شاید انھوں نے اس سے زیادہ وقعت سے کلام پاک کو بھی نہ اُٹھایا ہوگا۔ انگریزی داں داروغہ نے گزٹ پڑھا۔ خان بہادری کے خطاب پانے والوں میں سید فصاحت حسین آزیری ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کا بھی نام لکھا ہوا تھا۔ چاروں طرف سے "مبارک" کی صدائیں آنے لگیں۔ جب دوستوں سے چھٹی ملی تو سیدھے سپرنٹنڈنٹ صاحب بہادر کے پاس پہونچے۔ صاحب نے آج دوبارہ ان کو اپنے بنگلہ پر دیکھ کر کہا "وِل کوتوال صاحب کیا بات ہے"

کوتوال صاحب نے تن کر سلام کیا اور کہا "کیا حضور نے آج کا گزٹ نہیں ملاحظہ فرمایا جس میں سرکار نے مجھے خان بہادری کا خطاب مرحمت فرمایا ہے۔"

**صاحب**۔ خان بہادر ہوگیا میں نے ابھی تک نہیں دیکھا۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔

**کوتوال صاحب**۔ یہ سب حضور کی مہربانی اور سفارش کا اثر ہے جس کا میں شکریہ ادا کرتا ہوں۔

**صاحب**۔ میرا شکریہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں آپ گورنمنٹ کا شکریہ ادا کیجئے جس نے ایسا معزز خطاب آپ کو عطا کیا سچ پوچھئے تو میں نے آپ کے لئے کوئی سفارش بھی نہیں کی تھی۔

**کوتوال صاحب** "حضور بھی تو سرکار کے کارپرداز ہیں"

صاحب کو سلام کرکے جب وہ مکان واپس ہوئے تو بیگم صاحبہ نے بھی مبارکباد دی۔

کوتوال صاحب نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کڑک کر کہا "سنو بیگم مجھے کوئی معمولی خطاب نہیں ملا۔ ہے میری خواہش ہے کہ میں اس خوشی میں دعوت کروں جس میں اپنے تمام حکام اور احباب کو بلاؤں۔

بیگم نے ناک بھوں چڑھا کر جواب دیا۔ اچھے آئے دعوت کرنے والے۔ آپ کے تو دوست احباب سب

آئیں اور میری سہیلیاں کہاں جائیں۔

**کوتوال صاحب۔** ہاں ہاں ان کو بھی بلاؤ منع کون کرتا ہے اب اس سے بڑھکر خوشی کا کون موقع ہو سکتا ہے۔

بیگم صاحبہ نے پھر دریافت کیا "اچھا اس خطاب کے ساتھ آپ کو سرکار کتنا روپیہ انعام دیگی۔

کوتوال صاحب نے جواب دیا "ہش پگلی! کہیں خطاب میں روپیہ بھی ملا کرتا ہے؟

**بیگم۔** اگر روپیہ نہیں ملتا تو پھر کیا ملتا ہے۔

**کوتوال صاحب۔** ایک کاغذ اور ایک تمغہ۔

بیگم صاحبہ نے جھنجھلا کر کہا۔ تو میں ایک کاغذ اور تمغہ کے لئے اتنا ہلڑ نہ ہونے دوں گی۔ خالی خولی خطاب سے کیا ہوتا ہے۔

کوتوال صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ارے خطاب سے بڑی عزّت اور شہرت ہوتی ہے خطاب کا ملنا کوئی معمولی بات نہیں ہے اب میری عزّت دربار میں بہت بڑھ جائیگی۔ لاٹ صاحب مجھے کُرسی دیں گے۔ اتنا کہہ کر کوتوال صاحب نے بیگم کا ہاتھ پکڑ کر بڑے پیار سے کہا "خوشی کرو خوشی۔ اب تم کو تمام دنیا "خان بہادرن" کہے گی اور مجھکو "خان بہادر"۔

(۳)

آج کوتوال صاحب کے ہاں حکام ضلع و رؤساء شہر کی دعوت ہے۔ کوتوالی کے صحن میں بڑا عالی شان شامیانہ نصب کیا گیا۔ بلیوں پر ریشمی جھالریں لٹکائی گئیں۔ جھاڑ۔ فانوس سے شامیانہ کو زینت دی گئی۔ کوتوال صاحب جلسہ کا انتظام کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ خوشی میں ساتھ دینے والے اور مصیبت میں دشمن بن جانے والے پولیس کے اہلکار ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے قلیوں اور مزدوروں سے چلاّ چلاّ کر کام لے رہے تھے۔

ہندوستانی کھانوں کے علاوہ انگریزی کھانوں کا بھی خاص اہتمام کیا گیا تھا نفیس ولایتی شراب بھی صاحب لوگوں کے لئے منگائی گئی تھی۔

۱ا بجے کے قریب صبح کی ڈاک آئی آج ہفتہ واری گزٹ بھی آیا تھا اس کو دیکھ کر کوتوال صاحب کو خیال گذرا "کہیں خطاب کے ساتھ میرا درجہ بھی تو نہیں بڑھ گیا" اس خیال کے آتے ہی فوراً انگریزی داں داروغہ جی بُلائے گئے۔ گزٹ اُردو میں بھی چھپتا ہے لیکن کوتوال صاحب یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ انگریزی بھی جانتے ہیں گزٹ

انگریزی ہی میں منگاتے تھے جب داروغہ جی آگئے تو گزٹ کھول کر پڑھنے لگے۔ گزٹ کے پہلے ہی صفحہ پر جلی قلم سے لکھا تھا

## تصحیح

"گذشتہ گزٹ میں سید فصاحت حسین صاحب آنریری ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کا نام غلطی سے خان بہادر کا خطاب پانے والوں کی فہرست میں درج ہو گیا تھا۔ لہذا بذریعہ اس حکم کے اطلاع دیجاتی ہے کہ مناسب تصیح کر لی جائے۔"

کوتوال صاحب یہ خبر سُنکر بدحواس ہو گئے آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا سر پکڑ کر بیٹھ گئے عیش و خوشی کا جلسہ درہم برہم ہو گیا اس گزٹ نے جس نے کبھی کوتوال صاحب کو آرام کرسی سے اُٹھا کر عالم خوشی میں نچادیا تھا آج رنج و غم میں کرسی سے نیچے گرا کر سرنگوں کر دیا۔

اعظم کُریوی

---

## جذباتِ محمود

صبح جو ہم دیر تک حُسنِ سحر دیکھا کئے
کیا کہیں کیا چیز تا حدِ نظر دیکھا کئے

تابعِ فرماں تھی اس درجہ ہماری چشم شوق
جس طرف اُن کی نظر اُٹھی اُدھر دیکھا کئے

بن رہی تھیں چہرۂ گُل پر سُنہری دھاریاں
دیر تک ہم بھی یہ اعجازِ سحر دیکھا کئے

جلوۂ دیدار سے اتنی بڑھی تھی محویت
جانے والے جا چکے ہم رہگذر دیکھا کئے

ایک تم ہو جو نہ آنا تھا نہ آئے عمر بھر
ایک ہم ہیں جو تمھاری رہگذر دیکھا کئے

جس کو دیکھا ششدر و حیراں تھا بزم زیست میں
ہم یہ عالم محویت کا عمر بھر دیکھا کئے

ناوک افگن تیری چٹکی کے تصدق جائیے
سب معالج میرا ہی زخم جگر دیکھا کئے

گوہر مضموں کی تھی محمود اس درجہ چمک
انجمن میں جتنے تھے عالی گہر دیکھا کئے

---

# حضرت نوح ناروی

حضرت نوح ناروی زمانہ حاضرہ کے ایک باکمال شاعر ہیں۔ تغزل کا قدیم رنگ آج ہندوستان سے کب کا مٹ گیا ہوتا۔ تلامذۂ داغ و امیر کو خدا خوش رکھے۔ ان کی بدولت اردو کی روایات قدیمہ محفوظ ہیں۔ اگرچہ نئی روشنی کے جاں نثاروں نے ان محترم ہستیوں کو کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ ان غریبوں کی قدامت پرستی ایک ایسا جرم ہے جو عفو و کرم کی بندشوں سے آزاد ہے۔

نوح صاحب کی شاعری خالص ایشیائی ہے۔ وہ زمانہ کی نیرنگی سے بے نیاز، ایک مستقل دائرہ پر ہے۔ آج کل ملک کے نوجوانوں میں یہ وبا پھیلی ہوئی ہے کہ ہر قدیم رنگ کا شاعر "فطرت" سے معرا اور مبالغہ وغیرہ کے پھندوں میں پھنسا ہوا ہے۔ ان کے نزدیک تخیل ہی شاعری کا رکن اعظم ہے، شوکت الفاظ تو الی اضافات محاسن کلام میں سے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ جدید رنگ کے اکثر شعرا کی جولان گاہ تراکیب کی ندرت اور الفاظ کی اہمیت تک محدود ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ تخیل حدود شعر سے آزاد ہے۔ عربی منقدین کے نزدیک شاعری کی ترکیب عنصری محض تخیل و محاکات سے ہے مگر یہ تعریف بالکل غیر وسیع اور محدود ہے۔ اگر اس کسوٹی پر فارسی شاعری کو پرکھا جائے تو بلا مبالغہ فی صد نوے شعر شاعری کے دائرہ سے خارج ہو جائیں گے، جب فارسی کا یہ حال ہے تو اردو کا کیا ذکر جس کے اکثر نغمے تخیل و محاکات دونوں سے بے نیاز ہیں۔ ابھی اردو میں شعر کی کوئی ایسی تعریف نہیں کی گئی جو ہمارے مفید مطلب ہو اور جس کو منقدین معیار کامل سمجھیں، تاہم اتنا سب مانتے ہیں کہ شاعری حسیات و کیفیات کی تشریح ہے، جو موزونیت کے دوش بدوش اچھے پیرایہ میں مناسب الفاظ کے ساتھ بیان کی جائے، جو کچھ شاعر پر گذرتی ہے وہ اس کو الفاظ کے پردے میں لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس کے انداز بیان میں اس قدر لوچ ہوتی ہے کہ سننے اور پڑھنے والے بلا متاثر ہوئے نہیں رہ سکتے۔ وہ خود ذکی الحس ہوتا ہے اور اپنے طرز کلام سے دوسروں کو بھی ذکی الحس بنا دیتا ہے۔

جناب نوح غزل گو شاعر ہیں، اور غزل گوئی کا حقیقی دار و مدار محض حسن و عشق پر ہے۔ بہرحال غزل گو شاعر کے لئے حسن و عشق کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ ان سے اگر بے اعتنائی برتی جائے تو غزل غیر مکمل، جذبات مفقود، اور شاعر کی باتیں غیر موثر ہونگی۔ بغیر محبت کے نہ تو وہ اپنی اعلیٰ شخصیت کو نمایاں کر سکتا ہے، اور نہ تو اس غم و الم کی زندگی کو آرام و بے خبری کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتا ہے۔ محبت زندگی کا ایک درد انگیز مگر دلچسپ باب ہے۔ خدا نے جن کو چشم تمیز عطا کی ہے، وہ خوب سمجھتے ہیں کہ محبت تجدید ایمان ہے، اور روز ازل کے بھلائے ہوئے وعدوں کا اعادہ تاکہ دنیا کے جھگڑوں میں پڑ کر ہم عہد و مقصد کو نہ بھول جائیں، اور ہماری زندگی ناقص اور غیر دلچسپ ہو کر نہ رہ جائے۔ اس مختصر تمہید کے بعد اب آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ محبت یا حسن و عشق غزل کا جزو لاینفک ہے۔ نوح صاحب بھی اسی خیال کے مؤید ہیں اور وہ محبت کو بشرط پاکبازی ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہم اسی کے ذریعے سے شاہد معنی سے ہم آغوش ہو سکتے ہیں بت پرستی کے پردے میں حق پرستی سے بھی سبکدوش ہو جائیں گے۔ آپ کے نزدیک خدا کی ماہیت کچھ وہی لوگ معلوم کر سکتے ہیں، جو بتوں کی برائی نہیں کرتے ؎

برائی جو نہیں کرتے بتوں کی   وہی اللہ کو پہچانتے ہیں

گو ان کو یہ بھی خیال ہے کہ عشق ورزی سے آرام و آسائش کی چیزیں مفقود ہو جائیں گی، لیکن کچھ بھی ہو، وہ ان کے جلوے حسن فطرت کو منکشف کرتے ہیں، ان کو دیکھ کر اور کسی کا بھی خیال آ جاتا ہے ؎

آج مجھ پر انکشافِ حسنِ فطرت ہو گیا   کیا کہوں کیا میں نے دیکھا روئے تاباں دیکھ کر

غرضکہ جناب نوح رہبر پاکباز بن کر چمنستان عالم کے گلہائے رنگا رنگ کو دیکھ کر خدا کی حمد و ثنا میں مصروف ہیں، چونکہ آپ کی نیت اچھی ہے اس لئے آپ کا دل جز و کل کا مرکز بن رہا ہے۔ اور اپنے غنچۂ دل میں گلشن کی سیر کرتے ہیں، گو آپ جانتے ہیں کہ عشق کے نتائج مہلک ہیں، مگر وسیع النظری اور زمانہ شناسی ان کو حسن پرستی پر مجبور کرتی ہے ؎

برق کے گرنے سے گو نخلِ چمن جل جائیں گے   خیر با روشن تو ہمارا آشیاں ہو جائے گا

انجام کار آپ تدریجی ترقیوں کے ساتھ اس منزل تک پہونچ گئے ہیں، جہاں محبت صرف ایک چھیڑ ہے۔ انھیں اس کی بھی پروا نہیں رہی کہ آیا ان کا منظور نظر خوش ہے یا ناخوش، برائی کر رہا ہے

یا بھلائی۔ وہ تو صرف لطف خلش کے متمنی ہیں اور کچھ بھی نہیں چاہتے ؎

ہے چھیڑ سے غرض ہمیں اس سے غرض نہیں الفت کرے کوئی کہ عداوت کرے کوئی

اس خیال کو مرزا غالب مرحوم نے بھی ادا کیا ہے ؎

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد نہ سہی وصل تو حسرت ہی سہی

مگر حسرت غالبؔ کی شان عالی ہمتی اور کمال جنون کے خلاف ہے۔ نوحؔ حسرت کے پہلو کو بچا گئے ہیں۔ جب آپ کوچۂ عشق میں آئے تو نامرادی یاس، حرماں، امید و بیم، عالی ہمتی، عزم و استقلال کو ساتھ لئے ہوئے عزیزوں کی تعدی و جور کی شکایت بھی لازمی ہو گئی ہر وقت عالم بیخودی میں رہنے لگے۔ اگر جی میں آیا تو مطلوب پر طعن و تشنیع بھی شروع کر دی ؎

وہ پچھتاتے ہیں ساری عمر اپنی نامرادی پر جنھیں داغ تمنا آپ کی محفل سے ملتا ہے

اگر کبھی اس کو جناب کے جنون پر تعجب ہوا تو اس کی وجہ بھی بتلادی ؎

تم کو مرے جنوں پہ تعجب فضول ہے دیوانہ کہدیا مجھے دیوانہ ہو گیا

اتنے میں پھر جو خیال پلٹا اور دل میں درد محسوس کیا تو دل پر اضطراب کی شکایت ہو رہی ہے ؎

خدائی بھر نے پائیں نعمتیں سارے زمانے کی مرے حصہ میں آیا تو دل پر اضطراب آیا

غرضکہ جناب نوحؔ نے محبت کے مختلف مدارج کو بحسن و خوبی ادا کیا ہے۔ اسی کوشش میں اگر کسی وقت ان کی زبان سے ایسی باتیں نکل جائیں جو سوسائٹی کے خلاف ہوں تو وہ قابل گرفت نہیں اور نہ وہ خود قابل تعزیر ہیں۔ اگر اسی عالم بیخودی میں کبھی کبھی مجازاً وہ درِ میخانہ پر صدا بھی لگائیں، تو جائز ہے ؎

خدا آباد رکھے تجھ کو ساقی تری محفل سے ہم کیوں بے پئے جائیں

اگر کبھی جذبہ میں آگئے تو ترک میکشی کو خودکشی کا مترادف ٹھیرا دیا ؎

توبہ کے بعد اہل خرابات مر گئے یہ ترک میکشی نہ ہوئی خودکشی ہوئی

کیونکہ انھیں الفاظ کے پردہ میں شاہد معنی کی جھلک ہے ؎

ہم تو خواہاں ترے ہیں اے ساقی بادۂ و ساغر و سبو کیا چیز

میں مانتا ہوں کہ یہ خیالات فرسودہ ہیں ہر شاعر نے محبت کے مختلف مدارج کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ لیکن حسن بیان بھی کوئی چیز ہے ہر شخص ایک خاص لے اور طرز لیکر آیا ہے اور ہر ایک کے انداز بیان میں ایک امتیازی شان ضرور ہوتی ہے۔ یہ بھی خدا کی دین ہے کہ کسی کے حسن بیان میں شوخی شگفتگی کافی ہو اشعار پر کیف سلیس اور تکلیف وآورد سے بری ہوں ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔ ہر عاشق اپنے معشوق کے لئے گریہ وزاری کرتا ہے مگر ایسے کم ہیں کہ جو نوح کی طرح نغمہ سرائی کر سکیں ؎

ایک ہے ان کی محبت ایک ہے ان کا خیال اور میرے پاس سامانِ جنوں کچھ بھی نہیں

---

خاک اُڑانے کے لئے کافی یہی ہے ایک لفظ کاش کوئی کہدے اپنے مُنہ سے دیوانہ ہمیں

ہر فرد مطلوب کے لئے جان و مال دقعت کرنے کے لئے تیار رہتا ہے، لیکن شاذونادر ایسے ہیں جو اس امر اہم کو لطیف پیرایہ میں بیان کر سکیں ؎

جان بھی حاضر ہے ان کے واسطے مجھ کو وہ پیارے ہیں یہ پیاری نہیں

---

آپ لے لیں یہ آپ کا دل ہے کچھ نہیں اس میں قیل وقال ہمیں

لیکن با ایں ہمہ اس تمام وحشت پیمائی اور کوچہ گردی کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہم اس کا سراغ پا جائیں اور یہ چند روزہ زندگی ہنسی سے گذار دیں ؎

کوچہ گردی کا یہ مطلب دوسرے لفظوں میں ہے اپنے کاشانے کو چھوڑ اور اسکے کاشانے کو ڈھونڈھ

---

وحشت پیمائی کے صدقے کوچہ گردی کے نثار چلتے پھرتے ختم اپنی زندگانی ہوگئی

اور انجام کار آپ کے مطمح نظر میں بھی فرق آجاتا ہے۔ فرماتے ہیں

اہل الفت کے لئے ظاہر پرستی عیب ہے دل کے آئینہ میں وہ تصویر ہونی چاہیئے

اُردو شاعری پر جو خاص اعتراض کیا جاتا ہے وہ یہ کہ اس میں رنج وغم یاس وحرماں مایوسی

اور مجبوری کے سوا کچھ بھی نہیں۔ وہی گریہ نیم شبی، وہی ہجر کی باتیں، وہی فلک پیر کا شکوہ۔ ہم اس وقت اس کی تردید کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور نہ ہم غم والم سے بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چاہے ہم ہزار ان پست ہمت کرنے والے خیالات سے پرہیز کریں، چاہے ہمیں لاکھ خوش وخرم رہنے کی تلقین کی جائے لیکن پھر بھی جو فطری انسبیت رنج والم سے ہمیں ہو گئی ہے، ذرا مشکل سے جائے گی۔ گو ہم جانتے ہیں کہ اس عملی دنیا میں مستی یا بیخودی فی الحقیقت خودکشی ہے۔ ہر وقت کی گریہ وزاری ہمیں خود بُری معلوم ہوتی ہے لیکن ہم مجبور ہیں۔ ہم خوب سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی جنون خیز شاعری نے ہم کو سست و بودا بنا رکھا ہے، مگر کیا کریں لاچار ہیں۔ ہمیں ان کمزوریوں کا خیال ہے لیکن پھر بھی ناصح سے لڑنے کے لئے ہم تیار ہیں ؎

کوئی ناصح کو یہ سمجھاتا نہیں وہ مرا سمجھانے والا کون ہے

ہم نے اکثر خوش وخرم رہنے کی کوشش کی ہے، مگر ہم نے جتنا ہی خوشی کو تلاش کیا، وہ دنیا میں نہیں ملی ؎

اے نوح جستجوئے مسرت فضول ہے وہ چیز ڈھونڈتے ہیں جو دنیا میں اب نہیں

اور ہمیں خود اکثر رنج والم کی زندگی بری معلوم ہوتی ہے اور بسا اوقات ہم یاس وحرماں سے پریشان ہو گئے ہیں ؎

کریں تقدیر کا شکوہ فلک کو بد دعائیں دیں یہی ہونا ہے اب اس کے سوا ہونا ہے کیا ہم سے

واقعہ یہ ہے کہ ہمارے وہی نغمے پرکیف اور بہترین ہوتے ہیں جن میں سوز وگداز، یاس وحرماں کی باتیں اور امید وبیم کی کشاکش ہو۔ مغرب کے مشہور منقد ابوعبیدہ قیروانی نے اس بارے میں ایک دلچسپ بحث لکھی ہے جس کا خلاصہ حاضر ہے:۔

"نیرنگی عالم کے کرشموں سے یہ تو ناممکن ہے کہ حضرت انسان کی زندگی ہمیشہ ایک حالت میں گذر جائے۔ انسانی قلوب پر جتنی کیفیات نفسی طاری ہوتی ہیں، اگرچہ ان کا شمار بہت ہے، مگر سب کی سب مجموعہ حیثیت سے دو جذبوں کے تابع ہیں، جذبات محزنہ، جذبات مجبہ۔ ہر شخص خواہ وہ کیسا ہی ہو اس کا دل ان دونوں صورتوں سے خالی نہ ہوگا۔ اب ہمیں

یہ دیکھنا ہے کہ ان دونوں جذبوں میں سے کون سا انسانی فطرت سے قریب تر ہے۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ اگر کسی گاؤں، قصبہ، شہر، ملک میں کوئی خوشی رونما ہوتی ہے تو اس کا اثر عالمگیر نہیں ہوتا بر خلاف غم کے، اس کی مثال اس طرح زیادہ ذہن نشین ہو جائے گی۔ ایک مقام پر ایک ہی وقت میں کوئی نوجوان مر جائے، اور کوئی پیدا ہو تو آس پاس کے لوگ غم ہی میں گرفتار رہینگے اور انھیں خوشی کا مطلق احساس نہ ہوگا۔"

شیلی نے بھی اسی خیال کو ادا کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ "ہمارے بہترین نغمے وہی ہیں جو ترجمان الم ہوں جن میں رنج و غم کی چاشنی ہو"

Our sweetest songs are those
That tell of saddest thought

اب آپ نے دیکھ لیا کہ صرف اہل مشرق ہی نہیں اس خیال کے موئد ہیں، بلکہ اہل مغرب بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ نوح صاحب نے بھی اس نکتہ کو خوب سمجھ لیا ہے اور وہ بالکل اس کے قایل ہیں ؎

میں مبتلائے غم ہوں، غم سے مجھے ہے مطلب ان کو خوشی مبارک خوگر جو ہیں خوشی کے

وہ زندگی کے مقصد کو خوشی سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن ان کے پہلو میں ایک درد مند دل ہے، اور وہ ان کو چین نہیں لینے دیتا ؎

زندگی کا ہے جو مقصد وہ میسر ہے کہاں خوش تو کیا ہیں، اگر خیر جئے جاتے ہیں

شعرا مروجہ رسوم اور زمانہ ساز پابندیوں سے بہت گھبراتے ہیں، وہ دنیا میں پیام امن لیکر آئے ہیں وہ خود بدمست و مدہوش رہنا چاہتے ہیں اور ان کی خواہش ہوتی ہے کہ دوسرے بھی اسی طرح رہیں۔ وہ متعصب تنگ نظر، اور دنیا دار ملاؤں سے بہت جلتے ہیں اور ان کی زہد و پارسائی کا ایسا خاکہ کھینچتے ہیں کہ سنتے ہی بنتا ہے، اگر ترنگ میں آگئے تو رندوں کے ہاتھ سے زاہد کو شراب پلا دی، پیر حرم کو پیر مغاں کا مرید بنا دیا، نماز کے وقت مسجد سے کھسک گئے ؎

رہ کے مسجد میں بھی پابندیِ اوقات نہیں
ہم سرک جاتے ہیں جب وقت نماز آتا ہے

کبھی کبھی تو یہ لوگ اس قدر آزادرَو ہو جاتے ہیں کہ کعبہ اور بُتخانہ سے لاعلمی ظاہر کرتے ہیں

جو گیا ہو وہ بتائے میں بتا سکتا نہیں
کعبہ کتنی دُور ہے میخانہ کتنی دُور ہے

بہرحال شاعروں اور زاہدوں سے خوب چلتی ہے اور تا ابد چلیگی۔ شاعر فروعات کا قائل نہیں اسکی تعلیم اعلیٰ و ارفع ہوتی ہے، وحدت پرستی ہی اس کا مذہب ہے اور ترک رسوم اس کی عبادت۔ بقول غالب

ہم موحد ہیں، ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملّتیں جب مٹ گئیں اجزاے ایماں ہوگئیں

وہ کسی مذہب و فرقہ کو بُرا نہیں کہتا، وہ سمجھتا ہے کہ تھوڑی بہت سچائی ہر مذہب میں موجود ہے، یا یوں کہو کہ سچائی اور بُرائی دنیا میں اس طرح مخلوط ہیں کہ ہم سچائی کے متعلق کوئی معقول رائے نہیں قائم کرسکتے

ہوگیا اب حق و باطل میں [illegible]
کعبہ کی نیو میں بتخانہ کے پتھر نکلے

دنیا کیا ہے اور اس سے ہمارا کیا تعلق ہے۔ دنیا میں آنے سے پہلے ہم کیا تھے اور اسکے بعد کیا ہونگے انسان ضرور بالضرور ان باتوں کو جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ نوح صاحب ان واقعات سے بہت متاثر ہوگئے ہیں اور ان کے خیال [illegible] قابل غور یہ ہے [illegible] انسان فانی نہیں ہے، وہ دنیا میں آنے کے قبل کچھ نہ کچھ حیثیت ضرور رکھتا تھا مگر وہ اس حادثہ گاہ مقری میں جان بوجھکر نہیں آیا

آگئے تھے ہم بھی رستہ بھول کر
رات بسنے کو سرائے دہر میں

وہ رستہ بھول کر اس دنیا میں آگئے ہیں، اور اب اضطراب شوق انھیں اور کہیں لیجا رہا ہے۔ یہ شوق کب ختم ہوگا اور اس کا آخری نتیجہ کیا ہوگا نہیں معلوم

ہوائے شوق ہم کو لے اُڑی ہے
نہیں معلوم ہم پہونچیں کہاں تک

بہرحال ایک منزل پر پہونچکر دوسری منزل کا پتہ چلتا ہے

فشارِ قبر نے ظاہر کیا محشر کے جھگڑوں کو
پتہ آگے کی منزل کا ملا اس پہلی منزل سے

حضرت میر علیہ الرحمۃ بھی اس دنیا میں اضطراب شوق کی وجہ سے جلوہ گر ہوئے تھے، مگر جان بوجھ کر

ان کا خیال ہے ؎

اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے اس رمز کو و لیکن معدود جانتے ہیں

گو حسنِ بیان و رفعت تخیل میں جناب نوح میرزا کو نہیں پاسکے مگر پھر بھی ان کی تائید میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ تقدیر و تدبیر کے پیچیدہ مسئلہ کو کس خوبی سے حل کرنے کی کوشش کی ہے ؎

مری تدبیر نے مجھکو مری تقدیر پر ٹالا مگر اب دیکھئے تقدیر کیا تدبیر کرتی ہے

قریب پچاس برس سے شاعری کی دو قسمیں ہوگئیں ہیں (۱) شاعری بالذات (۲) شاعری بالعرض پہلے طبقہ والے دوسرے طبقہ سے کچھ تعلق نہیں رکھتے' ان کے نزدیک مقصد شاعری خالص ادبی خدمت ہے۔ وہ عارضی اور فروعی باتوں میں نہیں پڑتے۔ وہ ایسے اشعار کبھی نہیں کہتے جن سے انھیں ایک معلم یا سیاسی رہبر کہا جاسکے۔ وہ اپنے کلام میں صرف انھیں باتوں کا تذکرہ کرتے ہیں' جو انسان کے لئے ہر حالت اور ہر زمانے میں ضروری ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس طبقہ کے نتائج افکار مرور ایام سے غیر دلچسپ نہیں ہوجاتے اور ان میں ہمیشہ تازگی رہتی ہے۔ شاہنامہ فردوسی اور دیوان حافظ میں جو فرق ہے' اس بیان کی تائید کرتا ہے۔ فردوسی کے نغمے اسی زمانہ کے لئے تھے اور آج ہمارے لئے بالکل غیر ضروری ہیں۔ برخلاف دیوان حافظ جس کی شگفتگی ابھی تک قائم ہے یہ لوگ دوسرے طبقہ شعرا کو شاعری سے علحدہ سمجھتے ہیں کیونکہ آخر الذکر زبان کا بھی خیال نہیں کرتے۔ ان میں زور بیان ضرور ہوتا ہے مگر پھر بھی فصیح نہیں کہے جاسکتے۔ ان کے کلام میں زبان کی غلطیاں منقدین کو مایوس کردیتی ہیں۔ سخن سنج اصحاب کے نزدیک ان کی وقعت زیادہ نہیں ہوتی۔ ان کی تعظیم و تکریم وہی لوگ کرتے ہیں جو خود فن شاعری سے نابلد ہیں اور جن کے نزدیک شاعری صرف رفعت تخیل تک محدود ہے۔ ان کے حسن خیال سے متاثر ہوکر اکثر اصحاب فن کی غلطیوں سے چشم پوشی کرجاتے ہیں۔ تاہم اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اس طبقہ کا شاعر اپنے زمانہ کے لئے خضر سے کم نہیں ہوتا۔ خواہ آگے چلکر اس کے ترانے محض الفاظ ہی کے مجسمے نہ رہ جائیں۔ حضرت نوح پہلی گروہ سے دابستہ ہیں ان کی شاعری زمانہ کی ہوا سے نہیں متاثر ہوئی، قدما کی طرح آپ کا کلام سادہ، دلکش اور واقعات کا پہلو لئے رہتا ہے۔ اساتذہ قدیم کی طرح آپ بھی انسانی زندگی کا خاکہ کھینچتے ہیں۔ مگر اس حسن و خوبصورتی کے ساتھ کہ فروعی اور عارضی باتیں نہیں آنے پاتیں، اور ایک عام اور ہمہ گیر حالت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ آپ نے

ہماری زندگی کا عمیق مطالعہ کیا ہے۔ اظہار خیال میں قریب قریب وہی الفاظ استعمال کرتے ہیں، جنھیں ہم اکثر ایسے موقعوں پر بولتے ہیں۔ اسی وجہ سے آپ کے کلام میں زندہ دلی، شوخی اور سادگی سب ہی کچھ موجود ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعی آپ بیٹھے ہوئے کسی سے گفتگو کر رہے ہیں، الفاظ کی نشست، بندش کی چستی آپ کے خصوصی امتیازات ہیں اور کیوں نہ ہو جب آپ پیر میخانہ سخن فصیح الملک داغؒ کے فیض یافتہ ہیں۔ اس میں ہرگز کلام نہیں کیا جا سکتا کہ شاگردان داغ میں نوحؔ ایک خاص درجہ رکھتے ہیں۔ اور استاد کی جھلک شاگرد میں نمایاں ہے۔ سادگی، روزمرہ سلاست، مغلق الفاظ سے احتراز، معاملہ بندی، بے تکلفی یہ سب باتیں نوح کے یہاں بالکل داغ صاحب کی طرح پائی جاتی ہیں اور استاد و شاگرد کا امتیاز ناممکن سا ہو جاتا ہے۔

سادگی و روزمرہ کا ذیل میں مختصر انتخاب کیا جاتا ہے، اسی سے آپ ہمارے قول کی تصدیق کر دیں گے

دو گھڑی کو آپ آئے بھی تو کیا
یہ کوئی احسان ہے احسان میں

توبہ توبہ میں تمھیں ظالم کہوں
ایسی گستاخی تمھاری شان میں

آپ اللہ سے نہیں ڈرتے
اور میں آپ سے بھی ڈرتا ہوں

سنتے رہے ثنا و صفت ہر کسی سے ہم
ملنے کا آپ سے کبھی موقعہ نہیں ملا

روح بھی سخت بے مروّت ہے
یہ جو نکلی تو گھر نہیں آتی

وہ راضی رہیں اسکی پروا نہیں
بگڑ کر مرا کیا بنائے گا چرخ

مجھ سے ملنا پھر آپ کا ملنا
آپ کس کو نصیب ہوتے ہیں

تم نہ آگاہ تھے جفاؤں سے
اُس زمانہ کو یاد کرتا ہوں

دل پر آرزو کو دیکھ کر میں شکر کرتا ہوں
خدا رکھے بڑی رونق ہے اس چھوٹی سی بستی میں

بڑھ گیا درد اور درماں سے
شرم اے چارہ گر نہیں آتی

مرنے والا ترا وہاں پہونچا
جس جگہ سے خبر نہیں آتی

دل لگی کے واسطے دل بستگی کے واسطے
آدمی پیدا ہوا ہے آدمی کے واسطے

جانتا ہوں چار دن کی زندگی میں کچھ نہیں    مر رہا ہوں چار دن کی زندگی کے واسطے

پکارتا ہوں تجھے تو مری نہیں سنتا    الٰہی یہ بھی کوئی شانِ بے نیازی ہے

اٹھاؤ آنکھ ملاؤ نظر ہنسو بولو!    نیاز مند سے اپنے یہ بے نیازی ہے

تقاضا ہے جنوں کا ہر قدم پر    مسافر! یہ تری منزل نہیں ہے

ذرا آنکھیں ملا کر پھر تو کہئے    ہمارے پاس تیرا دل نہیں ہے

حضرت نوحؔ نے فطری واقعات کو بھی ایسے دلکش پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ بلا قصد نظر کے سامنے ایک تصویر پھر جاتی ہے اور محاکات شاعری کا کمال بھی یہی ہے ۔

مصیبت اور اس پر بیکسی کی    کروں میں آپ اپنا غم کہانتک

وہ ہنسی آگئی ترے لب پر    ہو گیا وہ مرا قصور معاف

پتنگے ہوئے جل کے دم بھر میں خاک    مگر صبح تک شمع جلتی رہی

وہ گردش نگاہوں کو دیتا رہا    زمانے کی صورت بدلتی رہی

کبھی دل یہ کہتا ہے کچھ کہو کبھی ہم یہ کہتے ہیں کیوں کہیں

جو گذر گئی وہ گذر گئی اب اسے کسی کو سنائیں کیا

تری الفت میں وہ مجبوریاں ہیں    کہ اپنا حال کہہ سکتے نہیں ہم

تری بیداد کی اکثر انھیں سے داد ملتی ہے    ہماری سرگذشتِ غم کو اہل غم سمجھتے ہیں

ہمارے سامنے ماتم ہمارا روز ہوتا ہے    وہ عالم ہے کہ ہم کو زندگی میں لوگ روتے ہیں

نہ پوچھیں ہمنشیں دنیا میں ہم پر کیا گذرتی ہے    خوشی ہوتی ہے ہنستے ہیں جو غم ہوتا ہے روتے ہیں

جب طبیعت کسی پر آتی ہے    موت کے دن قریب ہوتے ہیں

ہمارے نامۂ اعمال کی اب جانچ ہوتی ہے    وہی دنیا کے جھگڑے پھر سرِ محشر نکلتے ہیں

گذرتی ہے بشر کی زندگی کس کس تو ہم میں    جو ایسا ہو تو ایسا ہو، جو ایسا ہو تو ایسا ہو

ہمیں کرنا تھا کیا کیا چار دن کی زندگانی میں    مگر ہم چار دن کی زندگانی میں کریں کیا کیا

عشق و محبت غزل کے اجزاء ضروریہ سے ہیں یہی نہیں بلکہ عشق و محبت کے لوازم یعنی

صحرا نوردی، بدگمانی، شکوہ فلک اور کیفیت قلبی کا اظہار بھی ضروری ہے ؎

اسے اے باغبان عشق میں تسلیم کرتا ہوں کہ تخم آرزو جمتا ہے خود بویا نہیں جاتا

آزار دیں رقیب تو ان کا گلہ کروں مجھ پہ جفائیں ایک مرے مہرباں کی ہیں

ہائے وہ عالم ہمارے اضطراب شوق کا کوئی ملتا ہے تو ہم ہوتے ہیں مضطر اور بھی

میں حقیقت کی طرف جب کبھی رکھتا ہوں قدم سامنے مرحلۂ عشق مجاز آتا ہے

آداب محبت بھی ہے دنیا میں کوئی چیز جو کچھ تمھیں سب کہتے ہیں ہم کہہ نہیں سکتے

سُنی یہ بات میں نے عشق میں اک مرد کامل سے نظر ملتی ہے آسانی سے دل ملتا ہے مشکل سے

ملا غربت میں ہم کو وہ مزا صحرا نوردی کا پہنچ کر اپنی منزل پر پلٹ آتے ہیں منزل سے

خمریات کا پہلو بھی حضرت نوح نے بکمال حسن و خوبی ادا کیا ہے، لطف یہ ہے کہ اوروں کی طرح جناب نوح کا دامن اس صنف میں ابتذال سے پاک ہے ؎

اے مرے ساقی یہ تیری دل لگی اچھی نہیں خو گرِ مے کر کے کہتا ہے کہ میخانہ کو چھوڑ

گھٹا کو دیکھ کر میخانہ کیا کیا یاد آتا ہے یہ بادل اور میرے دامنِ تر کو بھگوتے ہیں

بادہ خواروں کو ہے کیوں کالی گھٹا کا انتظار کیا مرے ساقی تری زلفِ دوتا ایسی نہیں

پھڑک جاتا ہوں میں پیر مغاں کے اس تکلف پر نیا گاہک جو آتا ہے نئے ساغر نکلتے ہیں

اب مرے ساقی تامل ہے تجھے کس بات کا وہ اُٹھی وہ آگئی وہ چھائی گھٹا برسات کی

حُسن خیال ملاحظہ ہو ؎

زلف جاناں ایک ایسی رات ہے جو کسی بیمار پر بھاری نہیں

ہمیں پھر ان پہ مرنا ہے دوبارہ زندگی پا کر صف محشر کو ہم اپنی صفِ ماتم سمجھتے ہیں

ہوئے تھے منہدم پچھلے زمانے میں جو بتخانے زمیں سے جا بجا اس وقت تک پتھر نکلتے ہیں

شیوۂ اہل وفا اور تو معلوم نہیں تجھ کو اے شمع فقط سوز و گداز آتا ہے

حسرت و بے ثباتی کی تصویر اس سے زیادہ نہیں کھینچی جا سکتی ؎

منالے رات بھر یہ جشن قسمت کی رسائی کا سحر کو شمع بھی نکلے گی رو کر ان کی محفل سے

حکیمانہ اقوال ؎

بربادیاں بھی ہوتی ہیں آبادیوں کے ساتھ — میں رو دیا زمانہ میں جب کوئی گھر بنا

عیب سے ہے پاک ہر روشن ضمیر — شمع کے شعلے میں چنگاری نہیں

تصویر سے کھلتی ہے مصور کی حقیقت — اللہ کی قدرت نظر آتی ہے بشر میں

گیا جو وقت پھر انجام غور کیا ہوگا — نہ ہوگا کچھ بھی یہی ہوگا اور کیا ہوگا

معرفت ؎

ہر کسی میں نظر آیا مجھے جلوہ اس کا — اپنے پردے میں سنیں اس کی صدائیں میں نے

پردۂ کثرت سے باہر جلوۂ وحدت نہیں — وہ اسی محفل میں ہوگا وہ اسی محفل میں ہے

ان خوبیوں کے ساتھ ہی ساتھ حضرت نوح کی شاعری میں نقائص بھی ضرور ہیں۔ کبھی کبھی آپ عشقیہ مضامین نظم کرتے ہوے حد اعتدال سے گذر جاتے ہیں۔ محاورہ اور روزمرہ کے غلو میں جناب نوح عامیانہ الفاظ سے بھی حذر نہیں کرتے۔ سب سے قابل اعتراض بات آپ کی شاعری میں کثرت تکرار ہے جس سے ہر شخص کو فطرتاً تنافر طبعی پیدا ہوتا ہے، اور آپ اس تکرار کو حسن کلام میں داخل سمجھتے ہیں۔ زبان کی صفائی بیشک حسن کلام سے ہے، مگر اسی حد تک کہ سامع کشیدہ خاطر نہ ہو۔ بایں ہمہ۔ یہ عیوب کلام نوح میں بہت کم ہیں۔ پورے دیوان میں ان کا شمار دال میں نمک سے زیادہ نہ ہوگا اور یوں تو بے عیب محض خدا کی ذات ہے، ایک اسی کا کلام ہے جس میں شک وشبہہ کی گنجائش نہیں۔

مدیر

---

# دمشق

اہل عرب دمشق کو جنت ارضی کہتے ہیں۔ مورخین کا قول ہے کہ دمشق نزول آدمؑ کے ۱۱۴۵ برس بعد آباد کیا گیا ہے۔ بناء دمشق کے ۵۰۰ برس بعد بنی اسرائیل کے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے۔

وجہ تسمیہ ابن کلبی کا قول ہے کہ دمشق کی بنا کا فخر سب سے پہلے دمشاق کو حاصل ہوا جو حضرت نوح علیہ السلام کے پرپوتے تھے۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ دمشق کو حضرت ابراہیم کے غلام نے آباد کیا تھا جس کا نام دمشق تھا۔ لیکن یہ قول صحیح نہیں معلوم ہوتا اس لئے کہ حضرت ابراہیم کی ولادت تعمیر دمشق کے ۵۰۰ برس بعد ہوئی ہے۔ ایک جماعت کا یہ بھی قول ہے کہ دمشق کو نمرود کے بھائی دمشاق نے آباد کیا تھا واللہ اعلم بالصواب۔

دنیا میں دمشق کو جتنی عزت حاصل ہے شاید ہی کسی خوش نصیب شہر کو میسر ہے۔ ازمنہ قدیمہ کے اکثر اولوالعزم پیغمبروں کا مولد دمشق ہی تھا۔ خدا کے اکثر پیارے بندے اب بھی سرزمین دمشق میں آرام کر رہے ہیں۔ مقابر انبیا، مزارات اولیا جس کثرت سے اس مبارک شہر میں ہیں، ان کا شمار کم از کم ہمارے لئے تو ناممکن ہے۔

مسلمانوں نے دمشق چودھویں ہجری میں فتح کیا ہے۔ یہ زمانہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافت کا تھا۔ آپ نے خیال کیا کہ دمشق شام کا مضبوط قلعہ ہے، اگر فتح ہو جائے تو مسلمانوں کا تصرف تمام شام پر آسانی سے ہو جائے گا۔ یہ منصوبہ باندھ کر آپ نے ایک لشکر جرار دمشق کی طرف روانہ کیا جس کی مجموعی تعداد ۳۵۵۰۰ تھی۔ حضرت ابو عبیدہ کے ساتھ ۲۷،۰۰۰ ہزار نفوس تھے۔ حضرت عمرو بن عاص کی معیت میں ۹۰۰۰ ہزار سپاہی تھے اور شیر اسلام خالد بن ولید عراق سے محض ۱۵۰۰ آدمیوں کے ساتھ جوش جہاد میں نکل پڑے تھے۔ دمشق پہونچکر اہل اسلام کا لشکر دو ٹکڑوں پر منقسم ہو گیا۔ نصف حضرت خالد کے زیر اثر تھا اور نصف حضرت عبیدہ کے تابع تھا۔ دمشق اس زمانہ میں پاپائے روم کے زیر قیادت تھا، اسکی طرف سے ایک حاکم حفاظت قلعہ کے لئے متعین تھا۔ لشکر اسلام کی خبر پاکر وہ قلعہ بند ہو گیا، مگر مسلمانوں نے بھی اس شدت سے محاصرہ کیا کہ مخالفین کے چھکے چھوٹ گئے۔ جب بھوکوں مرنے لگے تو حضرت خالد سے صلح و امان کی درخواست کی، جن کی فوج دمشق کے شرقی دروازہ پر اڑی ہوئی تھی، مگر آپ نے صلح سے

انکار کر دیا۔ اس پر رومیوں نے ایک مجلس شوریٰ منعقد کی اور عامتہ الناس کو اپنی مجبوری و بیکسی کا حال سنایا۔ ایک تجربہ کار سیاح راہب نے کہا کہ خالد سے صلح و آشتی کی امید فضول ہے، وہ نہایت سفاک انسان ہے ہاں ابو عبیدہ سے گفت و شنید کرنی چاہئے، وہ رحم دل مسلمان ہے۔ حضرت ابو عبیدہ جناب خالدؓ کے لشکر کے دوسری طرف "باب جابیہ" نامی دروازہ کے سامنے خیمہ ڈالے ہوئے تھے۔ اس تجویز پر قوم نے اتفاق کیا اور ایک عربی داں راہب نے قلعہ کے دروازہ پر کھڑے ہو کر حضرت ابو عبیدہ کے لشکر کو مخاطب کر کے کہا "اے گروہ عرب! ہم کو اتنی دیر کے لئے امان دو کہ ہم تمھارے پاس آکر صلح کی بات چیت کر سکیں" حضرت ابو ہریرہؓ نے جب یہ سنا تو سیدھے حضرت ابو عبیدہ کے پاس گئے اور رومیوں کی گفتگو کا اعادہ کیا۔ حضرت ابو عبیدہ بہت خوش ہوے اور حضرت ابو ہریرہ کو حکم دیا کہ رومیوں سے جا کر مزید گفتگو کریں اور سب کو امان کی خوش خبری سنا دیں۔ رومیوں نے مطمئن ہو کر قلعہ کا دروازہ کھول دیا، اور سو عظماء قوم اور علماء مذہب کے ساتھ حضرت ابو عبیدہ کی خدمت میں شرائط صلح مکمل کرنے کے لئے حاضر ہوئے۔ حضرت ابو عبیدہ نے کمال خلق و مروت سے ان کا استقبال کیا، انھوں نے کہا کہ وہ صلح کرنے کے لئے اس شرط پر طیار ہیں کہ ان کا ایک کنیسہ "یوحنا" نہ منہدم کیا جاے۔ حضرت ابو عبیدہ نے جواب دیا کہ کوئی نہ برباد کیا جائے گا۔ اسلام مذہبی رواداری کا علمدار ہے اور یہی نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کا برگزیدہ فرمان ہے۔ اہل دمشق نے برضا و رغبت اس امر کو مان لیا، اور حضرت ابو عبیدہ سے التجا کی کہ شہر کو اپنے قدم مبارک سے زینت بخشیں، چنانچہ حضرت ابو عبیدہ سو کبائر اصحاب اور معززین قوم کو لیکر شہر میں داخل ہوئے۔ اتفاق وقتی سے حضرت خالدؓ کو اس صلح کا بالکل علم نہ ہوا اس لئے کہ وہ شرقی دروازہ پر تھے اور حضرت ابو عبیدہ شہر میں "باب جابیہ" سے داخل ہوے تھے۔ شرقی دروازہ کے سامنے بالکل فصیل قلعہ کے متصل ایک شخص یونس بن مرقص کا مکان تھا۔ اس کو نیز اس کے اہل و عیال کو حضرت خالد کے محاصرہ سے سخت تکلیف پہونچی تھی۔ اس لئے اس نے ایک رات قلعہ کی دیوار میں نقب لگا کر خود کو حضرت خالد کی حضوری میں پہونچا دیا۔ اور اپنے اہل و عیال کی امان مانگتے ہوئے مسلمانوں کو قلعہ میں نقب کے ذریعہ سے داخل کرنے کا وعدہ کیا۔ حضرت ابو عبیدہ نے منظور کر لیا اور سو بہادر سپاہیوں کو یونس کے ساتھ کر دیا۔ اور انھیں سمجھا دیا کہ قلعہ میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے دروازہ کا قفل توڑ دیں، پھر باواز بلند تکبیر کہیں۔

چنانچہ سپاہیوں نے سیف الاسلام حضرت خالد کے حکم کی پوری تعمیل کی جب لشکر خالدؓ نے صدائے تکبیر سُنی یکبارگی قلعہ میں داخل ہوگئے" اور لڑتے بھڑتے حضرت مریمؑ کے کنیسہ تک پہونچ گئے۔ حسن اتفاق سے اسی مقام پر حضرت خالدؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ حضرت خالد نے متعجبانہ اور مستفسرانہ انداز سے حضرت ابو عبیدہ کی طرف دیکھا۔ انھوں نے جواب دیا کہ "اے ابو سلیمان[1]! خدا نے قلعہ کو میرے ہاتھ پر صلح و آشتی سے فتح کرا دیا' اور مسلمانوں کا خون بہنے سے بچ گیا" اس گفتگو کو سنکر حضرت خالدؓ برانگیختہ ہوگئے کہ بلا ان کی اجازت کے کیوں صلح کر لی گئی جبکہ وہ امیر فوج تھے۔ اتنا کہہ کر حضرت خالدؓ نے عرب کے بدوی قبائل کو قتال کا اشارہ کیا پھر کیا تھا دمشق کی گلیوں میں خون کی ندیاں بہ نکلیں یہ دیکھ کر حضرت ابو عبیدہؓ گھبرا گئے اور جنگجو قبائل سے صرف اتنی دیر تلوار میان میں کرنے کی التجا کی کہ وہ حضرت خالدؓ سے اور کچھ گفتگو کر سکیں۔ خدا خدا کر کے یہ ہنگامۂ محشر خاموش ہوگیا اور حضرت ابو عبیدہ نے عام مسلمانوں کی ایک مجلس مشاورت منعقد کی' آپ نے حضرت خالدؓ سے بسہولت کہا کہ اگر متمدن اقوام کو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں نے صلح کرنے کے بعد خونریزی کی ہے' تو ان کا اعتبار اُٹھ جائیگا اور کسی قلعہ کو صلح سے فتح کرنا دشوار ہو جائیگا۔ بارے حضرت خالدؓ کے سمجھ میں یہ بات یاد آگئی اور لشکر کو قتل و جدال سے منع فرما دیا۔ یہ ہے فتح دمشق کا مختصر حال۔ رومیوں نے صلح کے بعد مسلمانوں کو اس قدر مال و منال دیا کہ وہ خوشحال ہوگئے۔

**دمشق اسلامی** جب مسلمانوں نے دمشق کو فتح کر لیا' تو حضرت امیر معاویہؓ بحیثیت ایک گورنر کے متعین کر دئے گئے۔ لیکن شہادت عثمانؓ کے بعد ۴۱ھ میں حضرت امیر معاویہ نے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور لوگوں سے اپنی خلافت کی بیعت یعنی شروع کر دی۔ حضرت امیر معاویہ سلطنت بنی امیہ کے بانی اول تھے۔ دمشق میں اموی خاندان ۱۳۲ھ تک برسرِ حکومت رہا۔ چونکہ دمشق میں اموی سلطنت کا نظام خالص عربی تھا' اس لئے اس کو بغداد کی سی تہذیب و تمدن نہیں نصیب ہوتی تاہم اس ایک سو سال کی قلیل مدت میں دمشق کے اندر جتنی اصلاحات کی گئیں' اس کے بیان کے لئے دفتر کے دفتر ناکافی ہیں۔ خصوصاً جامع مسجد تو اس شان کی تعمیر ہوئی' جس کی نظیر دنیائے اسلام اب تک نہ پیش کر سکی۔ دمشق میں یکے بعد دیگرے ۱۴ خلیفہ برسرِ اقتدار رہے۔ دمشق کا آخری تاجدار "مروان ثانی" تھا۔

---

[1] حضرت خالدؓ کی کنیت۔

۵ رمضان ۱۳۲ھ کو خلیفہ سفاح عباسی کے سپہ سالار عبداللہ بن علی نے دمشق کا محاصرہ کیا۔ سخت خونریزی کے بعد قلعہ فتح ہو گیا' مگر سفاح کے ظلم وجور سے پریشان ہو کر اہل دمشق نے بغاوت کر دی۔ سفاح نے ایک جرار لشکر روانہ کیا' جس نے بڑی بے دردی سے اہل شہر کا خون بہایا۔ اور اکثر عالیشان عمارتیں برباد کر دی گئیں' جو اصلی معنوں میں عربی تمدن کی یادگار تھیں۔ تسلط کے بعد سفاح نے عبداللہ بن علی کو۔ جو اس کا چچا تھا' دمشق کی حکومت سپرد کی

احمد بن طولون مصر کا گورنر تھا۔ اس نے خلفاء عباسیہ کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر بغاوت کر دی اور دمشق پر قبضہ کر لیا۔ ۲۸۲ھ میں دمشق پھر بغدادی خلیفہ کے تحت میں آ گیا' مگر خمارویہ ابن احمد بن طولون نے چند ہی دنوں میں بہادرانہ بغدادی لشکر کو شکست دیکر دمشق کو اپنے تصرف میں کر لیا۔

محرم ۳۵۹ھ میں المعز لدین اللہ علوی نے ایک لشکر جعفر بن فلاح کی سرداری میں دمشق کی طرف روانہ کیا' جعفر نے آسانی سے شہر کو فتح کر لیا' اور مسجدوں میں بجائے خطبہ عباسیہ کے خطبہ علویہ رواج دیا۔

۴۶۶ھ تک علویوں کا اقبال دمشق پر سایہ فگن رہا' یہ زمانہ سخت اختراق کا تھا۔ آئے دن کی خانہ جنگیاں' سلطنت کے لئے مضر ثابت ہوئیں۔ ۴۶۸ھ میں سلطان الپ ارسلان نے دمشق کو فتح کیا اور خطبۂ علویہ منسوخ کر کے خلیفۂ بغداد کا نام درج کیا' ۴۷۰ھ میں علویوں نے پھر دمشق پر حملہ کیا' مگر صاحب حلب کی کوششوں سے قلعہ محفوظ رہا۔ ۵۴۲ھ میں عیسائیوں نے دمشق کا محاصرہ کیا' مگر سیف الدین غازی صاحب موصل کی جرأت وشجاعت کے آگے عیسائیوں کی ایک نہ چلی اور مجبوراً پسپا ہونا پڑا۔ اس محاصرہ میں سلطان نورالدین برادر سلطان صلاح الدین ایوبی نے بڑا نام پیدا کیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ قلعہ محض اسی شمشیر بیشۂ شجاعت کی وجہ سے بچ گیا۔ ۵۴۹ھ میں سلطان نورالدین نے عیسائیوں کے خوف سے دمشق پر اپنے بھائی نجم الدین ایوب کو مقرر کیا۔ یہ حاکم بہت علم دوست تھا۔ اس کے عہد میں دمشق کی علمی حالت بہت بہتر ہو گئی تھی۔ کثرت سے مدارس وخانقاہیں بنائی گئیں۔

نجم الدین کے بعد اس کا بیٹا الملک الصالح اسماعیل تخت دمشق پر جلوہ افروز ہوا' مگر اس کی عمر ابھی صرف ۱۱ برس کی تھی' اس لئے امیر الامراء شمس الدین المعروف با بن مقدم نے انصرام سلطنت کی طرف توجہ کی۔ اس وقت مصر کی حکومت پر سلطان صلاح الدین ایوبی کا تقرر تھا۔ ابن مقدم نے ان کو ملک صالح کی اطاعت

کے لئے لکھا، جس کو انھوں نے منظور کرلیا۔

جب ملک صالح نے حلب کا ارادہ کیا، تو امراء دمشق نے سلطان صلاح الدین ایوبی کو دمشق پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی۔ چنانچہ صلاح الدین نے شہر اور قلعہ پر آسانی سے قبضہ کرلیا۔ اور وہاں کی حکومت اپنے بھائی سیف الاسلام طغتگین کے سپرد کی۔ اس طرح سے ملک صالح کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ اور ایوبی نشان قلعہ پر لہرانے لگا۔

سلطان صلاح الدین کی وفات کے بعد مملکت دمشق ان کے بیٹے نور الدین علی کے قبضہ میں آئی۔ ۵۹۰ھ میں ملک العزیز نے دمشق کا محاصرہ کیا۔ مگر دونوں بھائیوں میں صلح ہوگئی۔ ۵۹۲ھ میں ملک العزیز اور اس کے چچا ملک عادل نے ملک الافضل کو حکومت دمشق سے معزول کردیا۔ اور دمشق ملک العزیز سے متعلق کردیا گیا۔

ایک زمانہ تک دمشق سلاطین ایوبی کے زیر حکومت رہا۔ ۶۰۶ھ میں جب تاتاریوں نے بغداد کو بالکل برباد کردیا تو دمشق بھی اس اثر سے محفوظ نہ رہا، یہاں تک کہ کوئی ایسا بھی نہ تھا جو مقتولین کو غسل دے سکے۔ اس وقت دمشق پر الملک الناصر مستولی تھا، جب اس کو معلوم ہوا کہ تاتاریوں کا لشکر حلب تک پہونچ آیا ہے، تو وہ اپنے لشکر کو لے کر مصر کی طرف روانہ ہوگیا۔ آخر کار جس ساعت کا خوف تھا، آ ہی گئی، اور تاتاریوں نے فصیل کو منہدم کرکے اہل شہر کو خوب اچھی طرح برباد کیا۔

جب یہ فتنہ فرو ہوگیا، تو دمشق کی عنان حکومت ملک مجاہد کے ہاتھ میں آئی، مگر چند ہی روز کے بعد ۶۰۹ھ میں الملک الظاہر نے دمشق کا محاصرہ کیا۔ ملک مجاہد نے اپنے اندر تاب مقاومت نہ پاکر پردۂ شب میں راہ فرار اختیار کی۔ دمشق کی قسمت الملک الظاہر کے ساتھ وابستہ ہوگئی، اور خاندان ایوبی کی شمع اقبال بجھ گئی۔ اپنے پیشروں کی طرح الملک الظاہر اور اس کی اولاد ایک قلیل زمانہ تک دمشق ہی پر برسر اقتدار رہی، اور پھر ان کا نام حرف غلط کی طرح ہمیشہ کے لئے مٹ گیا۔

۸۰۳ھ میں تیمور نے دمشق پر حملہ کیا۔ اور قلعہ پر قبضہ کرکے ظلم و جور کا بازار گرم کیا۔ جب سلطان مصر کو یہ حال معلوم ہوا تو ایک لشکر جرار لیکر حملہ کرنے کے ارادہ سے چلا، مگر تیمور نے اپنے بھانجے کو بھیج کر صلح کی درخواست کی، جو بخوشی منظور کرلی گئی۔ ابھی سلطان الناصر دمشق ہی میں تھے کہ تیمور نے لوٹنے کا ارادہ

کیا، اور اپنے لشکر کے ساتھ تاتار کی طرف روانہ ہوگیا۔ جب سلطان الناصر کو بالکل اطمینان ہوگیا، تو مصر کا خیال آیا، چنانچہ دمشق کو ہر طرح محفوظ و مامون دیکھ کر، وہ مصر کی طرف راجع ہوا۔

ادھر تیمور کو جب یہ متحقق ہوگیا، کہ سلطان اب دمشق سے فاصلہ پر پہونچ گیا، تو اس نے پھر دوبارہ دمشق کا محاصرہ کیا، اور قلعہ میں داخل ہوکر اہل شہر کو بہت اذیتیں پہونچائیں، امرا کی جاگیریں ضبط کرلیں عالیشان عمارتیں جلادی گئیں۔ درباری امرا کا حال تو نہایت ابتر تھا۔ کوڑے مار کر ان کی کھال پانی اور نمک سے دھوئی جاتی تھی۔ تیموری لشکر کے ظالم نیم وحشی انسان دمشق کے لئے بلائے آسمانی سے کم نہیں تھے۔ اگر اکا دکا کوئی دمشق کا رہنے والا باہر نکلتا تھا، تو تیموری سپاہی اس کو پکڑ کر طرح طرح کے عذاب دیتے تھے۔ مگر ظالم خونخوار تیمور کی آسودگی اس سے بھی نہ ہوسکی، اور اس نے نادرشاہ کی طرح تین دن تک عام طور سے لوٹ مار کا بازار گرم رکھا۔ پردہ نشین خواتین لونڈیوں کی طرح اسیر کی گئیں، بچے، بوڑھے بیدردی سے قتل ہوئے۔ غرضکہ اس سہ روزہ مظالم کے لئے اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں۔ بڑی بڑی عمارتیں آن کی آن میں نذر آتش ہوگئیں۔ دنیا کی سب سے خوبصورت دمشق کی جامع مسجد بھی آتش زدگی سے محفوظ نہ رہ سکی، اور اس کے اکثر لطیف ترین حصے خاک سیاہ ہوگئے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

۳ شعبان ۸۰۳ھ کو تیمور دمشق کو برباد کرکے، اور اس ارض مقدس کے مایۂ ناز علما، فضلاء کو اسیر کرکے عازم تاتار ہوا۔

۹۲۱ھ میں دمشق سلطان سلیم عثمانی کی مملکت میں شامل ہوگیا، اور چودھویں صدی کے اوائل تک عثمانی پرچم دمشق پر لہرایا کیا۔ یہاں تک کہ غدار شریف نے، یورپ سے سازش کرکے دمشق کو برائے نام اپنے قبضہ میں کرلیا۔

چنانچہ یہ دمشق کی اسلامی سلطنت کی مختصر تاریخ ہے۔ اس کو پڑھکر آپ کو معلوم ہوگا کہ کوئی صدی ایسی خالی نہیں گئی، جس میں دمشق برباد نہ کیا گیا ہو۔ اس امر میں دمشق ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی سے بہت مشابہ ہے۔

**دمشق کی عمارات اور جغرافیہ** زمانہ حال کی تحقیق کے بموجب دمشق سطح سمندر سے ۲۲۴۴ قدم بلند ہے۔ اسکی آبادی بیضوی شکل کی ہے۔ مشرق سے مغرب تک ایک میل کی مسافت ہے، اسی طرح جنوب سے

شمال تک ایک میل سے زیادہ نہیں۔ دمشق عروس لبلاد کہا جاتا ہے۔ وہ دنیا میں اپنے باغوں اور نہروں کی وجہ سے ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔ ہر زمانہ میں شعراء دمشق کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان رہے۔

دمشق کے دو حصے ہیں، داخل، خارج۔ اول الذکر دمشق قدیم ہے، دمشق خارجی کو مسلمانوں نے تعمیر کیا ہے۔

۸۶ھ میں ولید بن عبدالملک نے جامع مسجد کی بنیاد ڈالی، جو دمشق کیا بلکہ دنیائے اسلام کی بہترین مسجد ہے۔ ابھی حال ہی میں رسالہ القاسم میں اس مسجد کا مفصل حال شائع ہوا ہے، اس لئے قصداً نظر انداز کیا جاتا ہے۔ یہ عالیشان مسجد ۹ برس کی مدت میں تیار ہوئی، روزانہ ۱۰۰۰۰ آدمی کام کرتے تھے۔ اس مسجد میں ۶۰۰ سونے کی زنجیریں لگی ہوئی تھیں۔ رومی صناع قسطنطنیہ سے کثیر تعداد میں بلائے گئے تھے۔ مسجد کے مصارف کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ محض ترکاری جو کاریگروں کو کھانے کے لئے دی جاتی تھی، اس ۹ برس کی مدت میں ۶۰۰۰ اشرفیوں کی خریدی گئی۔

مسجد میں اکثر اصحاب کرام و اولیاء عظام کی قبریں تھیں، کچھ تو عباسیوں کے دور حکومت میں برباد ہو گئیں اور کچھ تیموری حملے کے نذر ہوئیں۔ اور بعض ابھی تک مرجع خلائق بنی ہوئی ہیں۔

اس عالیشان مسجد میں تین منارے ہیں۔ بڑے مینار کے متعلق مشہور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آخری زمانہ میں آسمان سے اسی پر نزول فرمائیں گے۔ چنگیز خاں نے ۶۲۳ھ میں اس مسجد میں مذاہب اربعہ کے لئے ۴ محرابوں کا اضافہ کیا۔ اس کے علاوہ دمشق میں ۷۱ اور عالیشان مسجدیں ہیں۔ عیسائیوں کے گرجوں کی مجموعی تعداد دمشق میں ۷۱ ہے۔ اسی طرح یہودیوں کی بھی عبادت گاہیں اپنی قدیم شان و شوکت کی داستانیں زبان حال سے سنا رہی ہیں۔

دمشق میں ۵۸ حمام ۱۱۰ قہوہ خانے اور ۱۳۹ سرائیں ہیں، جن میں اسعد پاشا کی سرائے نہایت عالیشان اور مضبوط ہے۔ دمشق ۷ شیریں اور شفاف نہروں سے سیراب ہوتا ہے، جن کی وجہ سے شہر ہمیشہ دلھن بنا رہتا ہے۔

دمشق محض اپنی خوبصورتی کی وجہ سے مشہور نہیں ہے۔ باغوں، نہروں، عمارتوں کے علاوہ

یہ ایک علمی مرکز بھی تھا اور شاید اب بھی ہو۔

خالص علوم اسلامیہ (فقہ، حدیث) کے لئے دمشق میں بہت سے مدارس تھے، جن میں ۷۰۰ لڑکے تعلیم پاتے تھے۔ سلطان عبدالحمید کے زمانہ میں دمشق کے اندر ۴۸ مدرسے قراءت قرانیہ کے لئے تھے جن میں تقریباً ۱۳۰۰ بچے قران کریم پڑھتے اور حفظ کرتے تھے۔ خاص عورتوں کے لئے ۱۸ زنانے مدرسے تھے، طالبات کی مجموعی تعداد ۹۴۲ تھی۔ یہ سب مدرسے پبلک کے تھے حکومت کو ان سے کوئی تعلق نہ تھا۔

حکومت عثمانی نے اپنے زمانہ سلطنت میں ۴ بڑی بڑی تعلیم گاہیں بنائیں۔ رشدیہ۔ حربیہ اعدادیہ۔ حربیہ کبری۔ مدرسۃ البنات (نسوانی تعلیم گاہ)

عیسائیوں نے بھی دمشق میں بہت کالج واسکول قائم کئے، جن میں ۱۱۴۵ لڑکے تعلیم پاتے ہیں۔ صرف عورتوں کے ۷ الگ مدرسے ہیں جن میں ۱۰۷۰ لڑکیاں تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ ان مدرسوں میں عموماً حساب، جغرافیہ، ادب، عربی، عبرانی، سریانی وغیرہ کی تعلیم ہوتی ہے، اس کے علاوہ طبعیات، طب یونانی، طب مغربی کی تعلیم بھی بہترین طریقہ سے دیجاتی ہے۔ یہودیوں کے بھی ۱۲ مدرسے ہیں، جن میں ۳۵۰ طالب علم عبرانی وعربی حاصل کرتے ہیں۔

دمشق میں شاہان اسلام کے قائم کردہ بہت سے کتب خانے تھے، جن میں اکثر دستبرد زمانہ سے منہدم ہوگئے۔ صرف کتب خانہ عمریہ وکتب خانہ شیخ خالد اور ایک کتب خانہ عبدالعدباشا کا ہے جس میں ابن عساکر کی تاریخ دمشق (جو ۱۸۰ جزا پر مشتمل ہے) عجائب روزگار سے ہے۔

دمشق میں دو ادبی انجمنیں عیسائیوں کی ہیں۔ جن کا مقصد عیسوی لٹریچر کی اشاعت اور غیر ممالک کے عیسائیوں سے اتحاد ہے

دمشق قدیم زمانہ میں اپنی صناعت کی وجہ سے خاص طور پر مشہور تھا۔ تلواریں، اور کپڑے کی صناعت تو قابل رشک تھی۔ دمشق کے رنگین ومنقش پردے آج بھی ایوان یورپ کے لئے زینت کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ جامہ وار دمشق ہی کی ایجاد ہے۔

قدیم زمانہ میں دمشق ایک بڑا تجارتی مرکز تھا۔ ایران، ہندوستان، یورپ کے تجار دمشق کے

دست نگر تھے۔ اب شہر کی آبادی ڈیڑھ لاکھ سے زائد نہیں ہے۔

مسلمان ۱۳۰۰۰۰ — عیسائی ۱۵۰۰۰ — یہودی ۵۰۰۰

یہ مردم شماری ترکوں کے ایام سلطنت کی ہے۔ اب جبکہ متمدن فرانسیسیوں نے عروس البلاد کو کو سوگوار کر دیا، اس کی قدیم عمارتیں ہوائی جہازوں، آتشیں اسلحوں سے برباد کر دی گئیں، نہیں معلوم کتنے نفسوس اس اُجڑی ہوئی بارگاہ کو بسائے ہوئے ہیں۔

یہ دمشق کی انتہائی مختصر تقریب ہے۔ اس کے مفصل حالات بڑی بڑی جلدوں میں بھی نہیں سما سکتے۔ ابن عساکر نے اپنی تمام عمر دمشق کی تاریخ میں صرف کر ڈالی جو ۸۰ اجزا پر ختم ہوئی ہے۔

اسرار احمد

---

# غزل

تمھارے چہرۂ انور کی ہم تنویر دیکھینگے — نگہ میں کوندتی اُس برق کی تصویر دیکھینگے

نقابِ عارضِ روشن اُنھوں نے کیوں اُٹھائی ہے — وہ کیا اس بُت کدے میں عالمِ تصویر دیکھینگے

مجھے آغازِ اُلفت میں نہ کیوں مرنے کی حسرت ہو — لبِ ساحل وہ میری ڈوبتی تصویر دیکھینگے

الٰہی کس طرح دل کو نکالوں اپنے پہلو سے — وہ کہتے ہیں کہ ہم اک خوں بھری تصویر دیکھینگے

مرا دم توڑنا اے ہمنشینو اُن کو دکھلا دو — وہ مچلے ہیں کہ ہم ٹوٹتی ہوئی تصویر دیکھینگے

نظر آئے گا آنکھوں کو مرقع عالمِ دل کا
ریاضِ غمزدہ کی وہ اگر تصویر دیکھینگے

ریاض۔ الہ آباد

# اکبر الہ آبادی و شاد عظیم آبادی

"نگار" کے اپریل نمبر میں ایک تنقیدی مضمون "اکبر و شاد کی خصوصیات شاعری" پر شائع ہوا ہے۔ مضمون نگار نے دونوں اُستادوں کے اشعار بالمقابلہ درج کرکے موازنہ کا حق ادا کرنا چاہا ہے۔ عنوان ہی سے جیسا کہ قابل مقالہ نگار کا خیال تھا، ہم بلا متحیر ہوئے نہیں رہ سکے۔ واقعی عوام کے لئے اکبر و شاد کا تقابل جس قدر بھی حیرت انگیز ہو کم ہے۔ سید شاہ ولی الرحمن صاحب کی یہ کوشش قابل ستائش ضرور ہے کہ آپ نے دو مختلف رنگ کے کہنے والوں میں موازنہ کی زحمت گوارا فرمائی۔ شاہ صاحب نے تمہید میں اکبر و شاد کی شاعری پر ضمنی بحث فرماتے ہوئے، دونوں کے امتیازات ذاتی کو نمایاں کیا ہے۔ اس کے بعد چند دفعات قائم کرکے اکبر و شاد کی مابہ الاشتراک کیفیات کا مجمل خاکہ کھینچا گیا ہے۔

قبل اس کے کہ میں شاہ صاحب کے مبحث کے متعلق کچھ عرض کروں۔ دونوں کی شاعری پر چند سطور اپنے نقطہ نظر سے پیش کرتا ہوں۔

حضرت اکبرؔ کی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے ہوئی تھی اور یہ رنگ جناب کے اوائل شباب سے عمر کے درمیانی حصہ تک پہونچا۔ وفات کے پندرہ بیس سال قبل مرحوم نے غزلگوئی بالکل ترک کردی تھی۔ مگر حد کمال کو پہونچاکر۔ اردو شاعر کے لئے غزلگوئی پہلا درجہ ہے، اگر وہ اور اصناف سخن میں کمال حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کو سب سے پہلے غزل ہی میں مہارت تامہ بہم پہونچانی ہے، چنانچہ حضرت اکبر مرحوم اس کی بہترین مثال ہیں۔ مرحوم نے جب تک تغزل کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہونچالیا، دوسری طرف قدم اُٹھانے کی جرأت نہیں فرمائی، جس کا ثبوت مرحوم کے دواوین سے بخوبی مل سکتا ہے۔

حضرت شادؔ مدظلہ کی عمر اس وقت نوّے برس سے بھی متجاوز ہے۔ حسب بیان تذکرۂ الشعر الہند آپ کی شاعری عنفوان شباب ہی سے شروع ہوگئی۔ اس حساب سے جناب کی مشق سخن کا زمانہ

ستر سال سے زیادہ ہوتا ہے حضرت شاد کی شاعری پر جن خیالات کا اظہار شاہ صاحب نے فرمایا ہے ہم ان کے ماننے کے لئے تیار ہیں، مگر موازنہ میں شاہ صاحب کا حسن ظن حضرت شاد کے متعلق بہت کچھ پردہ پوش حقیقت ہوا جسکی وجہ سے حضرت اکبر مرحوم بے انصافی یا تنگ نظری کے شکار ہوئے اب میں شاہ صاحب سے چند جگہوں پر ان کی رائے سے اختلاف کرنے کی جرأت کرتا ہوں امید ہے کہ وہ مجھے ایک نادیدہ نیازمند خیال فرمائیں گے۔

شاہ صاحب کا یہ فرمانا کہ حضرت اکبرؔ محض اپنے ظریفانہ رنگ سے "اکبر" ہیں۔ ایک قادر الکلام ہمہ گیر شاعر کی شان میں سراسر گستاخی ہے شاہ صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ حضرت اکبر کی جولان گاہ تغزل جناب کی حد خیال سے کوسوں دور ہے۔ اگر شاہ صاحب کو حضرت شاد سے حسن ظن تھا، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ خواہ مخواہ انصاف کا گلا کند چھری سے کاٹا جائے۔

آگے چل کر شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ "باوجود خصوصیات مشترکہ کے دونوں کی راہیں جداگانہ ہیں حضرت اکبر کی جولان گاہ ظرافت آمیز کلام ہے ...... حضرت شاد کا رنگ تغزل عجیب وغریب ہے۔"

سطور بالا کا صاف مطلب ہے کہ شاہ صاحب حضرت اکبر کو محض ظرافت وغیرہ میں یگانہ فن تسلیم کرتے ہیں، اور حضرت شاد کے تغزل کے تو اس قدر مداح ہیں کہ جناب کا اشہب خامہ سرزمین ہند سے گذر کر خاک پاک شیراز تک پہونچا چنانچہ حضرت شاد کے مجازی طرز کلام میں آپ کے نزدیک ایک دنیائے حقیقت مضمر ہے، اس خصوصیت میں وہ خواجہ شیرازی سے مناسبت رکھتے ہیں" آفرین باد بریں ہمت مردانہ تو

یہ ہیں وہ اعتقادات جن کو شاہ صاحب نے موازنہ میں بھی جابجا نمایاں کیا ہے۔ ہمارے خیال میں ایسے عقیدت مند کے لئے تو موازنہ کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ موازنہ سے اس مدح سرائی کو تقویت پہونچانا چنداں خوب نہ تھا۔ کیا ایسے پکے مرید کے بارے میں ہمارا یہ خیال بیجا ہے کہ اس نے موازنہ میں کیفیت قلبی سے مجبور ہو کر انتخاب کلام میں اپنے اعتقادات محکمہ کو ملحوظ رکھا ہو۔ تعجب ہے کہ چند جگہوں پر کیونکر جناب اکبر کی روح کی خوشنودی مد نظر رکھی

گئی ہے۔

اب میں شاہ صاحب کے انتخاب موازنہ پر ایک سرسری نظر ڈالتا ہوں، جس سے ناظرین اندازہ کر لیں گے کہ کہاں تک اظہار حقیقت سے چشم پوشی کی گئی ہے۔

اکبر

حباب آسا اٹھایا بحر ہستی میں جو سر اپنا بنایا بس وہیں موج فنا نے ہمسفر اپنا

شاد

موج فنا مٹا نہ دے نام و نشان وجود کا دیکھ حباب کی طرح شوق نہ کر نمود کا

"دونوں شعروں میں یہ اخلاقی حقیقت بیان کی گئی ہے کہ زندگی کا انجام موت ہے۔ غور وخود بینی کا نتیجہ فنا ہے اکبر کا شعر محض اظہار حقیقت ہے بخلاف شاد کے شعر میں بیان واقعہ کے ساتھ عبرت پذیری وسبق آموزی کا پہلو موجود ہے۔ اور طرز ادا نے اس شعر کو اور چمکا دیا ہے"

عقیدت مندی ملاحظہ ہو۔ حضرت اکبر شعر بجائے خود اس قدر مکمل ہے کہ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں، تاہم کچھ عرض کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

(۱) حباب کے ساتھ بحر ہستی کی مناسبت نہایت موزوں ہے۔ جناب شاد نے اس کا التزام نہیں فرمایا۔

(۲) حضرت اکبر کے دوسرے مصرعہ اور جناب شاد مدظلہ کے پہلے مصرعہ کا مضمون بالکل متحد ہے، مگر لطف و پاکیزگی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ موج فنا کا ہمسفر ہونا، ایجاز بلیغ ہے، جس میں بے ساختگی کا پہلو غالب ہے برخلاف اس کے جناب شاد محض اس خطرہ کا اظہار فرما رہے ہیں جو حباب کو موج فنا سے پیش آنے والا ہے۔

(۳) حضرت اکبرؒ کے شعر کی معنویت بدرجہا بڑھی ہوئی ہے۔ حضرت اکبر کا شعر علمی تعلیم کا بہترین نمونہ ہے اور جناب شاد کا شعر ایک خیالی خاکہ ہے جس کے وجہ سے شعر میں تکلف پیدا ہوگیا ہے اور طرز ادا کی خوبی جاتی رہی۔

اکبر پروانہ جل کے خاک ہوا شمع رو چکی تاثیر حسن و عشق جو ہونی تھی ہو چکی

## شاد

پروانہ کی میت جب یوں آگ میں جلتی ہے گو سخت ہے ظاہر میں پھر شمع پگھلتی ہے

شاہ صاحب، حضرت اکبر کے شعر کو بے نیاز تعریف قرار دیتے ہوئے، حضرت شاد کی بلاغت کے مداح ہیں کہ وہ مضمون آفرینی میں جناب اکبرؒ سے کم نہیں رہے۔ سبحان اللہ۔

حضرت اکبر نے جس اختصار لطیف سے کام لیا ہے، اسکی تصویر الفاظ سے کھینچنا ناممکن ہے۔ شعر کیا ہے حسن و عشق کا ایک عظیم الشان مرقع ہے۔ جتنا ہی سوچیۓ اتنا ہی لطف دوبالا ہوگا۔ سلاست الفاظ، عبرت معنی کے ساتھ محبت کی داستان کو ایک شعر میں اس طرح ادا کرنا گویا دریا کو کوزہ میں بند کرنا ہے۔

حضرت شاد کے شعر کی بندش حضرت اکبر کے شعر کے مقابلہ میں سست ہے۔ پہلے مصرعہ میں "یوں" زائد ہے دوسرے مصرعہ میں "پھر" کے بعد "بھی" کا لفظ حشو کریہ ہے

### اکبر

اگرچہ تکلیف نزع میں ہو، سکون خاطر بھی کم نہیں ہے کسی سے ملنے کی ہیں امیدیں کسی سے چھٹنے کا غم نہیں ہے

### شاد

آخر ہے عمر، ضیق میں دل بھی ہے جان بھی مردانہ باش! ختم ہے یہ امتحان بھی

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ "اکبر کے شعر کا مفہوم یہ ہے کہ معشوق حقیقی کے وصال کی امید ہے اور زوال دنیا سے مفارقت کا مطلق رنج نہیں....... شاد کے شعر کا مفہوم بہت بلیغ وارفع ہے وہ کہتے ہیں کہ عالم وجود میں آنا معشوق حقیقی سے دور ہونا تھا زندگی کی تمام تکالیف و مصائب بطور امتحان عشق و محبت کے تھے" اس کے بعد شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ "ظاہر ہے کہ شاد کے شعر میں جو حقائق و اسرار، اسالیب بلاغت اور جوش بیان موجود ہے، اکبر کے شعر میں نہیں" پیراں نمی پرند مریدان می پرانند

حضرت اکبر کا شعر چند وجوہ سے حضرت شاد کے شعر سے اعلیٰ ہے

(۱) حضرت اکبر کا شعر صنعت تضاد کی بہترین مثال ہے۔ تکلیف۔ سکون۔ ملنا۔ چھٹنا کے

اجتماع سے جو لطف پیدا ہو گیا ہے اہل ذوق سے پوشیدہ نہیں۔

(۲) بقول شاہ صاحب۔ حضرت شاد اگرچہ اس وجود دنیاوی کو ایک امتحان محبت سمجھتے ہے اور معشوق حقیقی کے قرب کا ذریعہ خیال کرتے ہیں، تاہم آخری وقت میں دل و جان کی بیچینی سے گھبرا کر "مردانہ باش" پکار اُٹھے ہیں برخلاف اس کے حضرت اکبر شاہد حقیقی کے خیال میں اسقدر محو ہیں کہ اُنھیں نزع کی تکلیف کا احساس نہیں ہوتا اور سکون خاطر میں کمی نہیں ہوتی، اور کیوں نہ ہو فنا فی العشق کی آخری منزل یہی ہے۔

(۳) حضرت اکبر کا شعر است۔ لالی شان لئے ہوئے ہے۔ مرحوم نے تکلیف نزع کی بے حسی اور سکون خاطر کی مکمل توجیہ دوسرے مصرعہ سے پیش کر دی ہے۔ حضرت شاد مدظلہ کا شعر الفاظ کا بے ربط مجموعہ ہے "یہ امتحان" کو امتحان محبت پر معمول کرنا شاہ صاحب ہی کا کام تھا۔ مدعی سست گواہ چست

اکبر

آنے دو مصیبت کو ذرا خانۂ دل پر  جو بند ہے غفلت میں وہ عبرت میں کھلے گا

شاد

جو دیکھے غور سے سارا بھرم کھلتا ہے دنیا کا  مصیبت آدمی کو صاحب ادراک کرتی ہے

"انگریزی کا ایک فلسفیا مقولہ ہے" ادبار بہترین مدرسہ تربیت ہے" اسی مفہوم کو دونوں نے نظم کیا ہے شاد کے شعر کو قطعی ترجیح ہے، ان کا دوسرا مصرعہ تو مقولہ مذکور کا آزاد ترجمہ معلوم ہوتا ہے" ناظرین انصاف فرمائیں، کیا شاہ صاحب کی ترجیح بلا مرجح نہیں ہے۔ اکبر کا شعر کئی حیثیتوں سے بڑھا ہوا ہے۔

(۱) لفظی اعتبار سے حضرت اکبر کا شعر بے نظیر ہے۔ خانہ۔ بند ہونا۔ کھلنا۔ غفلت۔ عبرت۔ ان رعایات لفظی کے ساتھ معنویت پر قابو رکھنا اکبر ہی سے قادر الکلام استاد کا کام تھا۔ اسکے مقابلہ میں شاہ صاحب نے ایک ایسے شعر کو پیش کیا ہے جس کے دونوں مصرعے آپس میں مرتبط بھی نہیں ہیں۔

(۲) اکبر کے شعر کا تیور بھی نرالا ہے۔"آنے دو" سے زجر و تخویف کا پہلو نمایاں ہے "ذرا" نے مصرعہ میں جان ڈالدی ہے۔

حضرت شاد نے دوسرے مصرعہ میں تصریح کو زیادہ ملحوظ رکھا ہے اسلئے لطف جاتا رہا حضرت اکبر نے اس امر کو کنایہ سے ادا کیا ہے اور الکنایۃ احسن من التصریح

اکبر

آئے گی تجھکو نظر صانع قدرت کی جھلک — سامنے کچھ نہ رکھ آئینۂ فطرت کے سوا

شاد

صانع کو دیکھنا ہے تو عالم پہ نظر کر — آئینہ آئینہ ہے خود آئینہ ساز کا

شاہ صاحب کا خیال ہے کہ "شاد کے شعر کو اکبر کے شعر پر فوقیت ہے خصوصاً مصرعہ ثانی کا زور بیان طرز ادا اور حسن بندش قابل داد ہے"۔

حسب معمول شاہ صاحب یہاں ترجیح بلا مرجح دینے سے باز نہ آئے۔ شاہ صاحب کو معلوم نہیں کہ جسے وہ زور بیان اور حسن بندش سمجھتے ہیں فی الحقیقت تنافر لفظی ہے۔

اکبر

دل ہے ملول فرقت قامت ورو‌ئے یار میں — بھاڑ میں جائیں سرو گل آگ لگے بہار میں

شاد

میں اور اسیر لالہ و گل ہجر یار میں — کیسی بہار آگ لگا دو بہار میں

"شاد کے شعر کا طرز ادا صفائی زبان، چستی بندش، بے ساختگی اور تیور محتاج بیان نہیں اکبر کا شعر اسکے مقابلہ میں بہت سست ہے اور لفظی رعایت نے اسے اور بھی بے مزہ کر دیا"۔

چہ خوش! "محتاج بیان نہیں" لکھکر فرض تنقید سے سبک دوش ہو گئے۔ "اکبر کا شعر اس کے مقابلہ میں بہت سست ہے" کیوں؟ نہیں بتاتے۔ "لفظی رعایت نے اسے اور بھی بے مزہ کر دیا" اچھا معلوم ہوا کہ شاہ صاحب رعایت لفظی کے بارے میں آنکھ بند کر کے کفر کا فتویٰ صادر فرما دیتے ہیں۔ خواہ اس سے حسن بیان میں چاشنی ہی کیوں نہ بڑھ جائے۔

## اکبر

دل بے تاب نے کیا کیا دکھائے ہیں مجھے عالم — یہ پرزہ بھی قیامت ہے خدا کے کارخانہ میں

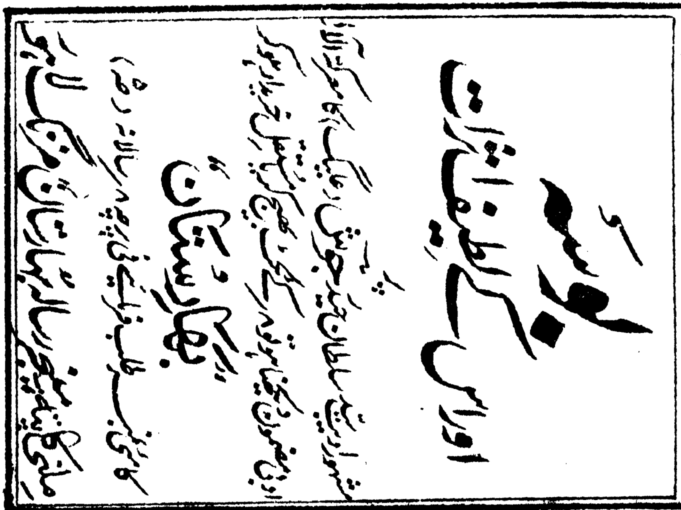
## شاد

سرکار دل کی ہوش ربائے زمانہ ہے — وسعت تو کچھ نہیں مگر اک کارخانہ ہے

"اکبر کا شعر صاف ہے شاد دل کی کیفیت کے متعلق فرماتے ہیں کہ دیکھنے میں دل تو ایک مختصر مضغہ گوشت ہے مگر اُس کے اندر ایک وسیع کارخانہ قدرت نظر آتا ہے

جذبات کا جلوہ گاہ دل ہے۔ اس شعر کے طرز ادا اور جوش بیان کو اکبر کا شعر نہیں پہونچتا اور معنوی محاسن کے لحاظ سے بھی شاد کا شعر کہیں مرجح ہے" شاہ صاحب نے حضرت شاد کے شعر کو ترجیح تو دیدی مگر کوئی معقول توجیہ نہ کرسکے حضرت اکبر کا شعر جناب شاد کے شعر سے کہیں اچھا ہے۔ باقی

---



# روحانیات

ظاہر میں ترے در کے گدا ہیں گدا۔ مگر
مدفون ہیں اُنکے گوشۂ عزلت میں دولتیں

پوچھوں کہ ہے یہ کس کی تمنا میں اضطراب
ٹھیریں اگر ذرا یہ ستاروں کی حرکتیں

کر غور سے ذرا رگِ گل کا مطالعہ
پیشِ نظر یہ مصحفِ گل کی ہیں آیتیں

تیری طلب کی تشنہ لبی جن کو ہے نصیب
چاروں طرف سے آن پہ امنڈتی ہیں رحمتیں

دیکھیں مجاز میں جو حقیقت کی جھلکیاں
کیا کیا بصارتوں سے لڑی ہیں بصارتیں

---

حُسن عالمگیر پر کس شوخ کے قائل ہوں میں
جنبشِ دائم میں ہوں۔عالم کا گویا دل ہوں میں

اپنے رازِ زندگی سے آج بھی غافل ہوں میں
گرچہ اسرارِ جہاں کا ایک ہی حامل ہوں میں

رہروی اور گمرہی دونوں ہیں میری ذات میں
ہادیٔ منزل ہوں میں سرگشتۂ منزل ہوں میں

اہرمن بھی ساتھ یزداں کے مری فطرت میں ہے
روشنیٔ حق ہوں میں تاریکیٔ باطل ہوں میں

خیر و شر کی کشمکش رہتی ہے میرے نفس میں
لائقِ دوزخ ہوں میں فردوس کے قابل ہوں میں

پہلے دنیائے لطافت میں تھا لیکن اندنوں
ہوں اسیرِ رنگ و بو پابندِ آب و گل ہوں میں

میری ہستی کے ہے پردہ میں چھپا سورج مگر
اس دھندلکے کی حقیقت سے ابھی غافل ہوں میں

---

تماشا دیکھنے کو اپنے حسن مہرِ آسا کا
شعاعیں بنکے جولاں گاہ ہستی میں بکھرتا ہوں

خدا ہے جب تو ہوا اپنی خودی کا کیوں یقیں مجھکو
میں اک سایہ ہوں اور سورج کے آگے سے گزرتا ہوں

حقیقت کے حرم تک گر رسائی ہو تو کیونکر ہو
طواف اپنے بتِ پندار کا ہر لحظہ کرتا ہوں

---

نہ جنت ہے۔ نہ دوزخ ہے۔ نہ ہے خوف و رجا اُس جا
وہ اک دنیا نئی ہے ہم جہاں کے رہنے والے ہیں

تمنا ہے کہ بچکر اُن سے پہنچوں کنج راحت تک تمناؤں نے جو پھندے مرے فطرت پہ ڈالے ہیں

---

شعاعیں پڑ رہی ہیں لپکتی روح کی جانب توجہ کا اثر دیکھو ذرا خلوت نشینوں میں

عجب دیوانہ ہوں۔ جو روح کے پردہ میں رہتا ہے اُسی میں ڈھونڈتا پھرتا ہوں کن محمل نشینوں میں

وہ درویشوں کے در پر شل پا انداز بچھتا ہے غرور جاہ و دولت جو ہے ان مسند نشینوں میں

جھلک سی تو نے دکھلا دی ہے کوہ طور پر جب سے پڑی ہے کھلبلی یارب گمانوں میں یقینوں میں

حقیقت جب سے اپنے نفس کی عریاں ہوئی ہم پر مزا پایا ہے نصرینوں کا اکثر آفرینوں میں

---

سطح کے جاننے والوں میں ہے اک شور بپا ہے خموشی تہ دریا کے خبرداروں میں

ہے یہ دانائی۔ ملو دوست سے ناداں بنکر عقل کی پوچھ نہیں عشق کی سرکاروں میں

نظر غور سے انفاس کو دیکھ اے غافل کس کی مضراب سے جنبش ہوئی ان تاروں میں

---

اب تک مئے الست کا اترا نہیں نشہ یارب معاف کر یہ مری لڑکھڑاہٹیں

مل جائے تیرے پاس پہونچنے کی مجھکو راہ مرکز سے اپنے گر یہ ستارے ذرا ہٹیں

رنگوں کی شوخیوں پہ ٹھہرتی نہیں نظر ہیں تیری موج نور کی یہ تلملاہٹیں

سلیم پانی پتی

---

# واردات قلب

ہے خود مری کوششوں کا حاصل یہ آج ہے جو مآل میرا
کہ خواب ہے ایک میرا ماضی اور اُس کی تعبیر حال میرا

جہاں میں ہیں اور بھی تو قصے کچھ اور کہہ داستاں سرا تو
یہ کیا ستم ہے کہ خود مجھے ہی سنا رہا ہے تو حال میرا

یہ راز کیا ہے یہ بھید کیا ہے کہ ہر خدا میں ہے حسن تیرا
خدا ہزاروں بنا بنا کر دکھا رہا ہے خیال میرا

میں پوچھتا ہوں کہ تو کہاں ہے جواب ملتا ہے ہر طرف سے
"اگر کوئی کام لے نظر سے تو ہر جگہ ہے جمال میرا"

اسی روش پر چلیگی دنیا مجھے نظر آرہا ہے افسرؔ
نہیں ہے گو آج ساری دنیا میں ایک بھی ہم خیال میرا۔ افسرؔ

## دربار اکبری

قارئین "اکبر" کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ ہندوستان کے مشہور ادیب خاں صاحب محمود علی خاں صاحب عرف آغا علی خاں تعلقدار و اسپشل مجسٹریٹ نے رسالہ کی اعزازی ادارت قبول فرمالی ہے قبل از وقت کسی امر کا اظہار آئین ادارت کے خلاف ہے تاہم اتنا ضرور ہے کہ "اکبر" کی دلچسپیاں اہل ملک کو بہت جلد اپنے طرف کھینچ لینگی

*

بعض اصحاب کی رائے ہے کہ رسالہ کا حجم ۸۰ صفحات کر دیا جائے۔ بجائے خود کسی خادم ادب کو اس رائے کے بہترین ہونے میں احتمال نہیں ہوسکتا مگر ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ قدردانان "اکبر" کو صفحات کی افزونی سے اسی وقت خوشی ہوگی، جب کہ قیمت نہ بڑھائی جائے، اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہر خریدار اپنے ذاتی اثر سے رسالہ کے لئے کم از کم دو خریدار فراہم کرے۔

*

اگر آپ نے ہماری گذارش پر توجہ فرمائی، تو انشاء اللہ "اکبر" ہندوستان کا واحد ادبی رسالہ ہوکر رہیگا۔

*

"اکبر" کی ہر دلعزیزی کا اس سے بڑھکر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے، کہ ہندی اور بنگالی رسالوں میں بھی "اکبر" کے مختصر فسانوں کے ترجمے اعزاز کے ساتھ شایع کئے جاتے ہیں جادو وہ جو سر پہ چڑھکر بولے۔

ہاں اگر "اکبر" کو کوئی شکایت ہے تو اپنے موقر معاصرین سے، جو اس کے معاصرانہ حقوق کو پائمال کرنے میں ذرا بھی دریغ نہیں کرتے۔ مضامین کی نقل و اخذ سے رسالہ کا کچھ نقصان نہیں، مگر حوالہ تو کجا مضمون نگار کا نام بھی نہ لکھنا کہاں کا انصاف ہے میرٹھ کے ہفتہ وار اخبار "عالمگیر" میں ڈاکٹر اعظم صاحب کریوی کا ایک فسانہ "تارگھر"۔ "اکبر" کے فروری نمبر سے نقل کیا گیا ہے۔ فاضل اڈیٹر نے خدا جانے کس مصلحت سے "اکبر" اور اسکے فسانہ نگار کو فراموش کر دیا ہے۔

اپنوں سے اچھے غیر ہیں۔ بدلہ جو دیں احسان کا۔

*

اس مرتبہ "اکبر" کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر واقع ہوگئی ہے۔ اردو کے رسالے عذر و اعتذار میں اسقدر بدنام ہیں کہ مشکل سے ان کا اعتبار کیا جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ۲۹ اپریل سے الہ آباد کے بجلی گھر میں کچھ ایسی خرابی آگئی تھی جسکی وجہ سے برقی مشینیں بیکار ہوگئیں۔ لامحالہ ہمیں بھی ایک غیر معلوم مدت تک انتظار کرنا پڑا امید ہے کہ ناظرین "اکبر" ہمیں معذور سمجھ کر معاف فرمائیں گے۔

*

موجودہ رسالہ میں عدم گنجائش کی وجہ سے چند بہترین مضمون اور دلچسپ نظمیں رہ گئیں۔ بتصرہ ادارت کا فرض اہم ہے، جسکی بجاآوری اخلاقی طور سے ہر فرد پر واجب ہے اگر خدا نے چاہا تو آئندہ اشاعت میں یہ کمی پوری کر دی جائے گی۔

## آخری دن میں پچھتاؤ گے



# وہ کون تیل ہے

جو بال بڑھانے مین درجہ اول ہو ؟ سندری سہاگ ہی

جو قوت و بصارت کو بڑھاتا ہو ؟ سندری سہاگ ہی

جو دماغ کی خشکی اور کمزوری کو دور کرتا ہو ؟ سندری سہاگ ہی

جو دل و دماغ دونون کو معطر کرتا ہو ؟ سندری سہاگ ہی

جو دردسر نزلہ زکام کو دور کرتا ہو ؟ سندری سہاگ ہی

جو بالون کو گھونگھر والا اور چمکدار بناتا ہو ؟ سندری سہاگ ہی

جو گرے ہوئے بالونکی جگہ نئے بال پیدا کرتا ہو ؟ سندری سہاگ ہی

جو مٹی کے تیل یا نقصان رسان جزو سے پاک ہو ؟ سندری سہاگ ہی

جسکے استعمال سے بال چکٹتے نہیں ہین ؟ سندری سہاگ ہی

جسکے استعمال سے بال سفید ہونیسے محفوظ رہتے ہین ؟ سندری سہاگ ہی

جسکے استعمال سے عورت و مرد دونون خوش رہتے ہین ؟ سندری سہاگ ہی

لہذا جب سندری سہاگ مین تمام خوبیان موجود ہین تو پھر آپ کے منگانے مین کیا تامل ہے؟ کیا ایک شیشی ارسال خدمت کیجئیگا؟

قیمت فی شیشی ایک روپیہ تین شیشی کی قیمت ۔۔ محصول علاوہ

## ترقی حسن کی خواہش ہے تو سندری اسنو استعمال کرو




یہ خوشبودار سنو ہر چہرہ پر ملتے ہی جلد مین جذب ہوجاتا ہی اور رنگت کو نکھار دیتا ہی۔ چہرے کے گڑھے اور رخسارون کو بھرتا ہے۔ چھیپ مہاسے۔ جھائیان۔ داغ دھبے پھنسی اور گرمی دانون کو دفع کرتا ہے۔ مرد و عورت دونون کیلئے یکسان مفید ہے۔ قیمت فی پاٹ بارہ آنہ

محصول ہر حیثیت کا علاوہ دینا ہوگا

فرمائش کے وقت رسالہ اکبر کا حوالہ ضرور دیجئے گا۔

ملنے کا پتہ۔ ایس کے بی بخشی اینڈ کمپنی۔ موجد سندری سہاگ تیل۔ پوسٹ بکس ۱۱۸ کلکتہ

کوٹھی نمبر ۷۰ کولوٹولہ اسٹریٹ

# "آئین اکبری"

(۱) "اکبر" ہر ماہ کے اخیر ہفتہ میں شائع ہوگا

(۲) "اکبر" کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ حضرت لسان العصر اکبر مرحوم کے غیر مطبوعہ کلام و خطوط شائع کئے جائیں

(۳) "اکبر" میں تمام ایسے عالمانہ و محققانہ مضامین شائع ہونگے جن میں ادبی رنگ غالب ہو

(۴) "اکبر" للعہ/ بارہ مہینے اور عہ/ میں چھ ماہ کے لئے جاری کیا جائیگا نمونہ کے لئے ۱/ کا ٹکٹ آنا ضروری ہے

(۵) جو اصحاب ایک سال کے لئے پانچ خریدار دینگے اُن کی خدمت میں صہ/ یا پانچ روپیہ نقد یا ایک سال کے لئے "اکبر" مفت حاضر ہوگا

(۶) مضامین کے متعلق جملہ خط و کتابت جناب مدیر کے نام اور دیگر امور و ترسیل زر منتظم کے نام ہونی چاہئے

(۷) جواب طلب امور کے لئے ایک آنے کا ٹکٹ ارسال فرمائیے۔ جو مضامین شائع نہ کئے جائیں گے ۱/ کا آنے پر واپس کئے جاسکتے ہیں۔

## نرخ نامہ اشتہارات

| تعداد طبع | ایک صفحہ |
| --- | --- |
| ۱۲ | سیو |
| ۹ | سہ |
| ۶ | عسہ |
| ۳ | عہ |
| ۱ | للعہ/ |

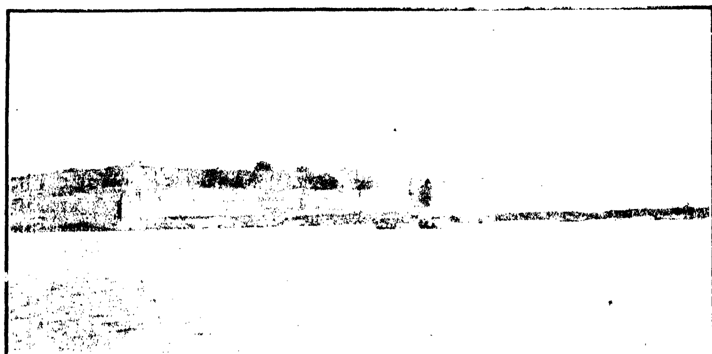
منتظم "اکبر" الہ آباد


مطبوعہ دی اسٹار الکٹرک پرنٹنگ ورکس نمبر ۴۲ شیو چرن لعل روڈ الہ آباد

پرنٹر سید محمد الحسن بی-اے (علیگ)۔ پبلشر جناب تسلیم الدین صاحب شرقی بی-اے

رجسٹرڈ نمبر اے-۱۵۴۶

انجمن دائرۃ الادب الہ آباد کا ماہوار رسالہ



# اکبر

بیادگار لسان العصر حضرت اکبر مرحوم الہ آبادی

# چند عجیب و غریب اشیاء

## جیبی سگریٹ مشین

ایک گھنٹہ میں ۴۰۰ سگریٹ تیار کرتی ہے ترکیب نہایت سہل ہے تمام کی تمام کلٹ کی ہوئی ہے نہایت ہی مختصر اور چھوٹی سی مشین ہے سفر کے لئے نہایت ہی مفید چیز ہے کیونکہ یہ کوٹ کی جیب میں بھی رکھی جاسکتی ہے قیمت فی مشین صرف چار روپیہ ڈاک خرچ علاوہ۔

## ہینڈ کیمرہ

یہ کیمرہ خاص طور پر جرمنی سے تیار کروایا گیا ہے عورت، مرد، جانور، درخت، مکان، گرجا، مسجد، مندر اور ریل وغیرہ چلتے پھرتے اور بیٹھتے ہوئے کی خوبصورت اور دلپسند فوٹو اتارنے کے لئے کم ازکم ایک بار ضرور منگائیں، قیمت چھوٹا سائز پانچ روپیہ بڑا سائز دس روپیہ علاوہ خرچ ڈاک۔

## آگ جلانے کی مشین

اس مشین سے کئی کام لئے جاسکتے ہیں۔ مثلاً بلا مدد دیا سلائی آگ جلانا سگریٹ جلانا وغیرہ وغیرہ قیمت فی مشین صرف ایک روپیہ آٹھ آنہ علاوہ خرچ ڈاک۔

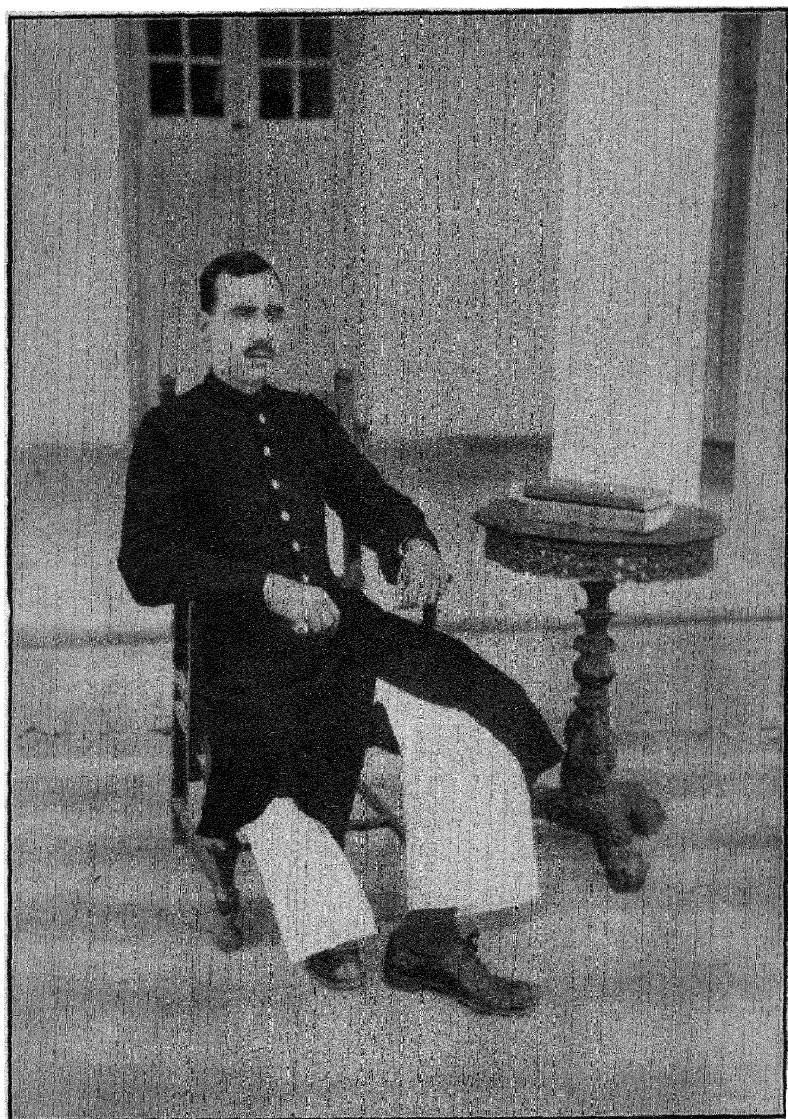
## کشیدہ کاڑھنے کی مشین

لڑکیاں اس سے کرسیوں کی گدیاں، سرہانوں کے غلاف، غالیچے، شال، چادریں، ڈوپٹے، سوٹ وغیرہ وغیرہ غرضکہ کئی قسم کے گرم، سرد اور ریشمی کپڑوں پر اون، سوت اور ریشم سے ہر قسم کے پھول اور گلکاریاں بناسکتی ہیں، ترکیب نہایت آسان ہے، غریب لڑکیوں کے لئے روزگار اور امیروں کے لئے ایک اعلیٰ تحفہ ہے قیمت فی مشین صرف چار روپیہ علاوہ خرچ ڈاک

## جیبی چھاپا خانہ یا مہر گھر

یہ انگریزی کا جیبی چھاپا خانہ قابل تعریف ہے اس سے لفافہ، ملاقاتی کارڈ اور سفر میں جو دل چاہے چھاپ سکتے ہیں قابل تعریف ہے قیمت فی چھاپہ خانہ صرف دو روپیہ علاوہ خرچ ڈاک۔

**مینیجر ریکاس اینڈ کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۹۹ لاہور**



Khan Sahib Mahmud Ali Khan *alias* Aga Ali Khan,

Special Magistrate, Allahabad.

The Indian Press, Ltd., Allahabad.

چیف ایڈیٹر خانصاحب محمود علی خان عرف آغا علی خان اسپشل مجسٹریٹ الہ آباد



مدیر - ڈاکٹر اعظم کریوی    نائب مدیر سید طالب علی طالب الہ آبادی

# جلد ۲ | رسالہ اکبر بابت مئی سنہ ۱۹۲۶ء | نمبر ۵


| نمبر شمار | مضمون | مضمون نگار | صفحہ |
|---|---|---|---|
| ۱ | کلام اکبر | | ۲ |
| ۲ | مکتوب اکبر | بنام الف دین صاحب بی-اے وکیل | ۲ |
| ۳ | شیاما (افسانہ) | مدیر | ۳ |
| ۴ | ثمود و نوح | حضرت نوح ناروی | ۱۱ |
| ۵ | کہاں رہے (نظم) | سید طالب علی صاحب طالب الہ آبادی | ۱۷ |
| ۶ | شاعری اور اسکے ارکان خمسہ | اسرار احمد صاحب فاضل ادب و دینیات | ۱۸ |
| ۷ | لوری | حامد اللہ صاحب افسر بی-اے-ایم-آر-اے-ایس | ۲۴ |
| ۸ | روشن آرا کی موت | محمد زبیر صاحب روحی معلم ہائی اسکول کانپور | ۲۵ |
| ۹ | کب تک (نظم) | جلیل احمد صاحب قدوائی (علیگ) | ۲۹ |
| ۱۰ | حریف خوبان (نظم) | جناب حزیں صاحب نوگانوی نائب مدیر رہنماے تعلیم | ۳۶ |
| ۱۱ | اکبر الہ آبادی و شاد عظیم آبادی | چودہری سید افضال احمد صاحب فاضل ادب | ۳۷ |
| ۱۲ | محشرستان خیال (نظم) | محمد زبیر صاحب روحی | ۴۴ |
| ۱۳ | گوہر عصمت | سید طالب علی صاحب طالب الہ آبادی | ۳۵ |
| ۱۴ | مالی | اولاد احمد صاحب عالی | ۵۱ |
| ۱۵ | ایک واقعہ | سید ماجد علی صاحب ماجد بی-اے-ایل ایل بی | ۵۵ |
| ۱۶ | نقش پائدار پر ایک نظر | سلیم اللہ صاحب بی-اے | ۵۷ |
| ۱۷ | حسن تخیل (نظم) | جناب حافظ صاحب غازیپوری | ۵۸ |
| ۱۸ | دربار اکبری | مدیر | ۵۹ |

# کلام اکبر

جاہ و زر کے رہے انگلش سے ہمیشہ طالب
عہد پیری میں بدل سکتے ہیں کیونکر قالب
مشتہر کر دین یہ ہمدم ہیں جناب جالب
زندگی بھر تو رہا عشق بتوں کا غالب
آخری وقت میں کیا خاک مسلمان ہونگے

کوچہ سروس انگلش میں رہے ہم ساکن
جاہ و زر ہی کی تمنا میں کٹے زیست کے دن
وعظ گاندھی سے بدل سکتے ہیں کیونکر باطن
عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

# مکتوب اکبر

الہ آباد

۲ مارچ سنہ ۱۹۱۸ء

مکرمی سلمہ اللہ تعالےٰ مثنوی معارف اسلام میں نے دیکھی۔ خاک پنجاب سے اس نور کا ظہور آپ کے اہل وطن کو مبارک ہو۔ اس سے زیادہ صاف۔ صحیح اور سلجھے ہوئے خیالات اس وقت کی کسی نظم میں نظر سے نہیں گذرے۔ یہ تصنیف آپ کے عمدہ ترین اعمال صالح میں انشاء اللہ محبوب ہو گی۔

حب شخص۔ حب وطن۔ اور حب اللہ یہ بات تو بے مثل ہے

افسوس ہے کہ ناتندرستی و ناتوانی زیادہ تحریر سے روکتی ہے آپ نے آیات قرآنی کو جا بجا نہایت خوبی سے اشعار میں داخل کر دیا ہے لڑکے یاد کر لیں تو بہت مفید ہو۔

اب اور کیا کہوں آپ نے خود ہی ہدایت کر دی ہے۔ وتبتل الیہ تبتیلاً

خدا آپ کے لائق اور ذی علم اہل وطن کو اور ہم سب مسلمانوں کو توفیق عطا فرمائے کہ خود نمائی جنگ باہمی اور بحث غیر ضروری کے مذاق کو چھوڑ کر طاعت الٰہی اور موعظہ حسنہ میں مصروف ہوں۔ نثر میں بھی کوئی رسالہ لکھئے۔ جیتا رہا تو مشورت کو حاضر ہوں۔

دعا کا طالب اکبر

# شیاما

ٹھاکر شیر سنگھ سورج بنسی راجپوت تھے کانپور سے ۲ میل کے فاصلہ پر پورب جانب بسیا کھی نام کا ایک گاؤں تھا دہاں کے وہ زمیندار تھے شیاما اُن کی اکلوتی لڑکی تھی اُسکی غیر معمولی حسن کی روشنی سے ٹھاکر صاحب کے گھر کا گوشہ گوشہ روشن رہتا تھا۔ حسن کی کلی ایک مخصوص چار دیواری کے اندر کھلی تھی لیکن اب اسکی مہک سے سارا گاؤں معطر تھا۔ پھول باغ میں کھلتا ہے لیکن اُسکی خوشبو دور دور فضا میں پھیل جاتی ہے شیاما حسن کی دیوی تھی جب وہ ہنستی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سورج مکھی کی کلی مسکرا رہی ہے جب وہ اپنی جادو بھری نشیلی آنکھیں اٹھا کر کسی طرف دیکھتی تو ہوا سے مستی برسنے لگتی۔ وہ کسی کالج کی گریجویٹ نہ تھی تو بھی تھوڑی بہت اُردو ہندی لکھ پڑھ سکتی تھی۔ پنگھٹ پر ہمجولیوں سے چہلیں کرنا مویشیوں کے ساتھ بن کی طرف نکل جانا اس کے لئے روزانہ کا کھیل تھا۔ اس کی منگنی جب وہ دو چار ہی سال کی تھی کانپور کے ٹھاکر دلیر سنگھ کے لڑکے بلونت سنگھ سے ہو چکی تھی۔

شیاما جب جوان ہوئی تو بلونت سنگھ کے ساتھ جو اسوقت الہ آباد کے میور کالج میں بی۔اے میں پڑھتے تھے شادی ہو گئی۔

(۲)

شادی ہونے کے بعد شیاما اپنے سسرال کانپور چلی گئی۔ اس کے لئے یہ پہلا موقع تھا کہ وہ دیہات سے نکل کر شہر میں آئی تھی۔ شہر کی ہر چیز اس کے لئے نئی تھی۔ ٹھاکر دلیر سنگھ کا گھر نئی روشنی کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا۔ شیاما کی ساس اور نند کھلی گاڑی میں شام کو سیر کرنے جاتی تھیں پردہ سے انھیں نفرت تھی غیر مردوں سے بات چیت کرنا اُن کے خیال میں کوئی عیب نہ تھا شیاما کی نند نے جس کا نام کملا تھا امسال انٹرنس کا امتحان پاس کیا تھا اس کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی۔ گھر کا کوئی شخص اس دیہاتی لڑکی شیاما کے ساتھ بلونت سنگھ کی شادی نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن ٹھاکر دلیر سنگھ وعدے کے سچے اور بات کے پکے تھے انھوں نے اپنے دوست شیر سنگھ سے جو وعدہ کیا تھا اُسے پورا کر دیا انھوں سنے

کسیکی مخالفت کی کچھ پرواہ نہ کی اور بلونت سنگھ کی شادی شیاما کے ساتھ کر ہی دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ٹھاکر دلیر سنگھ کے سوا تمام لوگ شیاما سے جلنے لگے۔ بلونت سنگھ کی ماں اور بہن نے اتنی جھوٹی شکایتیں کیں کہ بلونت سنگھ کا دل شیاما کی طرف سے پھر گیا۔ بلونت سنگھ مہذب تھا۔ تعلیم یافتہ تھا بھلے برے کی پہچان رکھتا تھا یہ سب کچھ سہی مگر ماں اور بہن کی باتوں کا کیوں نہ یقین کرتا۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ شیاما بد تہذیب۔ جاہل اور پھوہڑ ہے اُسے بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں۔ بلونت سنگھ نے شیاما کی بُرائیاں سنکر ماں سے کہا بھی کہ "ماں جی جب یہ سب باتیں تھیں تو آپ نے میری شادی اس دیہاتی لڑکی سے کیوں کی" اسکا جواب اسکی ماں یہ دیتی "میں کیا کروں یہ سب کچھ تمہارے باپ نے کیا"

جب شیاما نے سسرال کا یہ حال دیکھا تو گھبرا گئی۔ اس کی بات بات پر نکتہ چینیاں ہونے لگیں۔ جب وہ گھونگھٹ نکال کر چلتی تو سب اس کا مذاق اُڑاتے اُسے اُٹھنا بیٹھنا دشوار ہو گیا۔ شرم و حیا کی دیوی شیاما یہ سب مصیبتیں بخوشی اُٹھانے کے لئے تیار تھی اگر بلونت سنگھ کی اُس پر نظر عنایت رہتی وہ اُس سے پیار و محبت کی باتیں کرتے۔ لیکن لنکا میں ہر شخص راون تھا۔ ماں کا بہکایا ہوا۔ بہن کا سمجھایا ہوا فیشن کا شیدائی بلونت سنگھ بھلا شیاما سے کیسے خوش رہ سکتا تھا اس کی تو دلی منشا تھی کہ اس کی شادی کسی قابل گریجویٹ لڑکی سے ہوتی جو اس کے ساتھ کلب و تھیٹر میں جایا کرتی۔ جس روز سے شیاما اس کے گھر آئی تھی اُس نے اس کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ باہر کے بیٹھنے والے ٹھاکر دلیر سنگھ کو ان باتوں کی بالکل خبر نہ تھی۔

آج رات کی گاڑی سے بلونت سنگھ الہ آباد جا رہے تھے شیاما نے سوچا "آج وہ ضرور میرے پاس آئینگے" یہ خیال آتے ہی اُس نے اشنان کیا۔ آنکھوں میں سرمہ لگایا۔ بالوں میں کنگھی کی مانگ میں سیندور بھرا۔ کرشن بھگوان کا دل میں سمرن کیا اور پرارتھنا کی ساس اور نند نے جو لیونڈر اور پاؤڈر کی شوقین تھیں جب شیاما کو یہ دیہاتی سنگار کرتے دیکھا تو خوب مذاق اُڑایا۔ لیکن آج شیاما نے ان باتوں کا کچھ بھی خیال نہ کیا آج تو وہ بلونت سنگھ سے ملنے کی امید میں بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں گئی اور پلنگ پر لیٹ کر خیالی پلاؤ پکانے لگی "میں آج اُن سے ملکر پوچھوں گی کہ آخر میری کیا خطا ہے جو وہ مجھسے نہیں ملتے اگر وہ میری باتوں سے خفا ہوں گے تو میں اُن کے پاؤں سے لپٹ جاؤں گی دروازہ روک کر کھڑی ہو جاؤنگی اور جانے نہ دونگی ٹوپی چھین لونگی۔ گھڑی چھپا دونگی۔ قمیض پر سیاہی گرا دونگی۔ کوٹ پہننے نہ دونگی

آنچل سے ہاتھ باندھ لونگی۔ سر کے بال بگاڑ دونگی۔ اُن کے پاؤں پر اپنی آنکھیں ملونگی لیکن ان کو نہ جانے دونگی۔ مگر ہائے میں کیا بک رہی ہوں وہ میرے پاس آنے ہی کیوں لگے جب اتنے دن نہ آئے تو آج کیا آئینگے ....
وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور بلونت سنگھ داخل ہوئے۔ پر ارمان شیاما نے شرما کر گھونگھٹ کاڑھ لیا بس یہ ستم ہو گیا بلونت سنگھ کو یہ ادا بہت بُری معلوم ہوئی اور وہ شیاما سے بغیر کچھ کہے کمرے سے باہر نکل گئے۔ اب شیاما کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اس کے منصوبے خاک میں مل گئے اس کی زبان سے بیساختہ نکلا "پران ناتھ جاتے ہو تو ذرا دیر اور ٹھہر جاؤ؟ ہائے میرے نصیب آپ تو چلے ہی جاتے ہیں کیا پھر کر ایک نظر دیکھنے کی بھی قسم کھائی ہے"

(۲)

بلونت سنگھ کے جانے کے کچھ دنوں کے بعد شیاما کو اس کے سسرال والوں نے بیساکھی بھیجدیا جہاں وہ بڑی خاموشی سے اپنا دن گذارنے لگے۔ کبھی کبھی وہ بن کی طرف نکل جاتی اور مویشیوں کے جھُرمٹ میں ڈھاک کے پیڑ کے نیچے بیٹھکر اپنی حالت پر غور کیا کرتی۔ پپیہا کی "پی کہاں" کی آواز سے اس کا کلیجہ کانپ اُٹھتا دل میں ایک ہوک سی اٹھتی اور آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ اس کے ماں باپ اور گاؤں والوں کو شیاما کے اس انقلاب سے سخت حیرت تھی بہت پوچھنے پر بھی شیاما نے اپنا درد دل کسی کو نہ بتایا۔ اس نے کئی دفعہ بلونت سنگھ کے پاس خط بھی بھیجے لیکن بلونت سنگھ کو اپنے دوست احباب سے۔ کالج کے سپیچوں سے بورڈنگ ہاوس کے جلسوں ٹھٹھے اور سینما سے اتنی فرصت ہی کہاں ملتی تھی کہ وہ ناشاد۔ پُر ارمان دیہاتی لڑکی شیاما کے ٹوٹے پھوٹے محبت میں بھرے ہوئے خطوط کا جواب دیتا۔

ادھر بیساکھی بھیجکر سسرال والوں نے بھی شیاما کی کوئی خبر نہ لی۔ ان سب باتوں سے شیاما کا دل ٹوٹ گیا اس کا گلاب سا چہرہ مرجھا گیا۔ ماں باپ اس کی یہ حالت دیکھکر دل ہی دل میں کڑھتے تھے مگر کچھ نہ کر سکتے تھے۔ جاڑا آیا اور چلا گیا۔ برسات آئی اور گذر گئی گرمیوں کے دن آگئے لیکن شیاما کی حالت میں کوئی تغیر نہ ہوا ماں باپ ہر طرح سے اس کے دل بہلانے کی کوشش کرتے تھے مگر گل کے بغیر بلبل کو کہاں چین نصیب ہوتا ہے۔ شیاما کا بلونت اس سے روٹھا تھا اس کی آنکھوں سے نہاں تھا بھلا ایسی حالت میں وہ کیسے خوش رہ سکتی تھی۔

(۴)

موت کا کوئی وقت مقرر نہیں سٹاکر دلیر سنگھ پر فالج گرا اور وہ راہی ملک بقا ہوئے۔ گھر کا تمام بار اب بلونت سنگھ کے سر پر پڑا خیریت یہ ہوئی کہ وہ بی۔ اے پاس کر چکے تھے ورنہ ایسے نازک موقع پر تو اُن سے کچھ بھی کرتے دھرتے نہ بنتا۔

بلونت سنگھ اب خود مختار تھے بیس ہزار سالانہ منافع کی جائداد کے مالک تھے۔ سر پر کوئی بڑا بوڑھا نہ تھا جو چاہتے کرتے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ تھا۔ پہلے شہر کے اندر رہتے تھے باپ کے مرنے کے بعد سول لائن میں ایک عالیشان بنگلہ خرید کر رہنے لگے۔ گھر بھر انگریزی طرز معاشرت کا دلدادہ تھا۔ کملا جو اب بی۔ اے میں پڑھتی تھی فیشن اور آزادی میں اپنے بھائی سے بھی چار قدم آگے تھی اگر بلونت سنگھ کسی لیڈی کے ساتھ باغ کی ہوا کھانے جاتے تو کملا بھی اپنے کسی دوست کے ہمراہ ناچ گھر چلی جاتی جہاں کوئی جلسہ پردے کے خلاف ہوتا وہاں کملا صدر بنائی جاتی۔ ناچنے گانے میں اُسے کالج سے سونے کا تمغہ ملا تھا۔ کملا کی ایک سہیلی تھی اس کا نام مالتی تھا وہ بھی بی۔ اے میں پڑھتی تھی اس کی ماں کا نپور کے گرلس اسکول میں اُستانی تھی مالتی بھی کملا کی طرح آزاد تھی جب وہ کملا سے ملنے آتی تو بلونت سنگھ سے بھی ضرور ملاقات ہوتی۔ رفتہ رفتہ بلونت سنگھ مالتی کو اپنا دل دے بیٹھے مالتی کے بغیر انہیں چین ہی نہ پڑتا۔ رات دن اسی خیال میں مگن رہنے لگے۔ اُن کے کچھ دوستوں نے سمجھایا بھی کہ بیوی کے ہوتے ہوئے کسی غیر عورت سے تعلق پیدا کرنا بہت بُری بات ہے لیکن بلونت سنگھ مالتی کی محبت میں پاگل ہو رہے تھے انھوں نے کسی کے کہنے سننے کی کچھ پرواہ نہ کی۔ ادھر کملا کی آزادی بھی رنگ لائے بغیر نہ رہی۔ ایک عیسائی بیرسٹر سے اس کا ناجائز تعلق ہو گیا کچھ دنوں تک تو خفیہ ملاقات ہوتی رہی مگر جب کملا نے دیکھا کہ بلونت سنگھ مالتی کی محبت میں اندھے ہو رہے ہیں تو بھلا وہ ایسے موقع سے کیوں نہ فائدہ اُٹھاتی۔ مثل مشہور ہے کہ خربوزہ کو دیکھکر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے،، گھر کے چھوٹے تو وہی کام کرنا شروع کر دینگے جو اپنے بڑوں کو کرتے دیکھیں گے کملا نے بھی اپنے بھائی کی تقلید کی اور وہ ایک غیر مذہب بیرسٹر سے علانیہ ملنے لگی۔ مگر آہ یورپ کی اندھا دھند تقلید کرنے والے آزادی کے شیدائی بلونت سنگھ کو کملا کا یہ فعل کچھ بھی بُرا نہ لگا۔ برادری کے لوگوں نے۔ اخبار والوں نے کملا کے اس فعل پر بہت لعنت

ملامت کی مگر کملا کے دل پر کچھ بھی اثر نہ ہوا اُسکو تو آزادی نے بے غیرت بنادیا تھا۔ مگر جس کو آزادی کی ہوا لگی ہو وہ پابند ہوکر بیرسٹر کے پاس کیسے رہ سکتی تھی کملا کا تو خیال تھا کہ مرد آزاد ہے وہ جو جی چاہے کر سکتا ہے تو یہ کہاں کا انصاف ہے کہ عورت آزاد نہ ہے دنیا میں جو مرتبہ مرد کا ہے وہی عورت کا ہے ایسے ہی خیالات کا نتیجہ تھا کہ بیرسٹر کے ساتھ دوچار ماہ بھی کملا کی نہ بنھ سکی اور وہ بیرسٹر ہی کے ایک محرر کے ساتھ بھاگ کھڑی ہوئی۔ کملا کہاں گئی۔ اُسے زمین کھا گئی یا آسمان۔ اس کا پتہ آج تک نہ چلا

(۵)

ننگ خاندان کملا کی آوارگی کا شاید ہی صدمہ کچھ بلونت سنگھ کو ہوا ہوگا لیکن اس کی ماں اس رسوائی کو نہ برداشت کر سکی اور وہ رنج وغم میں بیمار پڑ گئی علاج معالجہ ضرور ہوا لیکن وہ موت کے زبردست ہاتھوں سے نہ بچ سکی مرنے سے پیشتر اس نے بلونت سنگھ کو بلایا اور کہا" بلونت سنگھ! کملا نے خاندان کا نام ڈبو دیا اگر میں اُسے لڑکپن ہی سے اتنا آزاد نہ کرتی تو یہ دن دیکھنا کیوں نصیب ہوتا اگر میں اُسے اپنے بزرگوں کے راہ پر چلاتی تو آج بڑھاپے میں میری کیوں رسوائی ہوتی۔ بلونت! یہ سب میری بہو کا صبر پڑا ہے۔ آہ ہم نے اس شرم وحیا کی دیوی کی قدر نہ کی۔ کبھی ہم اس پر اپنی بیوقوفی سے ہنستے تھے لیکن آج ہم پر تمام دنیا ہنس رہی ہے۔ بلونت! اب میری آخری نصیحت یہ ہے کہ تم میا کھی جاکر اُس دیوی کو بلا لاؤ اس کے قدموں سے تمہارا گھر پاک ہوجائیگا اب بھی کچھ نہیں گیا۔ میرا کہنا نہ مانوگے تو تباہ ہوجاؤگے"

ماں کے مرنے سے بلونت سنگھ کو بہت صدمہ ہوا دوچار دن تک تو ماں کی نصیحت یاد رہی لیکن پھر مالتی کی محبت میں بیچاری شیاما کا تو کیا ذکر سب کچھ بھول گیا اور پھر اس کے بنگلہ پر عیش وخوشی کے جلسے ہونے لگے۔ اب بلونت سنگھ نے مالتی کے شادی کا پیغام دیا اُس نے اس کے جواب میں کہا کہ وہ بغیر اپنی ماں کے اجازت کے کچھ نہیں کرسکتی۔ بلونت سنگھ جب مالتی کی ماں سے ملا تو پہلے تو اُس نے انکار کیا مگر بعد میں اس شرط پر وہ مالتی کے ساتھ اسکی شادی کرنے پر تیار ہوئی کہ بلونت سنگھ اپنی تمام جائداد مالتی کے نام کردے اور کملا سے کبھی کوئی تعلق نہ رکھے۔ بلونت سنگھ نے بڑی خوشی سے یہ شرط منظور کرلی اور طے پایا کہ اگلے ہفتہ میں شادی ہوگی۔ یہ نسبت اتنی پوشیدہ رکھی گئی کہ ٹھاکر شیر سنگھ کو اسوقت خبر ہوئی کہ جب شادی ہونے میں ایکدن باقی تھا۔ شام کے چار بجے ہونگے شیاما انگنائی میں پلنگ پر چپ چاپ منہ لپیٹے پڑی تھی اس کی ماں پاس ہی بیٹھی

ہوئی تھی کہ یکایک کھٹاکر شیر سنگھ گھر میں داخل ہوئے اس وقت ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور غصہ میں کانپ رہے تھے انہوں نے آتے ہی شیاما کو بڑی حسرت بھری نظروں سے دیکھا ہزار ضبط کیا لیکن آنکھوں سے آنسو نکل ہی آئے بیتاب ہو کر لڑکی سے لپٹ کر رونے لگے۔ فلک کی ستائی ہوئی مہجور الم شیاما نے باپ کی طرف دیکھا خدا جانے کیا سمجھی اور کیا نہ سمجھی اور خود بھی رونے لگی اور اس درد کے ساتھ روئی کہ بیہوش ہوگئی تھوڑی دیر میں جب اُسے ہوش آیا تو اُس نے شیر سنگھ کو یہ کہتے ہوئے سنا: "بلونت سنگھ جس طرح خود بے حیا اور بے غیرت ہو گیا ہے اسی طرح تمام دنیا کو سمجھتا ہے۔ اُسکی بہن بھاگ گئی اور اُسے غیرت نہ آئی"۔ شیاما کو ابھی طرح ہوش آچکا تھا لیکن وہ قصداً آنکھیں بند کئے ہوئے چپ چاپ پڑی رہی۔ شیر سنگھ نے پھر کہنا شروع کیا" شیاما کی ماں! تم سے کس طرح سے کہوں کہ بلونت شیاما کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کرنے جا رہا ہے تمام انتظام مکمل ہو چکا ہے کل شادی ہوگی۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا شیاما کے ہوتے ہوئے بلونت دوسری شادی نہیں کر سکتا اگر وہ اپنے بزرگوں کے کارنامے بھول گیا ہے تو میں اُسے بتاؤنگا کہ راجپوت ایسی ذلت پر موت کو ترجیح دیتے ہیں" اتنا کہکر شیر سنگھ باہر نکل گئے اور شیاما کی ماں خوف بھری نگاہوں سے اپنے شوہر کو دیکھتی رہ گئی۔

اب شیاما نے آنکھیں کھول دیں دکھیا ماں نے بلائیں لیں اور شیاما کو کلیجہ سے لگا کر پیار کیا اسوقت رات کے نو بجے ہونگے مگر شیر سنگھ کا کہیں پتہ نہ تھا نوکروں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ شاید وہ کانپور گئے ہیں۔ کانپور کا نام سنکر شیاما بہت پریشان ہوئی لیکن اُسنے اپنی یہ پریشانی ماں پر ظاہر نہ ہونے دی اور چپ چاپ نیند کا بہانہ کر کے لیٹ گئی۔ جب اس کی ماں سو گئی تو وہ خاموشی سے اٹھی اور گھر سے باہر نکل کر ایک طرف کو چلدی۔

(۶)

بلونت سنگھ اپنی عالیشان کوٹھی کے ایک سجے سجائے کمرے میں پلنگ پر لیٹے ہوئے آرام کر رہے تھے کمرہ بجلی کی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ اسوقت رات کے دو بجے ہونگے ابھی تھوڑی دیر ہوئے وہ جلسہ سے اٹھ کر اس کمرہ میں سونے کے لئے آئے تھے شادی ہونے کی خوشی میں انھیں نیند نہیں آرہی تھی بنگلہ کے تمام نوکر چاکر پڑے پڑے سو رہے تھے لیکن یہ ابھی تک کروٹیں ہی بدل رہے تھے یکبارگی دروازہ کھلا۔

بلونت سنگہ نے دیکھا کہ شیر سنگہ ننگی تلوار لئے ہوئے کمرہ میں داخل ہوئے گھبرا کر اٹھ بیٹھے اور پوچھا " آپ اس وقت میرے پاس کس نیت سے آئے ہیں۔

شیر سنگہ۔ میں تمکو سمجھانے آیا ہوں کہ شیاما کی حالت پر رحم کرو اور اس کے ہوتے ہوئے کوئی دوسری شادی نہ کرو۔

بلونت۔ شیاما جاہل۔ پھوہڑ اور غیر تعلیم یافتہ لڑکی ہے وہ مجھے خوش نہیں رکھ سکتی۔ میری مرضی کے خلاف اس کے ساتھ میری شادی ہوئی۔

شیر سنگ نے غصہ میں جواب دیا۔ شیاما جاہل سہی۔ پھوہڑ سہی غیر تعلیم یافتہ سہی لیکن وہ حیا۔ شرم۔ وفا اور عصمت کی پاک دیوی ہے وہ تیری بہن کملا۔ ہاں اس ننگ خاندان بے حیا بے غیرت کملا سے جو تعلیم یافتہ ہے اور عصمت نہیں رکھتی ہزار درجہ بہتر ہے۔

بلونت سنگہ سے جب اس کا کوئی جواب نہ بن پڑا تو اُسنے جھنجھلا کر کہا۔ کچھ بھی ہو لیکن اب تو میں مصمم ارادہ کرچکا ہوں کہ دوسری شادی کرونگا۔

شیر سنگہ۔ لیکن میں تو ایسا نہیں ہونے دونگا اگر تم میرا کہنا مانوگے تو۔ . . . .

بلونت سنگہ۔ تو کیا مجھے قتل کردوگے۔

شیر سنگہ۔ بیشک۔

بلونت۔ لیکن آپ ایسا نہیں کرسکتے میرے ایک اشارہ پر آپ گرفتار ہو جائینگے۔

شیر سنگہ۔ (غصہ میں) بزدل کہیں کا۔ مجھے دھمکاتا ہے قبل اس کے کہ تو کسی کو آواز دے میری تلوار تیرا کام تمام کر دیگی۔ لیکن میں تجھکو موقع دیتا ہوں کہ تو بھی ہاتھ میں تلوار لیکر میرا مقابلہ کر۔ میرا اور تیرا اسی میں فیصلہ ہو جائیگا۔ میں بوڑھا ہوں اور تو جوان ہے کیوں ڈرتا ہے اُٹھ ہاتھ میں تلوار لے اور بہادر راجپوتوں کی طرح سے مقابلہ کر۔

بلونت سنگہ خوف کے مارے کانپنے لگے آرام طلبی اور عیش نے انھیں کاہل اور ڈرپوک بنا دیا تھا۔ جب شیر سنگہ نے بلونت سنگہ کی یہ حالت دیکھی تو انھوں نے آگے بڑھ کر اس کے ایک ٹھوکر ماری۔

بلونت سنگہ راجپوت تھا کہاں تک ذلتیں اٹھاتا غصہ میں کھڑا ہو گیا اور تلوار ہاتھ میں لے لی " مرتا

کیا نہ کرتا" مگر بلونت سنگھ کے دل میں چور رکھا۔ اس کے بازو ناتجربہ کار تھے۔ اس کو یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اپنے ہاتھ میں تلوار اٹھائی نتیجہ یہ ہوا کہ دو ہاتھ بھی چلانے نہ پایا تھا کہ لڑکھڑا کر گر پڑا پر جوش بوڑھے راجپوت کی تلوار چمکی اور قریب تھا کہ بلونت سنگھ کی زندگی کا خاتمہ کر دے کہ کمرہ کا دروازہ کھلا اور ایک عورت "ہاں ہاں" کہتی ہوئی بلونت اور شیر سنگھ کے بیچ میں آکر کھڑی ہو گئی۔ شیر سنگھ کی زبان سے نکلا "شیاما" تو یہاں کیسی آگئی۔ ہٹ جا سامنے سے آہا اب میں سمجھا تو مجھ سے لڑنے آئی ہے اور بلونت سنگھ کو بچانے آئی ہے اُس کو جو تیری پرواہ نہیں کرتا اُس کو جو تجھے چھوڑ چکا ہے اور کل دوسری شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔"

شیاما نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا۔ پتا جی میں آپ سے لڑنے نہیں آئی۔ میرے سوامی کے بجائے آپ مجھے قتل کر دیجئے لیکن انہیں کوئی تکلیف نہ دیجئے وہ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں کرنے دیجئے اِن کے دل کو نہ دکھائیے میں اُن کا بُرا نہیں چاہتی۔ میں ہندوستانی ہوں۔ راجپوتنی ہوں اپنے سوامی پر تن من نچھاور کر دونگی لیکن اپنے پتی پر کوئی آنچ نہ آنے دونگی۔ قبل اس کے کہ شیر سنگھ کوئی جواب دیں زمین پر پڑا ہوا بلونت اُٹھ کھڑا ہوا اُس نے پتی ورتا استری پریم کی دیوی شیاما کے قدموں پر سر جھکانا چاہا لیکن شیاما نے فوراً روک دیا۔ جس دل پر شیر سنگھ کے خوف نے۔ تلوار کے ڈرنے کچھ اثر نہ کیا تھا شیاما کے سچے پریم سے بھرے الفاظ نے جادو کا اثر کیا اُس نے ہاتھ جوڑ کر شیر سنگھ سے معافی مانگی

غضبناک شیر سنگھ کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی بہادر راجپوت کا دل نرم ہو گیا بڑھ کر بلونت کو چھاتی سے لگا لیا اور کمرے سے یہ کہتا ہوا "بھگوان تمہارا یہ ملاپ مبارک کرے" باہر نکل گیا دور سے پپیہا کی آواز آئی "پی کہاں" یہ سنتے ہی شیاما نے بلونت کی طرف دیکھا جس نے مسکرا کر شیاما کو کھینچ کر کلیجہ سے لگا لیا اور دائمی محبت کی مہر ثبت کر دی۔

اعظم کریوی

# محمود و نوح

جناب محمود علی خان صاحب محمود عرف آغا علی خان صاحب ساکن دریاآباد محلہ الہ آباد کو اس باعث سے لوگ جانتے ہیں کہ وہ ایک بہت بڑے تعلقہ دار اور آنریری مجسٹریٹ اور ایک معزز خطاب یافتہ شخص ہیں لیکن زمانہ ابھی اس سے ناواقف ہے کہ اُن میں کیا کیا جوہر اور کیسے کیسے کمالات ہیں اخلاق احباب پرستی انکسار وغیرہ سے مجھے بحث نہیں یہ چیزیں تو قریب قریب ہر انسان میں تھوڑی بہت ہوتی ہی ہیں اسوقت میں ان کے کمال شاعری پر نظر ڈالتا ہوں اور یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ کیا کیا لاجواب اشعار انکے قلم سے نکلے ہیں

ہوتی ہے بزم غم کی جو صورت حجاب میں
رہتی ہے وہ مری نگۂ انتخاب میں

حجاب میں جو صورت رہے گی اُس کا دیکھنا معمولی نگاہ کا کام نہیں اسکے دیکھنے کے لئے خاص نگاہ کی ضرورت ہے ان خوبیوں پر لحاظ کرتے ہوئے نگۂ انتخاب کی داد کیا دی جاسکتی ہے بزم غم کے ٹکڑے نے کسقدر شعر کو بلند کردیا معنی اور ندرت خیال پر جس قدر بھی روشنی ڈالی جائے وہ کم ہے اس مطلع کی پوری پوری شرح لفظوں میں اگر مشکل نہیں تو آسان بھی نہیں

اب دیکھو جا کے بزم میں پھر جلوۂ جمال
ڈوبا ہے کیف حسن بھی رنگ شباب میں

یہ شعر ہے یا قیامت پہلے مصرع کی شان اور حسن بیان کی تعریف کیا کروں (اب دیکھو جا کے بزم میں پھر جلوۂ جمال) کیا مصرع کہا ہے بار بار پڑھئے اور لطف اٹھائے کیف حسن کا رنگ شباب میں ڈوبنا بھی ایک خاص بات ہے

رندوں پہ چشم مست نے کیا جانے کیا کیا
غش کھا گئے جو ایک ہی دور شراب میں

کیا جانے کیا کیا اس ٹکڑے سے کس قدر نامحدود معنی ہوگئے ہیں جتنا غور کیجئے اتنا ہی لطف اٹھائے پھر چشم مست سے دور شراب کو جو مناسبت ہے وہ ادھ بھی غضب ہے ابھی تک رند ایک دور شراب کیا سیکڑوں دور شراب سے بھی بے ہوش نہ ہوئے تھے مگر چشم مست نے خدا جانے کیا کیا جو ایک ہی دور شراب میں غش کھا گئے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چشم مست خود دور شراب تھی

تحریر پڑھ سکا نہ میں اوراق دہر کی
قدرت نے اسطرح سے لکھی اس کتاب میں

کس قدر بلند مضمون ہے اور کتنے خوبصورت لفظوں میں ادا ہوا ہے تہ کی بات اللہ ہی جانے فی الحقیقت قدرت نے جو کتاب تیار کی ہے اس میں سے کسی کی یہ مجال کب ہے جو کوئی لفظ پڑھ سکے یا کوئی مفہوم سمجھ سکے غیب کی باتوں کا سمجھ میں آنا محال ہے اوراق دہر نے شعر میں ایک نئی روح پھونک دی اگر ان دونوں لفظوں کو نکال ڈالئے تو شعر میں کوئی خاص بات باقی نہیں رہجاتی اس سے شاعر کی مشاقی کا پورا پورا اندازہ ہوجاتا ہے۔

اک اک نفس میں کشمکش حسن وعشق ہے
اللہ پھنس گیا مرا دل کس عذاب میں

حسن وعشق کی کشمکش ایک ایک نفس میں ہونی بالکل نئی بات ہے یہ شعر بجا ئے خود ایک دنیائے شاعری ہے کشمکش معمولی نہیں حسن وعشق کی کشمکش اور پھر وہ بھی کہاں ایک ایک سانس میں اس انتہائے پریشانی کا کیا کہنا (اللہ پھنس گیا مرا دل کس عذاب میں) کس عذاب کو تو دیکھئے اس عذاب سے بڑھ کر عاشق کے لئے کوئی عذاب ہی نہیں ہوسکتا جسمیں حسن وعشق کی کشمکش ایک ایک نفس کے ساتھ موجود ہو۔

خط یہ کس انداز کے ہیں آج نوک تیر کے
دل ہوا جاتا ہے صدقے اس نئی تحریر کے

سطحی نظر ڈالے تو یہ ضرور کہیں گے کہ تیر سے خط نہیں پڑتے تلوار سے پڑتے ہیں لیکن غور کیجئے تو اس میں عجب بات ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی تیر ہاتھ میں لئے ہے اور دل اسکے سامنے رکھا ہے اور وہ تکلیف دہی کے خیال سے کہ اسکو زیادہ تکلیف ہو نوک تیر سے لکیریں بنا رہا ہے کہ اس خط کی نئی تحریر پر دل کا صدقے ہوتا بالکل جدت ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ نوک تیر سے خط پڑتا اور نئی تحریر کا ہوجانا اعجاز شاعری ہے

اک نگاہ قہر نے کتنے کئے ہیں انقلاب
آپ اگر دیکھیں تو میں رکھدوں کلیجا چیر کے

نگاہ یوں ہی قہر ہوتی ہے پھر معشوق کی نگاہ قہر یہ جو کبھی عاشق کے حق میں کرے کم ہے نگاہ قہر کیلئے انقلاب کا ہونا بھی لازمی ہے پھر یہ خصوصیت کہ آپ اگر دیکھیں اوروں کے دیکھنے کو نہیں کہا خود معشوق ہی کے آگے کلیجا چیر کر رکھنے کا لطف ہے۔

سر نوشت دورِ الفت جب لکھی جانے لگی
ہاتھ تھرانے لگے خود کاتب تقدیر کے

واقعات نہیں کہا روداد نہیں کہا کاتب تقدیر کی مناسبت سے جو سر نوشت میں خاص بات ہے اس کو شاعر ہی سمجھ سکتا ہے کاتب تقدیر نے ہزاروں سر نوشت لکھی اور اس پر کسی طرح کا اثر نہ ہوا لیکن درد الفت کی سر نوشت اس قدر رنج جاں کاہ سے بھری تھی کہ کاتب تقدیر کے بھی ہاتھ لکھتے میں تھرانے لگے کسقدر بلند شعر کہا ہے۔

میرے دل کے واسطے ہر لفظ ہے شرح نشاط
اے بگڑنے والے میں صدقے تری تقریر کے

معشوق پہلے خاموش تھا اور کسی قسم کی گفتگو اُسے گوارہ نہ تھی عاشق یہ چاہتا تھا گفتگو کرے چنانچہ بگڑ کر وہ بول ہی اٹھا اور اس صورت میں جو عاشق کی حسرت کلام تھی پوری ہو گئی علاوہ اسکے جب انسان کو حد سے زیادہ غصہ آتا ہے تو کچھ نہ کچھ اچھی بُری بات اس کے منہ سے نکل ہی جاتی ہے یہاں بھی جب غصہ آیا تو ایسی باتیں بھی تقریر میں نکلیں کہ ہر لفظ دل کے لئے شرح نشاط بن گیا

اے تصور رنگ بھر دے شیشۂ دل میں مرے
نقش دھندلے ہو چلے ہیں پھر کسی تصویر کے

آئینے میں زنگ لگنے پر قلعی کیجاتی ہے جب تصویر کے نقش کچھ مٹ چلے تھے اور کچھ باقی تھے تو ضرورت تھی کہ اس میں نئے سرے سے رنگ بھرا جائے کہ تصویر اپنی اصلی صورت پر قائم رہے لہذا تصور کو مخاطب کیا ہے جس کا تعلق شیشۂ دل سے ہے علاوہ تصور کے شیشۂ دل میں کوئی رنگ بھی نہیں بھر سکتا۔ یہ وہ تصویر نہیں جو کاغذ پر کھینچی جاتی ہے بلکہ یہ معشوق کی ایک اعلیٰ خیالی تصویر ہے جسکو خاص نسبت تصور اور شیشۂ

دل سے ہے۔

تھا فقط اک امتحان الفت کا میری روح سے
نزع میں اب کھل گئے عقدے تری تاخیر کے

پہلا مصرع کس قیامت کا لگایا ہے روح سے الفت کا امتحان اور پھر نزع میں آخری وقت روح کے لئے کیا کشمکش ہوتی ہے وہ چاہتی ہے کہ جلد کہیں مجھکو جسد سے آزادی ملے لیکن یہاں الفت کا امتحان منظور تھا کہ اس تکلیف میں روح کسقدر ثابت قدم رہتی ہے یہ بھی مانی ہوئی بات ہے کہ دم نکلنے میں جس قدر تاخیر ہوگی اسی قدر تکلیف بھی زیادہ ہوگی عاشق معشوق سے کہہ رہا ہے کہ نزع میں جو تجھے تاخیر ہوئی تو یہ بھی روح سے الفت کا امتحان تھا کہ دیکھوں کن مصائب سے اسکا دم نکلتا ہے اور یہ امتحان میں کتنا پورا اترتا ہے تری تاخیر نہ تھی بلکہ یہ ایک سخت امتحان الفت کا روح سے تھا۔

سرفروشان محبت کے کھنچے آتے ہیں سر
دیکھ کر مقتل میں جوہر آپکی شمشیر کے

یہ شعر جتنا صاف ہے اتنا ہی دل کش بھی ہے پہلے مصرع کی شان اور بندش قابل غور ہے اب اس سے بڑھکر تلوار میں کیا جوہر ہو سکتے ہیں کہ ابھی چلی نہیں لیکن سرفروشان محبت کے سر خود بخود کھنچے آتے ہیں اگر وہ چلے تو خدا جانے کیا قیامت ہو جہاں اس رنگ کے شعر ہیں وہاں ایک شعر اس رنگ کا بھی موجود ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو ہر رنگ پر قدرت ہے۔

موج شمیم عشق دوست پھیلی تھی جو بہار میں
دیکھو سمٹ کے آگئی سب دل داغ دار میں

اللہ اللہ مطلع کیا ہے یا دریا کو کوزے میں بند کیا ہے وسعت بہار کی کوئی حد نہیں تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اور صرف بہار ہی نہیں اسمیں موج شمیم عشق دوست بھی شامل ہے اسی اہمیت کے ساتھ اتنی بڑی چیز سمٹ کر دل داغ دار میں آگئی لطافت خیال کو خیال کیجئے، تو بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے دل داغ دار کو کس قدر بڑھایا ہے یعنی موج شمیم عشق دوست جو بہار میں پھیلی ہوئی تھی اسکا انحصار دل داغ دار پر ہوگیا

موج شمیم دوست ہے جزو نشاط زندگی
جاتی ہے جائے فصل گل رکھا ہے کیا بہار میں

عاشق کے لئے جزو نشاط زندگی سوچ شمیم دوست ہی ہوسکتی ہے اس سوچ شمیم دوست کے آگے بہار کیا چیز ہے وہ جاتی ہے تو جائے عاشق کے لئے جزو نشاط زندگی تو سوچ شمیم دوست ہے بڑی چیز کے آگے چھوٹی چیز کی قدر نہیں ہوتی بندش شعر کی نہایت اچھی ہے۔

اسقدر زوروں پہ کیف انگیز تھی چشم شباب
جس طرف آنکھ اُٹھ گئی مے خانہ ہی مےخانہ تھا۔

سبحان اللہ سبحان اللہ چشم شباب اسقدر زوروں پر کیف انگیز تھی کہ جو چیز اسکو نظر آتی تھی اُسکو مے خانہ ہی سمجھتی تھی اب اس سے زیادہ کیف انگیزی کیا ہوسکتی ہے کہ جسطرف آنکھ اٹھ جائے مےخانہ ہی مےخانہ نظر آئے عجیب شعر ہے۔

کون دیتا ساتھ بزم بےخودی میں روح کا
ہاں فقط پہلو میں اسکے اک دل دیوانہ تھا

روح ایک لطیف چیز ہے اور انتہائے لطافت کے سبب سے وہ کسی کو نظر تک نہیں آتی اس صورت میں دل کیوں کر روح کا ساتھ دے سکتا ہے اور پھر بزم بےخودی ایسی ویسی معمولی بزم بھی نہیں اور دل بھی کوئی خاص دل نہیں بلکہ دل دیوانہ ہے دل کے پاس روح یا روح کے پہلو میں دل رہے اس سے کیا ہوتا ہے دل پھر بھی دل اور روح پھر بھی روح ہے۔

میرے اک اک لفظ پر سب اہل دل روتے رہے
دردِ غم میں اسقدر ڈوبا ہوا افسانہ تھا!

اس شعر میں اہل دل کی خصوصیت لحاظ کے قابل ہے کیونکہ درد و غم کے افسانہ کو جیسا اہل دل سمجھ سکتے ہیں ویسا اور لوگ نہیں سمجھ سکتے پورے شعر کو پھر پڑھئے اور غور کیجئے۔

ہر نگہ تھی برق وش اور ہر ادا مستانہ وار
اک طرف بجلی کا دریا اک طرف میخانہ تھا

اس شعر میں چار ٹکڑے ہیں اور ایک کا دوسرے مصرع سے تقابل ہے نگاہ کے لئے برق وش اور برق وش کے لئے بجلی کا دریا اور ادا کے لئے مستانہ وار اور مستانہ وار کے لئے میخانہ کیا اچھی بات ہے بجلی کے دریا میں کس قدر جدت قابل تعریف ہے۔

اقربا بھی دفن کر کے اپنے اپنے گھر گئے
پاس تربت کے فقط اک سبزۂ بیگانہ تھا

اس موقع پر سبزۂ بیگانہ کے محاسن میں ورق کے ورق سیاہ کر دئے جائیں جب بھی یقین ہے کہ پوری پوری تشریح نہ ہو سکے دفن کرنے کے بعد اقربا تو گھر چلے گئے تربت پر صرف سبزہ بے گانہ رہ گیا جس کا رہنا نہ رہنا دونوں برابر ہے کیونکہ جب اقربا ہی چلے گئے تو اسکا کیا اعتبار ہے علاوہ اسکے اقربا رہتے تو ہر قسم کی امید ہے تھی اس سبزۂ بے گانہ سے کیا امید ہو سکتی ہے شعر نہیں کہا تیر ملا ہے دیکھنے میں تو معمولی بات ہے مگر واقعہ کے لحاظ سے قیامت ہے۔

یہ کوئی انصاف تھا اے ساقیٔ محفل نواز
بند فصل گل میں بھی تیرا درِ مے خانہ تھا

ساقی محفل نواز کی ترکیب کتنی پیاری اور غیر معمولی ترکیب ہے فصل گل میں تو میخانہ کا دروازہ کھلا رہنا چاہئے لیکن جب فصل بہار میں بھی میخانہ کا در بند رہا تو کیا اے ساقی محفل نواز یہ بھی کوئی انصاف تھا انصاف تو یہ تھا کہ فصل گل میں میخانہ کا در کھلا رہتا واہ اے ساقیِ محفل نواز کا فقرہ شعر کی جان ہے۔

روح کو کیوں کر پلاتا بادۂ ذوقِ نشاط
ساغرِ دل میرا اک ٹوٹا ہوا پیمانہ تھا

جب ساغر ٹوٹا ہوگا تو اس میں شراب کیوں کر رہ سکے گی پھر ساغرِ دل اور بادۂ ذوق نشاط اس صورتِ خاص میں روح کو کیونکر بادہ ذوق نشاط پلایا جائے کیا اچھوتا خیال ہے اور واقعات سے یہ شعر کس قدر لبریز ہے۔

ذرہ ذرہ کر رہا ہے رقص بزم دہر کا
اللہ اللہ کس مزے کا نعرۂ مستانہ تھا

نغمہ یا نعرہ بہر حال ہر آواز کے لئے اثر بھی ایک خاص چیز ہے اور جب نعرہ مستانہ ہے تو اس کے لئے کہ بات کی ضرورت تھی کہ اسکا اثر ظاہر کیا جاتا یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بزم حال وقال میں قوال کی نغمہ سرائی پر صوفیوں کو وجد آ جاتا ہے اور وہ عالم بے اختیاری میں اٹھ کر ناچتے ہیں لہذا یہاں بزم دہر کا ذرہ ذرہ رقص کرنے لگا جو انتہائے اثر کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔

یہ بھی اک اعجاز تھا محمود وحشت کا مری
جس طرف آنکھ اُٹھ گئی ویرانہ ہی ویرانہ تھا

اعجاز کا لفظ معجزہ شاعری ہے اور پھر وحشت کا اعجاز جدھر نظر اُٹھ گئی ویرانہ ہوگیا اس سے زیادہ وحشت کا اثر کیا ہو سکتا ہے۔

کون سمجھائے گا قدرت کی یہ رنگین تحریر
مرگیا دیکھنے والا تری رعنائی کا ہے

میں اس شعر کی تعریف کیا لکھوں اکثر پڑھتا ہوں اور لطف اٹھاتا ہوں رنگین تحریر کے لئے رعنائی کا لفظ کتنا جامع لفظ ہے تخیل پر مومن خان صاحب کی تخیل کا گمان ہوتا ہے کہاں سے مصرع لگایا ہے

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

الغرض محمود صاحب کے محاسن شاعری کی مدح و ثنا کہاں تک کی جائے یہ تو وہ اشعار ہیں جو مجھے یاد تھے اگر اُن کا کلام کوئی دیکھے تو اس میں سے سب اچھی اچھی غزلیں اور نہایت اچھے اچھے شعر نکل سکتے ہیں یہ میں نے اپنے خیالات کا اظہار اس باعث سے نہیں کیا کہ میں ان کو اپنا قوت بازو جانتا ہوں یا وہ مجھے اپنا بھائی سمجھتے ہیں بلکہ نہایت صداقت سے ان کے کلام پر میں نے روشنی ڈالی ہے۔

نوح ناروی

# کہاں رہے

ختم بہار تک نہ کوئی مہربان رہے
دو دن تو اس چمن میں مرا آشیاں رہے

الفت میں، امتحان کے سب انداز تھے نئے
دل میں سما کے آپ نظر سے نہاں رہے

کہنے کو داستان ستم جا رہا ہوں آج
دیکھوں جو اختیار میں اپنی زبان رہے

ہے باغبان کا حکم یہ بلبل کے واسطے
پھولوں سے دور دور ترا آشیاں رہے

طالب الہ آبادی

# شاعری

## اور اس کے ارکان خمسہ

محققین علم الالسنہ کا اس پر کلی اتفاق ہے کہ "شعر و شاعری" دیگر فنون کی طرح انسان کی تدریجی ترقیوں کا نتیجہ نہیں ہے "قواعد زبان" کی طرح اسکے وضع کرنے میں، نکتہ رس دماغ کی کاوشیں بالکل غیر مفید ثابت ہوتیں۔

اب صرف یہ دیکھنا ہے کہ شاعری کے وجودی اسباب کتنے ہیں، اور ان میں بہ حیثیت تقدم و تاخر نسبت اضافی کا کیا درجہ ہے کسی زبان کی ابتدائی تاریخ پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ بنی نوع انسان نے فطری علائق سے مجبور ہو کر کس طرح غیر منظم آوازوں کو الفاظ کی مصطلحات میں میں تبدیل کیا، جن پر زبان کے اساسی اصولوں کا دار مدار ہے اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ انسان کی ضروریات زندگی اسکی مافی الضمیر کی ادائیگی کے لئے زبان کی ابتدائی سیدھی سادھی طرز (نثر) کافی تھی۔ انسان کے ارکان حیات، اسکے فرائض ملی ہیں "شعر و شاعری" کا درجہ کمتر کیا، بلکہ قریب قریب معدوم ہے۔

انسان سے اکثر غم و خوشی کے موقعوں پر مافوق الفطرت حرکات و افعال کا صدور ہوتا ہے جو اس سے طبعی اعتدال کی صورت میں کبھی انجام پذیر نہیں ہو سکتے۔ انسانی طبیعت کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ وہ حزن و مسرت کے جذبات کو محض اپنی ذات پر محدود کرنا ہرگز نہیں پسند کرتا۔ اس کی تمامتر کوشش اس میں صرف ہوتی ہے کہ کسی طرح اس کے بنی نوع اس کے ذاتی رنج و خوشی میں حصہ لیں۔ غم و خوشی کی صورتوں میں انسان کے دل پر دو کیفیتیں طاری ہوتی ہیں۔ کیفیت انقباض کیفیت انبساط

ان دونوں کیفیتوں کا اثر انسان کے دماغ پر غیر معمولی پڑتا ہے، اسلئے وہ اپنے خیالات کو روزانہ گفتگو کے اسلوب میں ترمیم کرکے ایک موثر پیرایہ میں ادا کرتا ہے، چنانچہ اس کا مشاہدہ انسان کی کمتر سے کمتر اور اعلیٰ سے اعلیٰ زندگی میں کیا جاسکتا ہے۔

مرقومہ بالا کی تحریر سے ایک حد تک "شعر و شاعری" کے ابتدائی نشو و نما کا عقدہ حل ہو جاتا ہے۔ اس کی آسان مثال اس طرح سمجھ میں آسکتی ہے۔

"انسان ایک زمانہ تک اپنے خیالات کی ترجمانی سیدھی سادھی زبان میں کرتا رہا، پھر بعض حساس دماغوں، اثر پذیر طبیعتوں کی لوای مسرت و حزن سے ایک غیر معمولی کیفیت پیدا ہوئی جس نے انکو زبان کی قدیم روش بدلنے پر مجبور کیا۔ خیالات کو پرزور بنانے کا واحد ذریعہ الفاظ کی نوعیت اور بندش پر منحصر ہے جس سے قلب سامع بلا متاثر ہوئے نہ رہ سکے، اور کانوں کو اسکی سماعت میں لذت حاصل ہو، اسلئے کہ دلکشی اس صورت میں ممکن ہے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جب قابیل نے ہابیل کا سر سنگ سخت سے پارہ پارہ کردیا تو حضرت آدم کو اسقدر قلق ہوا کہ انھوں نے اپنے لایق بیٹے کی مرگ، خیالات الفاظ کی ایسی خوبصورت بندش میں بیان کرنی شروع کی کہ ہمارے آجکل کی اصلاح کے بموجب شعریت پیدا ہوگئی، اور اسکا اثر اولاد آدم پر اسقدر ہوا کہ سب کے سب قابیل کے در پے ہوگئے اور اسکو اس قدر پریشان کردیا کہ اس نے مجبور ہوکر یمن کے طرف راہ فرار اختیار کی یہ تو غم کی نظیر ہے دوسری مسرت والی مثال بھی ملاحظہ فرمائے۔

بہرام گور ایران قدیم کا نامور تاجدار تھا۔ ایک دفعہ اپنے وزیر کے ساتھ شکار کھیلنے کے لئے صحرا میں نکل گیا۔ اچانک ایک شیر نے بہرام پر حملہ کردیا اس نے بمشکل تمام اپنے حواس کو مجتمع کرکے شیر پر بھرپور تلوار کا وار کیا جسکی وجہ سے وہ مٹی کے شیر کی طرح دو ٹکڑے ہوگیا۔ اس عظیم الشان کامیابی پر بہرام کو جتنی مسرت ہوئی اسکا اندازہ کرنا مشکل ہے تھوڑی دیر تک وہ اسی فکر میں سرگرداں رہا کہ کسطرح اپنی کامیابی و مسرت کا خاکہ وزیر کے سامنے کھینچے کہ اسکی عظمت وزیر کے دل میں بیٹھ جائے، آخر اسکے جدت پسند دماغ نے پامال راستے چھوڑ کر ایسا عجب انداز اختیار کیا کہ جس کے اثر سے وزیر کے زبان سے بھی ویسے ہی کلمات صادر ہوئے۔ بہرام نے اس موقع پر بھی چند الفاظ کہے "منم آن پیلہ دمہ منم آن شیر یلہ"۔ اس ٹکڑے کی مقناطیسی کشش نے وزیر سے بالآخر یہی کہلا دیا "نام بہرام ترا و پدرت بوجبلہ"

فارسی شاعری کا یہ نقش اوّل اس قدر کیف زا و پرجوش تھا کہ آج بھی بچے بچے کی زبان پر لطف سابق کی شان لئے ہوئے جاری ہے" اس طویل مثال کے بعد یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ "شاعری" کے وجودی اسباب جذبہ حزن و ملال کو شرف تقدم حاصل ہے اس کے بعد مسرت و ابتہاج کا درجہ ہے۔

عنوان میں "ارکان خمسہ" کا لفظ دیکھکر شبہ پیدا ہوگا کہ شاعری کی بنیاد تو جذبات حزن و مسرت پر ہے یہ "ارکان خمسہ" کی گنجائش کہاں سے نکل آئی۔ لیکن آگے چلکر معلوم ہو جائیگا کہ ان کے علاوہ اور بھی تین بڑے بڑے سبب ہیں۔ اس دلچسپ بحث کو ذرا تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت ہے ہر وہ چیز جس کے دیکھنے یا محسوس کرنے سے طبیعت انسانی میں انقباض پیدا ہو اُسکا شمار جذبہ حزن و ملال میں ہے مثلاً ایک شخص پر کسی عزیز کی وفات سے یا کسی بے پایاں غم سے ایسی کیفیت طاری ہوئی جس سے انقباضی صورت لاحق ہوگئی، اور اس کی زبان پر بے اختیار ایسے پر اثر الفاظ آگئے جو باقاعدہ نظام نے تابع تھے جنہیں اصطلاح میں ہم شعر کہتے ہیں۔ غرضکہ ہر وہ کیفیت فطری جس سے انسانی طبیعت میں ملال و انقباض پیدا ہو، جذبہ حزن سے متعلق ہے۔ حسد، غضب، فراق کے جذبات مجموعی طور سے انسانی قلوب پر غم انگیز کیفیت طاری کرتے ہیں، جسکا اظہار انسان موثر پیرایہ میں کرتا ہے، یہ تو عوام کا حال ہے، جو دماغ ان سے نسبتہً حساس ہوتے ہیں وہ تاثیر پیدا کرنے کے لئے اور اچھا اسلوب اختیار کرتے ہیں یہاں تک "شعر" وجود پذیر ہوتا ہے

یونان کی مشہور شاعرہ "سیفو" ایک طویل مدت تک کنج گنامی میں پڑی رہی اور اسکی زبان سے دنیا نے ایک شعر بھی نہ سنا مگر جب اسکو اپنے مطلوب کے ملنے سے ناامیدی پیدا ہوگئی اور فراق کی محبت نے طبیعت پر غلبہ حاصل کرلیا۔ تو ایسے ایسے پر درد اشعار کہے جن کی نظیر مشکل سے مل سکتی ہے میرابائی" جسکو کرشن سے غائبانہ عشق پیدا ہوگیا تھا، فرضی فراق سے مجبور ہوکر ایسے پر کیف عارفانہ اشعار موزوں کئے، جسکی نسبت اسکی ذات کی طرف تعجب سے خالی نہیں۔ لطف تو یہ ہے کہ اس کیفیت سے پہلے وہ شعر کے نام سے بھی ناواقف تھی۔ خنساء عرب کی ایک مشہور شاعرہ تھی۔ سیفو کی طرح وہ بھی پیدائشی شاعرہ نہ تھی۔ اپنے پیارے بھائی کی اچانک موت سے اس پر ایک غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اور وہی خنساء جس نے اس سے پیشتر ایک شعر بھی نہ کہا تھا، ایک پورا مرثیہ کا دیوان مرتب کرکے چھوڑ دیا۔ ان نظائر پر غور کرنے سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ جذبہ غم کہاں تک وجود شعر کا محرک ہے۔ یہ غم

کا صرف ایک رخ ہے جس کا تعلق انسانی قلوب اور اسکی غیر محسوس کیفیات سے ہے ۔ مثلاً حسد، غصّہ، فراق، ناامیدی وغیرہ غم کے ایک حصّہ کا تعلق مناظر محسوسہ سے بھی ہے ۔ اس کی تشریح اس طرح سمجھ میں آجائے گی

غم والم کا اثر انسان پر صرف دو طریقے ہوتا ہے باطنی اور ظاہری دل کے ذریعہ سے جو غم پیدا ہوتا ہے اس کا تعلق حواس خمسہ باطنی سے ہے اس صنف میں جیساکہ پہلے لکھا جاچکا ہے، غصہ، فراق ناامیدی وغیرہ شامل ہیں ۔ رہی دوسری صورت، تو وہ حواس خمسہ ظاہری سے وابستہ ہے مثلاً انسان کو کسی چیز کے دیکھنے، چھونے، سونگھنے، سننے اور چکھنے سے کراہیت پیدا ہوتی ہے تو وہ اپنے خاصۂ طبعی سے مجبور ہوکر دوسروں کو متنفر بنانے کے لئے حسب سابق عجیب وغریب انداز اختیار کرتا ہے اور اگر اسی کا شیوع حساس دماغ سے ہوتا ہے، تو "شعر" کی شکل اختیار کرلیتا ہے الغرض جذبۂ غم سے مرثیہ اور ہجو شعر کی دو ابتدائی قسمیں پیدا ہوتی ہیں جن کے اسباب کا تعلق غم انگیز کیفیات وغیرہ دلچسپ مناظر سے ہے ۔

یہی حال بعینہ جذب مسرت کا ہے، جذبہ حزن کی طرح اس کا احساس بھی دو طریقوں سے ہوتا ہے حواس خمسۂ ظاہری، حواس خمسۂ باطنی ۔ صنف اول میں، خوشگوار منظر، خوشبودار اشیاء، شیریں آواز مزیدار چیزیں داخل ہیں، جن کی وجہ سے انسان کے دل میں انبساطی کیفیت پیدا ہوتی ہے، جو بالآخر "شعر" کا سبب بنتی ہے حواس خمسۂ باطنی میں قلبی کیفیات کے روشن پہلو شامل ہیں جیسے فتحمندی وغیرہ ۔ عمرو بن کلثوم عرب جاہلیت کا عزیز القدر شاعر تھا، اس نے عمر بھر میں صرف ایک قصیدہ کہا جبکہ اُسکو ایک ظالم وغیور بادشاہ کے مقابلہ میں غیر متوقع فتح نصیب ہوئی ۔

مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں غم وخوشی کے ساتھ تنفر و رغبت کا پیدا ہونا بھی لازمی ہے، جسکی وجہ سے انسان اپنے خیالات کو انتہائی پرجوش طریقے سے بیان کرنے پر مجبور ہوتا ہے، تاکہ ان کے دوسرے ہم جنس بھی ایک معتدبہ اثر لے سکیں ۔

بہرحال جذبہ مسرت سے حمد، نعت، مدح، غزل اور دیگر قسم کے پرسرور اشعار کا ظہور ہوتا ہے وجود شعر کا تیسرا سبب "جذبہ محاکات" ہے وہ اسطرح کہ انسان فطرتی طور پر جو کچھ دیکھتا سنتا اور محسوس کرتا ہے، اس سے دوسروں کو بھی بہرہ اندوز بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر اسکا سلسلہ

یہ کبھی نہیں ہوتا کہ لوگ خواہ مخواہ متنفر و رغبت کی کیفیت اپنے اوپر عائد کریں، اسکا موضوع محض اظہار حال ہوتا ہے سلسل نظمیں کوہ و دریا کے مناظر اسی قبیل سے ہیں۔ انسانی معاشرت کی تصویر بھی اسی قسم سے کھینچی جاسکتی ہے۔ انگریزی شاعری سراسر اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔

چوتھا سبب "جذبۂ قومیت" ہے۔ اصلاح قوم کے لئے جسقدر بھی دلکش اور موثر پیرایہ اختیار کیا جاسکے کم ہے ظاہر ہے کہ اگر کوئی بات ہمیشہ ایک ہی طرز میں کہی جائے تو اسکا اثر کہاں تک ہوگا۔ اصلاح قوم کے لئے شعر بہترین حربہ ثابت ہوا، موزونیت کی وجہ سے ترنم، ترنم کی وجہ سے دلکشی لازمی ہوگئی چنانچہ شعرانے اس سے بہت بڑے بڑے کام لئے۔ قبیلہ "طسم"[1] کی عفیرہ نامی ایک عورت نے صرف چند شعروں سے اپنی مردہ قوم کے اندر وہ روح پھونک دی کہ جو قوم چند دنوں پیشتر اپنی کنواری لڑکیوں کو بادشاہ وقت کی خواہشوں پر قربان کردینا فخر سمجھتی تھی، بالکل بدل گئی۔ اور غیرت و حمیت کا وہ دریا ان کی رگوں میں موجزن ہوا جس نے بالآخر ان کے حریف کو ہمیشہ کے لئے دنیا سے نیست و نابود کردیا۔ "حرب بسوس" جو عرب میں کم و بیش چالیس برس تک جاری رہی، محض دو شعروں سے آتش زن ہوئی تھی۔ لارڈ بائرن کی ایک نظم نے تمام عیسائی دنیا کو ترکوں کے خلاف کردیا، جس کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ یونان ترکوں کی قیادت و حکومت سے آزاد ہوگیا۔ سچ ہے فولادی شمشیر کی روک تھام تو آسانی سے ہوسکتی ہے مگر زبان کی تیغ بے پناہ ہے۔

شعر کے پیدا ہونے کا پانچواں اور سب سے اہم سبب "خدمت زبان" ہے۔ اسلئے کہ نثر اپنی خشکی و غیر دلچسپی کی وجہ سے ہر وقت ذہن نشین نہیں رہ سکتی۔ برخلاف اسکے نظم میں محاکات، تشبیہ، استعارہ سے ایسی پاکیزگی پیدا ہو جاتی ہے کہ بلا تکلف بچوں سے لیکر بوڑھے تک حظ وافر حاصل کرتے ہیں اور نظم اپنی روانی موزونیت کی وجہ سے بہت جلد زبان زد ہو جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ جو زبان جسقدر عام ہوگی، اسیقدر پھولے پھلیگی چنانچہ جس زبان میں شاعری کا عنصر کم تھا وہ جلد فنا ہوگئی۔ عبرانی اور سنسکرت ہی کو لیجئے جو کہ دنیا کی بہترین علمی زبانوں میں تھی کتنی قلیل مدت میں فنا ہوگئی۔ وجہ صرف یہی ہے کہ ان زبانوں کا اکثر سرمایہ علوم مغلقہ پر شامل ہے اور شعر و سخن کا عنصر کم ہے اور جو کچھ ہے بھی وہ زہد و اتقا، حکم و نصائح پر مستعمل ہے اس کا اثر یہ ہوا کہ زبان محض خواص تک محدود رہی اور اچھی طرح منتشر نہ ہونے پائی چنانچہ

[1] عرب کا ایک قدیم قبیلہ جو مورخین کی اصلاح میں "بائدہ" یعنی ہلاک شدہ کہلاتا ہے۔

ہند قدیم میں سنسکرت کی کتب محض اعلیٰ قومیں پڑھ سکتی تھیں، اور بیچارے کم طبقہ والے اس نعمت سے محروم تھے اوّل تو عوام ملکی قانون کی وجہ سے سنسکرت کی تحصیل سے مجبور تھے اور دوسرے خود سنسکرت میں علمیت و اخلاق کی وجہ سے اتنی صلاحیت نہ تھی کہ عوام کے قلوب کو اپنے طرف راغب کر سکے۔ یہی حال عبرانی کا بھی ہے، جسکا اکثر حصّہ مذھبیات کا مرہون منت تھا، اور شعر گوئی تو قریب قریب اس مقدس زبان میں ناجائز سمجھی جاتی تھی! اسکے مقابلہ میں عربی، انگریزی اور فارسی کو لیجئے، جن میں علمیت و حکمت کے دوش بدوش لائٹ لٹریچر کا خزانہ بھی کافی ہے اس کا پہلا فیض یہ ہے کہ شروع سے آج تک ان تینوں زبانوں کے نام لیوا اپنی دلچسپی اپنی پیاری زبان سے ایک لحظہ بھی علحدہ کرنا پسند نہیں کرتے اور عوام و خواص زبان کو عام کرنے اور وسعت دینے کی ان تھک کوششوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ غرضکہ جب تک کسی زبان میں علوم و معارف کے ساتھ شعر و شاعری کا درجہ بھی رکھا جائیگا، وہ زبان کبھی نہیں فنا ہوگی۔ اسلئے کہ ایسی صورت میں اس زبان کے بولنے والوں کا ایک ایک فرد اپنے کو حقیقی معنوں میں قومی و ملکی زبان کا مربی سمجھے گا اور کوئی زبان قومی و ملکی زبان اسی وقت بن سکتی ہے، جبکہ قوم و ملک کا ہر فرد بلا اختلاف اسکو اپنی مادری زبان سمجھے، اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے، جبکہ زبان میں ہر مذاق کا لٹریچر موجود ہو مختصر یہ کہ "شعر و شاعری" ترقی زبان اور وسعت و قبولیت کا بہترین ذریعہ ہے۔ اُردو ہی کو لیجئے جسکی ابتدائی زندگی میں عالیشان اور مہذب مشاعرے منعقد کئے جاتے تھے۔ کس سرعت سے یہ زبان ہندوستان کے چاروں گوشوں میں پھیل گئی غالباً اس سے یہ خوب واضح ہوگیا کہ "شعر و شاعری" کے پیدا کرنے میں "ارکان خمسہ" کا کہاں تک تعلق ہے یعنی جذبہ مسرت، جذبہ غم و الم، جذبہ محاکات، اصلاح قوم اور خدمت زبان۔

اسرار احمد

# لوری

سو جا آنکھ کے تارے سو جا — سو جا دل کے سہارے سو جا
سو جا راج دُلارے سو جا — سو جا چاند ہمارے سو جا
سو جا سو جا پیارے سو جا

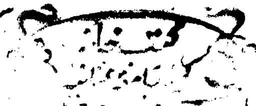
رات نے جھنڈے سکھ کے اڑائے — نیند کھڑی ہے پیر پھیلائے
ماں اپنے بچے کو سلائے — دھیمے سروں میں لوری گائے
سو جا سو جا پیارے سو جا

کلیاں شاخوں پر سوتی ہیں — شاخیں جھک جھک کر سوتی ہیں
چڑیاں بے بستر سوتی ہیں — باجی اپنے گھر سوتی ہیں
سو جا سو جا پیارے سو جا

آہستہ کھیتوں سے نکل کر — ندی سے گذری ہے سنبھل کر
پیڑوں کے سایہ میں ٹہل کر — نیند آئی ہے دور سے چل کر
سو جا سو جا پیارے سو جا

یاس میں آس بندھائیگا تو — بگڑے کام بنائے گا تو
دکھ دنیا کا ستائے گا تو — سکھ دے گا سکھ پائے گا تو
سو جا سو جا پیارے سو جا

خدمت کرنا پیارے وطن کی — رونق بننا اپنے چمن کی
یاد نہ آئے رنج و محن کی — کرتا قدر افسر کے سخن کی
سو جا سو جا پیارے سو جا



افسر میرٹھی

# روشن آرا کی موت

واثق پیارے واثق۔ دل کو سنبھال۔ اب نہ رو تیری حالت مجھے دیوانہ بنادے گی۔ آہ میں جانتا ہوں کہ روشن آرا تیرے لئے کھلونا تھی۔ تیرا غمزدہ دل پہروں اس سے کھیلا کرتا تھا۔ جس وقت تو اسکول سے تھکا ماندہ کمسلایا ہوا گھر پہونچتا تھا تو اسکی مسکراہٹ سے تیرے دل کا کنول کھل جاتا تھا۔ مگر یہ تو بتا کہ کیا یہ تیری چیز تھی ہرگز نہیں یہ اللہ تعالیٰ کی امانت تھی اس نے چند دنوں کے لئے تجھے دیا تھا تاکہ تجھے اسکی محبت اور عنایت کا یقین ہو جائے۔ اب پھر اس نے واپس لے لیا تو یہ رونا چیخنا کیسا۔ تجھکو تو روشن آرا سے چند ہی دنوں میں اتنی محبت ہوگئی کہ واپس دینے کے بعد خون کے آٹھ آٹھ آنسو رونا ہے خواب وخور حرام ہے تو بتا جس کی چیز ہے اگر اسکو واپس نہ ملتی تو اسکو کتنا غم ہوتا۔ بس خاموش ہو جا۔ ورنہ اللہ میاں خفا ہو جائینگے پھر جب تو جائیگا اور روشن آرا کے دیکھنے کی خواہش کریگا۔ تو وہ نہیں دیکھائیں گے۔ مرنا گیا بلا ہے! کچھ بھی نہیں کون کہتا ہے کہ روشن آرا مر گئی! دنیا کہتی ہے تو کہنے دے۔ آنکھیں بند کر سامنے دیکھ کیسا خوشنما باغ ہے اسمیں جا بجا نہریں جاری ہیں۔ ہرے بھرے درختوں پر بھانت بھانت کی چڑیاں چہک رہی ہیں ایک گھنے درخت کے سایہ میں ایک نہایت حسین دایہ روشن آرا کو کھلا رہی ہے۔ روشن آرا خوش ہے اور ننھے ننھے ہاتھوں کو اٹھا کر چڑیوں کو پکڑنے کی کوشش کرتی ہے مگر کبھی کبھی تیرے رونے کی دہشتناک آواز پہونچکر اس کا دل ہلا دیتی ہے وہ چیخیں مار کر دایہ کی چھاتی سے لپٹ جاتی ہے اور رونے لگتی ہے بس۔ خدا کے لئے تو روشن آرا کو نہ رولا

محمد زبیر روحی مسلم ہائی اسکول کانپور



# کب تک

نیرنگیٔ انتظار کب تک ؟ یہ گریۂ زار زار کب تک ؟
تسکین ہے وجہ راحت دل ہے تسکین کا اعتبار کب تک ؟
اشکوں پہ ہے اختیار مانا ہے پر اشکوں پہ اختیار کب تک ؟
کیوں پھینک نہ دوں اتار کر میں پیراہن تار تار کب تک ؟
ہم سے یہ نگاہ کم نگاہی ہے ہے کب تک اے چشم یار کب تک ؟
گلنار کرے گی جیب و دامن یہ دیدۂ اشکبار کب تک ؟
گر نور نہیں تو نار ہو جا ہے مجموعۂ نور و نار کب تک ؟
اے بے خبر حیات جاوید اس زیست کا اعتبار کب تک ؟
جان بر نہ ہوا جلیل غم سے
رہتا وہ بے قرار کب تک

جلیل قدوائی (علیگ)

# حرف خوباں

سغبچۂ نازنین خوش رفتار دلبرے شوخ چشم گل رخسار
آنکہ ہر روز ماں ہمی بخشید ہے مے و نقلے عجیب بسیار ہے
می چشانید قند و شیرینی بس مکرر بجا دم گفتار ہے
غائب از چشم ما شدہ آن شوخ از دل ما بودہ صبر و قرار
یعنی او رفتہ در سفر جائے ایزد الطف خود نگاہش دار
بعد یک روز باز می گردم گفتہ بود از سن آن بت عیار
این بجائے یکے سہ روز گزشت ہم برین حاصلم نشد دیدار
اے حزین راستی ز خوبانہا در جہاں با کسے امید ندار

حزین (ناگانوی) نائب مدیر رہنمائے تعلیم

# اکبر الہ آبادی و شاد عظیم آبادی

## (گذشتہ سے پیوستہ)

اکبر

دل بے تاب نے کیا کیا دکھائے ہیں مجھے عالم یہ پرزہ بھی قیامت ہے خدا کے کارخانے میں

شاد

سرکار دل کی ہوش ربائے زمانہ ہے وسعت تو کچھ نہیں مگر اک کارخانہ ہے

"اکبر کا شعر صاف ہے شاد دل کی کیفیت کے متعلق فرماتے ہیں کہ دیکھنے میں دل تو ایک مختصر مضغہ گوشت ہے مگر اس کے اندر ایک وسیع کارخانہ قدرت نظر آتا ہے کیونکہ تخیلات و جذبات کا جلوہ گاہ دل ہے اس شعر کے طرز ادا اور جوش بیان کو اکبر کا شعر نہیں پہونچتا اور معنوی محاسن کے لحاظ سے بھی شاد کا شعر کہیں مرجح ہے" شاہ صاحب نے حضرت شاد کے شعر کو ترجیح تو دیدی مگر کوئی معقول توجیہ نہ کر سکے حضرت 'اکبر' کا شعر جناب شاد کے شعر سے کہیں اچھا ہے۔

اکبر نے پہلے مصرعے میں لفظ "عالم" سے جو الہام کی صفت لطف پیدا کردی ہے محتاج بیان نہیں برخلاف اسکے شاد کا مصرع اول بہت کمزور ہے بندش بھی سست ہے۔ "ہوش ربا" میں اشیا کی کیفیت سے جو کراہت پیدا ہو گئی ہے اس نے سارا مزا کرکرا کر دیا

حضرت شاد نے دل کو محض "ایک کارخانہ" کہکر وسعت کو محدود کر دیا ہے لیکن حضرت اکبر نے دل بیتاب کی مناسبت سے قیامت کا لفظ اتنا خوب انتخاب کیا ہے جسکی شوریدگی و وسعت کا اندازہ مشکل ہے۔

اکبر

کہتے ہیں فطرت جسے یہ ہے نقاب روئے دوست ہے اسی پردہ میں پنہاں آفتاب روئے دوست

شاد

جو آنکھیں ہوں تو بچشم غور سے اوراق گل دیکھو کسی کے حسن کی تشریح لکھی ہیں ان رسالوں میں

اکبر کہتے ہیں کہ بظاہر قدرت کے پردے میں شاہد حقیقی کا حسن جمال مستور ہے اسی مسئلہ کو شاد دل آویز انداز میں بیان کرتے ہیں کہ اوراق گل جراید فطرت ہیں جن میں حسن کی شرحیں مرقوم ہیں ...... پھولوں کو رسالہ قرار دینا معنی خیز ہے اور لفظ "کسی" میں کتنی بلاغت مستور ہے شاد کا شعر اکبر کے شعر سے بہر حال بہتر ہے" شاہ صاحب کہتے ہیں کہ "کہ پھولوں کو رسالہ قرار دینا کتنا معنی خیز ہے" حالانکہ شاہ صاحب کا ماخذ فارسی کا بہ زبان زد شعر ہے۔

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورق دفتر ایست معرفت کرد گار

فرمائیے اب وہ "دلآویز انداز کہاں گیا۔ اکبر کا مطلع اسقدر خوب اور حقیقت کا پہلو لئے ہوئے جسکی تعریف نہیں ہو سکتی۔ حضرت شاد نے محض اوراق گل ہی تک حسن حقیقی کی شرح محدود کردی مگر اکبر کی وسعت نظری ملاحظہ فرمائیے کہ وہ تمام فطرت کو حسن ازلی کی جلوہ گاہ سمجھتے ہیں سچ پوچھئے تو اکبر نے وحدۃ شہود کے متعلق مسئلہ جس لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو ذوق سلیم سے متصف ہیں۔ شاہد حقیقی کا حسن اوراق گل ہی میں نہیں وہ تو فطرت کے ذرے ذرے میں تاباں ہے۔

اکبر

بہار آئی ہے اک آئینہ معنی نشاں ہوکر ۔ چمن میں بوے گل پھیلی ہے تیری داستاں ہوکر

شاد

مہک اٹھا چمن دہر کا پتہ پتہ ۔ راز چھپنے نہیں دیتی تری خوشبو تیرا

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ شاد کا ذوق نظر نہایت وسیع ہے وہ کائنات کے ذرے ذرے میں معشوق کی جلوہ نمائی کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ اکبر نے اسکو صرف موسم بہار تک محدود کردیا ہے نہیں معلوم شاہ صاحب نے کیسے اکبر کو محدود کردینے کا مرتکب ٹھہرایا "بہار آئی" سے تو یہ ہرگز نہیں مترشح ہوتا اور اگر تھوڑی دیر کے لئے ہم یہ تسلیم بھی کرلیں تو حضرت شاد کا پہلا مصرع بھی اسی کو ظاہر کررہا ہے۔ اہل زبان پر پوشیدہ نہیں کہ "مہک اٹھا" سے استمراری یا دوامی

کیفیت نہیں مراد لی جا سکتی۔ حضرت اکبر کا شعر نہایت صاف خوش اسلوب و بلیغ ہے اسکے مقابلہ میں شاد کا شعر نہایت پھیکا ہے شاد کے دوسرے مصرع میں تعقید لفظی نے تو غضب ہی کر دیا۔

اکبر

یہ ادائیں یہ نگاہیں یہ بلا کی چتون — میں تو کیا ضبط فرشتوں سے بھی واللہ نہ ہو

شاد

ہائے وہ جادو بھری آنکھیں وہ کافر چتونیں — وہ بڑا مومن تھا قائم جسکا ایماں رہ گیا

میرے خیال میں شاد کا شعر زیادہ مستانہ ہے دوسرے مصرع میں لفظ "مومن" کتنا بلیغ واقع ہوا ہے اور خصوصاً کافر کے مقابلہ میں، حقیقت میں یہاں پر شاہ صاحب نے اپنے خوش اعتقادی سے زیادہ کام لیا ہے ورنہ اکبر کا شعر بہت اعلیٰ و ارفع ہے۔

(۱) حضرت اکبر کے شعر میں محاکات جس قدر مکمل ہے شاہ صاحب کے یہاں نہیں حضرت اکبر نے پہلے ہی مصرع میں معشوق کی تین کیفیتوں کا نقشہ کھینچا ہے اور شاہ صاحب صرف آنکھوں ہی کے بیان تک رہ گئے۔

حضرت اکبر کا شعر اثرات حسن کا کامل ترین ترجمان ہے معصوم فرشتوں سے بھی ضبط نہ ہونا حسن معشوق کا انتہائی معرف ہے شاہ صاحب کی تگ و دو تا زصرف مومن تک رہ گئی۔

اکبر

امتیاز حسرت و رنج و الم جاتا رہا — غم ہوا اتنا کہ اب احساس غم جاتا رہا

شاد

خموشی سے مصیبت اور بھی سنگین ہوتی ہے — تڑپ اے دل تڑپنے سے ذرا تسکین ہوتی ہے

شاہ صاحب باوجودیکہ اس بات کے قائل ہیں کہ "دونوں شعروں کا فلسفہ جداگانہ ہے" لیکن حیرت ہے کہ موازنے کی الجھن میں پھنس گئے۔

اکبر

بہار بے بقا پر ناز کیسا اور خوشی کیسی — بجا ہے حیرت نرگس کہ گل کی یہ ہنسی کیسی

## شاد

یہاں نہ نشو و نما کا حاصل کوئی ثمرہ ہے رنگ و بو کا ہنسو گے خود اس چمن میں غنچو زمانہ آئے ذرا نمو کا

دونوں شعروں میں دنیا کی بے ثباتی اور عبرت پذیری کی تلقین ہے 'اکبر' کہتے ہیں کہ پھولوں کی ہنسی کو دیکھکر نرگس حیرت زدہ ہے ........ 'شاد' کہتے ہیں کہ گلشن عالم کی عشرت کسی کو راس نہیں آتی ابھی کمسنی کی وجہ سے غنچوں کو اپنے رنگ و بو پر مسرت ہے مگر جب نمو پذیر ہونگے تو محسوس کرینگے تو نشو و نما کا کوئی حاصل نہیں ہے ...... لہذا وہ خود بہار و باغ کے وجود پر ہنسینگے شاد کے شعر کو اکبر کے شعر پر فوقیت ہے۔ مضمون تو دونوں کا ایک ہے مگر بلاغت کے پہلو شاد کے شعر میں زیادہ ہیں

افسوس کہ شاہ صاحب نے شاد کے شعر کا مطلب خود اسقدر خبط کر دیا ہے کہ اسکی رہی سہی خوبی بھی جاتی رہی (ع شد پریشاں خواب من از کثرتِ تعبیرہا+ شاہ صاحب فرماتے ہیں "ابھی کمسنی کی وجہ سے غنچوں کو اپنے رنگ و بو پر مسرت ہے" نہیں معلوم کہ یہ مطلب شعر کے کسی ٹکڑے سے اخذ کیا گیا ہے ہاں اگر اس کا تعلق "بطن شاعر" سے ہو تو دوسری بات ہے۔ اس چمن میں ہنسنے سے "اس چمن پر ہنسنے" کا مطلب پیدا کرنا کہاں کا محاورہ ہے۔ اصل میں حضرت شاد کے شعر کا مطلب صرف اتنا ہے کہ اس چمن میں نشو و نما کا کوئی حاصل نہیں ہے اسلئے جب غنچوں کے نمو کا زمانہ آئیگا تو وہ خود اپنی غفلت پر ہنسینگے۔ مگر یہ مطلب شعر کے الفاظ سے اچھی طرح حاصل نہیں ہوتا۔ اس لئے اگر شعر یوں ہوتا تو بہتر تھا ؎

یہاں نہ نشو و نما کا حاصل نہ کوئی ثمرہ ہے رنگ و بو کا ہنسو گے غفلت پہ اپنی غنچو زمانہ آئے ذرا نمو کا

شعر سابق کے دوسرے مصرع میں "اس چمن میں" کا ٹکڑا بالکل فضول تھا اسلئے کہ پہلے مصرع میں لفظ "یہاں" بذات خود مکمل تھا اب میں شاہ صاحب ہی کے انصاف پر چھوڑتا ہوں کہ ان دونوں شعروں میں کون سا شعر بہتر ہے۔

## اکبر

یاس ہی یاس تھی جب موت کا پیغام آیا میں نہ سمجھا کہ یہ جینا مرے کس کام آیا

## شاد

زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا میں باز آیا　　اب بھی اک عمر پہ جینے کا نہ انداز آیا

اکبر زندگی کی ہیچ انجامی بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ موت کے وقت سوا ے یاس وحرمان کے اور کچھ نہیں ہے شاد کا شعر وسیع تخیل پیش کرتا ہے وہ کہتے ہیں کہ ایک عمر طویل گذارنے پر بھی نہ نصب العین حیات کی تکمیل ہوئی اور نہ زندگی کو بہتر و مفید اسلوب میں صرف کرنیکا سلیقہ آیا۔ اس شعر سے اکبر کے شعر کو کوئی نسبت نہیں"۔

سچ ہے عادت طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے شاہ صاحب کو چند جملے یاد ہیں۔"اس شعر سے اکبر کے شعر کو کوئی نسبت نہیں؛ شاد کا شعر بہر حال بہتر ہے" وغیرہ وغیرہ اکبر کا شعر شاد کے شعر سے کسی حیثیت سے کم نہیں اکبر کہتے ہیں کہ جب موت آئی تو سوائے یاس کے کچھ نہ تھا۔ اسلئے اب انھیں اپنی غفلت کا احساس ہوتا ہے اور بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں ع "میں نہ سمجھا کہ یہ جینا مرے کس کام آیا"؛ شاد ایک طویل عمر بسر کرنے پر بھی زندگی کی شکایت کرتے ہیں۔ اور اس سے پناہ مانگتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اکبر کا شعر بیخبری اور غفلت کا بہترین خاکہ ہے کہ تمام زندگی اس کا احساس ہی نہیں ہوا۔ برخلاف اسکے شاد نے غفلت کو ایک عمر پر محدود کر کے شعر کا لطف کھو دیا۔

## اکبر

ہر روز یہ کہدیتے ہو اب اور کسی دن　　اس وعدہ خلافی پہ کرو غور کسی دن

## شاد

تم تو شباب آتے ہی کچھ اور ہوگئے　　بدلی وہ وضع طور سے بے طور ہوگئے

شاہ صاحب اسکے معترف ہیں "کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا مشکل نظر آتا ہے" تاہم اتنا کہے بغیر نہ رہ سکے کہ "شاد کا شعر زیادہ پر معنی و متخیل ہے"۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شاد کا شعر اکبر کے شعر سے معنویت میں فائق ہے؛ مگر شوخی اور زبان کی صفائی میں اکبر کے شعر سے کہیں کمتر ہے "اب اور کسی دن" میں ایک دنیا ے حقیقت مضمر ہے

اکبر

نشتر لگائے جا نوائے رنج نا امیدی دل کو ابھی شکایت باقی ہے جوش خوں کی

شاد

یوں ہی رہ رہ کے نوائے نا امیدی دل کو چھیڑ جا یہی مہمیز رخش عمر کو چالاک کرتی ہے

بزرگوں نے کہا ہے کہ دانا دشمن نادان دوست سے بہتر ہوتا ہے۔ شاہ صاحب حضرت شاد کے معتقد تو ہیں مگر بری طرح سے وہ جوش عقیدت میں حضرت شاد کے شعروں کا مفہوم بھی اچھی طرح نہیں سمجھتے شاہ صاحب شاد کے شعر کی توجیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "نا امیدی کی چھیڑ دل کے لئے نہایت امید افزا ہے کیونکہ اسی مہمیز سے توسن عمر تیز گام ہو جاتا ہے"۔ اگر شاد کے شعر کا مطلب یہی ہے تو حضرت اکبر کا شعر بدرجہا بڑھا ہوا ہے۔ نا امیدی سے خدا جانے کسطرح توسن عمر تیز گام ہو جاتا ہے جبکہ زندگی کی گھڑیاں ایک مدت معینہ کے تابع ہیں اصل یہ ہے کہ رخش عمر کی چالاکی سے اسکی تیز گامی مراد نہیں ہے اس لئے کہ عمر کی رفتار گھوڑے کی طرح مختلف نہیں ہوتی کہ کبھی قدم چلے اور کبھی پویہ۔ رخش عمر کی چالاکی کا مفہوم محض اضطراب و کشمکش ہے، جو کہ دل کی چھیڑ سے بڑھتی ہے۔ اب شاہ صاحب اپنے گریبان میں منھ ڈالکر دیکھیں کہ کس کا شعر بہتر ہے۔

اکبر

زندہ ہوں مگر زیست کی لذت نہیں باقی ہر چند کہ ہوں ہوش میں ہشیار نہیں ہوں

شاد

پیری میں امنگیں نہیں وہ جوش نہیں ہے آپ اپنے کو سمجھوں مجھے یہ ہوش نہیں ہے

شاہ صاحب اسکو تسلیم کرتے ہوئے کہ "محاسن شعری دونوں میں تقریباً یکساں ہے" فرماتے ہیں کہ "تاہم شاد کا مصرعۂ ثانی نہایت برجستہ و بے ساختہ پر جوش و پر اثر ہے۔ یوں ہی ان کا شعر ہر نوع جذبات سے لبریز ہے"

اکبر کا شعر شاد کے شعر سے کہیں اعلیٰ ہے۔

حضرت شاد نے عدم ہوش کو محض پیری ہی تک محدود کر دیا ہے، اور حضرت اکبر کا شعر قید زمان سے آزاد ہے، ظاہر ہے کہ جتنی وسعت اکبر کے شعر میں ہے شاد کے شعر میں نہیں

شاد کہتے ہیں کہ مجھے یہ بھی ہوش نہیں کہ اپنے کو سمجھوں۔ یہ کوئی نرالی بات نہیں ہے۔ اسکو اکبر نے بھی ادا کیا ہے مگر بلیغ طریقہ سے۔ ہوش میں ہو کر ہشیار نہ ہونا سہل ممتنع کی بہترین مثال ہے۔

اکبر

عجب فتنہ خرام نازک قاتل سے اٹھتا ہے سنبھلتا ہی نہیں دامن قدم مشکل سے اٹھتا ہے

شاد

خرام ناز میں دُورا یہی کھتا ہے گردن کا نہیں اٹھتا مرے نازک بدن سے بوجھ دامن کا

شاہ صاحب اکبر کے شعر کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "شاد کا شعر اسکے مقابلہ میں کچھ کم پر لطف نہیں ہے"۔

اکبر کا شعر مکمل محاکات پیش کرتا ہے، دوسرا مصرعہ ایک تصویر ہے، جس سے خرام نازک کا نقشہ آنکھوں میں آپ ہی آپ کھنچ آتا ہے۔ حضرت شاد کے شعر میں لفاظی کے سوا کچھ بھی نہیں۔

موازنہ ختم کرنیکے بعد شاہ صاحب نے حضرت شاد کی ایک دفعہ پھر پرزور الفاظ میں مدح سرائی کی ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ "شاد کی نگاہ دوربین جن جذبات و خیالات عالیہ کے نکات تک پہنچتی ہے، اکبر کے تخیل کی رسائی وہاں تک نہیں۔ صرف اکبر ہی پر کیا منحصر ہے میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ موجودہ دور میں کوئی شاعر رنگ تغزل میں مولانا شاد کا حریف نہیں"

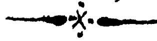
حسن اعتقاد کی جو جھلک ان الفاظ میں نمایاں ہے اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ مرحوم اکبر موازنہ کی الجھن میں نہ پھنسائے جاتے اس لئے کہ موازنہ و مقابلہ تو مقابل و حریف میں ہوا کرتا ہے شاہ صاحب نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ آگے چلکر دونوں اساتذہ کی دو دو ہمطرح غزلیں درج فرماکر ارباب نظر سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ دیکھیں دونوں حیثیت خیالات و جذبات اکبر کو شاد سے کیا نسبت ہے"۔

شاہ صاحب نے ان دونوں ہمطرح غزلوں میں موازنہ کی زحمت نہیں گوارا فرمائی اسلئے

ہم بھی خاموش رہتے ہیں کہ ہماری کوشش مدافعانہ ہو اور اقدام شاہ صاحب ہی کے حصہ میں آئے تاہم حضرت شاد کے متعلق یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ انھوں نے دونوں غزلیں حضرت اکبر کی غزلوں پر کہی ہیں، چنانچہ ان کی یہ دونوں غزلیں یار رسالہ ہی "معارف" میں شایع ہوئی ہیں

افضال

# محشرستانِ خیال



بزمِ خیال میں ادا آج مری نماز ہو
یار کا پائے ناز ہو میرا سرِ نیاز ہو

ٹوٹ رہی ہوں بجلیاں انکی حریم ناز ہو
میری نگاہ شوق ہو جلوۂ دلنواز ہو

خاک کے ذرے ذرے میں جلوہ نما ہے حسنِ دوست
لیکن اگر نظارہ کوش دیدۂ امتیاز ہو

دیکھ نہ دلفریبیاں جلوہ گہِ مجاز کی
ذوقِ نظر سے کام لے پردہ کشائے راز ہو

تیرے رخِ سیاہ میں جلوۂ زلفِ دوست ہے
اے شبِ غم خدا کرے عمر تیری دراز ہو

جائیں گی کس کی بزم میں طور کی لن ترانیاں
طالبِ دید بھی اگر تجھسا ہی بے نیاز ہو

روحیِ غم نصیب سن اپنا علاج آپ کر
آپ ہی دردِ شوق بن آپ ہی چارہ ساز ہو

روحی

# گوہر عصمت

## سلسلۂ اول جلد اول



شام کے چار بجے ہیں، سنئے عجائب خانہ کے دروازہ پر ایک منتخب (دوشیزہ) حسن جلوہ افروز ہے، جس کی بیقرار نگاہیں بار بار ایک کنج گلاب پر پڑتی ہیں، جہاں کچھ معزز خاتونیں فرش پر بیٹھی ہوئی اپنا دل بہلا رہی ہیں، قدرتی زمردین سبزہ کے سلیقہ سے ترشے ہوئے تختوں پر ہری بانات کے نرم و نازک قالینوں کا دھوکا ہوتا ہے گلاب باڑی کی بہاریں اپنے شباب پر ہیں۔

دوشیزہ اُن کی روکھی سوکھی باتوں سے گھبرا کر عجائب خانہ کی طرف چلی آئی تھی، وہ واپس جانے ہی کو تھی کہ ایک زبردست شیر غرّایا اور ڈکارنے لگا، وہ طبعاً جانوروں کی شوقین تھی، اس آواز نے اُس کے دل کو اور بھی بے چین کر دیا، وہ بے اختیار اُس کی جانب دوڑ پڑی، اور کٹھرے کے سامنے والے جنگلے پر جھک کر محو سیر ہوگئی، اُس کی سڈول کہنیاں لوہے کی سلاخ پر ٹکی ہوئی تھیں، اور خوشنما ہاتھوں میں رخسار سیمین محو آرام تھے، حسن نظر نواز اپنی امنگوں میں سرشار تھا، نظارہ انتہا کا دلفریب اور باغ کی سجاوٹ بے حد دلچسپ تھی، گہوارہ شباب اس کے لئے آغوش مادر تھا، امنگوں کی بڑھتی ہوئی پینگیں ماتا بھری لوریوں کا کام دے رہی تھیں اور جادو فریب حسن حریم ناز میں طفلانہ انداز سے محو خواب تھا، اس کی زندگی معصوم اور سادہ تھی، وہ دنیا کی

برائیوں سے ایسی ہی بے خبر تھی جیسے آبدار موتی کنار صدف میں، اُس کی ہستی ایک تر و تازہ گلاب تھی جس کی نازک پنیاں زمانہ کی نیرنگیوں سے چھو تک نہیں گئی تھیں۔

افسوس! ایسی لڑکیاں بہت کم ہیں جو اس سن و سال میں دھڑکتے ہوئے دلوں پر اپنے چھوٹے سے خوبصورت ہاتھ رکھکر بھی معصومیت کا دعویٰ کر سکیں۔

وہ اسی بیخودی کی حالت میں سرمست نظارہ تھی کہ یکایک دربان کے خاص کمرہ کا دروازہ کھلا، دربان کے ساتھ ایک معزز آدمی باہر نکلا جس نے ادھر اُدھر بے پروائی سے نظر ڈالی اور دربان کے ہاتھ میں کچھ دیکر آگے کو بڑھ گیا، دوسرے نے نہایت ادب سے سلام کیا، ہاتھ والی نامعلوم شئے کو جیب میں محفوظ کر لیا اور جانے والے کو تعظیم آمیز شکر گذار نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

شریف جوان روش کی ایک موڑ پر پہنچکر دیکھنے والوں کی آنکھ سے اوجھل ہو گیا، لڑکی پھر ایک بار رنگارنگ پرندوں کی ہوش رُبا سیر میں پہلے سے زیادہ محو ہو گئی، خدا جانے وہ اس حالت میں کب تک رہتی، مگر کسی آنے والے کی ہلکی ہلکی چاپ نے اُسے چونکا دیا، دیکھا تو دربان پس پشت کھڑا ہوا تھا اُس کی نزاکت فریب انگلیاں طلسمی زنانہ جیب کی طرف بڑھیں (وہ جیب جو صرف مستورات کے لئے سرمایہ ناز ہیں اور جن کا پتہ آجتک کسی مرد نے پایا ہی نہیں) دوشیزہ نے روپہلی تھیلی سے ایک روپیہ نکال کر دربان کو دیا اور سبزہ زار کی جانب روانہ ہوئی، تھوڑی دور چل کر وہ حیران سی ہو گئی کیونکہ خاتونوں کا گروہ جا چکا تھا اور اُسکی خالہ لیڈی پالائن بھی غائب تھی۔

وہ طبعًا دلیر اور مطمئن دل و دماغ تھی اس لئے مطلق پریشان نہیں ہوئی اُسے معلوم تھا کہ اُس کی خالہ شاندار بھی ہے اور بلند قد بھی، اُسے یقین تھا کہ وہ چھپ نہیں سکتی، یہی خیال اپنے دل میں لئے ہوئے اُس نے دبے پاؤں ٹہلنا اور تلاش کرنا شروع کیا، آدھ گھنٹہ سے بھی زائد ہو گیا مگر خالہ کا کوئی نشان نہ ملا اب "ڈسیما ڈین" کے سرخ و سفید چہرہ پر خفیف پریشانی کے آثار ظاہر ہونے لگے، گم ہو جانے کا خیال نہ تھا کیونکہ گلاب باڑی میں ایسے بہت سے باغبان تھے

جن سے راستہ معلوم کیا جا سکتا ہے، مگر خالہ اماں کی خفگی کا دھیان اُس کے اطاعت گذار دل میں چٹکیاں لے رہا تھا، وہ ایک چوراہے کے گوشے میں حیران کھڑی ہوئی تھی، اُس کے سرخ وسفید رخسار رشک آئینہ تھے جس میں ہر گذرنے والا جذبہ صاف صاف اپنی جھلک دکھا رہا تھا، اُس کی روشن آنکھیں اور موثر لب راستہ چلنے والوں کو بے ساختہ اپنی جانب متوجہ کرلیتے تھے، اتنے میں وہی شریف جوان (جو خاص کمرہ سے باہر آیا تھا) آتا ہوا دکھائی دیا، اُس کی رفتار آہستہ تھی اور نگاہیں زمین کی طرف، گذرنے والے نے پریشان چہرہ کی "تصویر حیرت" پر سرسری نگاہ ڈالی اور آگے بڑھ جانے کا قصد کیا، مگر لڑکی کی نرگسی آنکھوں اور طناز ابروؤں میں خدا جانے کیا چیز تھی جس نے جانے والے کو اُس کی مرضی کے خلاف ٹھہرا لیا۔

شریف جوان۔ (ادب آمیز مگر موسیقی انگیز لہجے میں) کیا آپ کسی کی تلاش میں ہیں، میں کچھ مدد دے سکتا ہوں؟

دوشیزہ۔ (طفلانہ سادگی سے) میں اپنے ساتھیوں سے جدا ہوگئی ہوں اور باوجود تلاش کے ابھی تک نہیں پا سکی۔

شریف جوان۔ نے اپنے روبرو ایک ایسی کنواری لڑکی کو پایا جو نہایت سادہ وضع میں تھی، جس کا چہرہ دلفریب تھا، مگر اس پہلی ملاقات میں اس نے کوئی خاص اثر نہیں دکھایا، لڑکی نے بھی اپنے ہم کلام کو دیکھا شریف جوان نہایت موزوں طریقہ سے ملبوس تھا، اس کا چہرہ خوبصورت اور آنکھیں سیاہی مائل بھورے رنگ کی تھیں جن میں درد و غم کی ایک خفیف جھلک موجود تھی۔

شریف جوان۔ کیا اس سے پہلے کبھی آپ گلاب باڑی کی سیر کے لئے تشریف نہیں لائیں؟

دوشیزہ۔ جی نہیں، یہ پہلا اتفاق ہے، ہم قصبہ میں رہتے ہیں، چونکہ میں نے اِس عجائب خانہ کی بہت سی تعریفیں پڑھیں اور سُنی تھیں اس لئے اپنی خالہ کے ساتھ اصرار کرکے آج یہاں آئی تھی۔

شریف جوان۔ تو پھر اس طرف تشریف لائیے۔

یہ کہکر دونوں پہلو بہ پہلو ایک طرف روانہ ہوئے، تھوڑی دیر تک بلا قصد ادھر اُدھر پھرا کئے مگر اپنے مقصد میں ناکام رہے

جوان اپنے خیالات میں اتنا کچھ غرق تھا کہ
اُسے کسی کی موجودگی بھی یاد نہ رہ گئی۔

دوشیزہ۔ (ہوشیار کرنے کے لئے) آئے
ہائے میں کتنی پیاسی ہو رہی ہوں۔

شریف جوان۔ (چونک کر) تو پھر آپ نے
پہلے سے کیوں نہ بتایا۔

دوشیزہ۔ اس لئے کہ قہوہ خانہ دیکھکر (مجھے)
اپنی پیاس کا خیال آیا۔

دونوں کمرے میں داخل ہوئے، جوان
نے حکم دیا اور چاء کا اعلیٰ درجہ کا سامان
میز پر چن دیا گیا

جوان۔ (سلسلۂ گفتگو چھیڑنے کے لئے)
آپ نے اپنی خالہ کا نام نہیں بتایا۔

دوشیزہ۔ لیڈی پالائن۔

جوان۔ اور خود آپ کا ؟

دوشیزہ۔ ڈسیما ڈین۔

چاء ختم ہوئی، جوان حساب چکانے لگا
ڈسیما خاموش بیٹھی ہوئی تھی کہ یکایک اُسکی
خالہ شاہانہ رفتار سے آتی ہوئی دکھائی دی۔

دوشیزہ۔ (دوڑکر لیڈی پالائن کے شانہ
سے چمٹ جاتی ہے) اچھی اماں!

لیڈی پالائن۔ تم کہاں تھیں اور یہ صاحب
کون ہیں ؟

ڈسیما ڈین۔ (جوان کی طرف شکر گذارانہ انداز
سے دیکھکر) یہ معزز جوان آپ کے ڈھونڈھنے
میں میرے معین رہے، ہم لوگوں نے تمام
تلاش کیا مگر آپ نہ ملیں، لیڈی پالائن نے
چاء کے سامان اور سہی قد جوان کو فکرمند
اور بے قرار نگاہوں سے دیکھا۔

ڈسیما ڈین۔ (ان بامعنی نگاہوں کا جواب
دیتے ہوئے) میں پیاسی تھی، ہم یہاں
بیٹھ کر چاء پی رہے تھے کہ آپ آ ہی گئیں
ہمیں ان کا شکریہ ادا کرنا چاہئے۔

لیڈی پالائن۔ میں آپ کی بہت ممنون ہوں
مجھے افسوس ہے کہ آپ کو میری بھانجی کی بدولت
کسی قدر زحمت اُٹھانی پڑی یہ مجھے کس کی شکر
گذاری کا شرف حاصل ہو رہا ہے ؟

جوان۔ (اس بے لطف سوال سے کسی قدر
جھلا اُٹھا، اور سگریٹ کیس سے اپنے نام کا
کارڈ نکال کر دیدیا) "یہی میرا نام ہے"

لیڈی صاحبہ لفظوں کو پڑھکر چیں بہ جبیں
ہوئیں، کارڈ ہتھیلی پر تھا اور چہرہ کسی اندرونی
جذبہ کی وجہ سے سرخ ہوگیا تھا۔

جوان اس کی وجہ سمجھ گیا اور اُس نے
رخصتی سلام کے لئے ہاتھ اُٹھایا۔
شاندار خاتون تنکر اور شاندار بنگئی، اُس نے

بھانجی کو اپنی جانب کھینچ لیا ، گویا کہ دوشیزہ کو کسی حفاظت کی ضرورت پیدا ہو گئی تھی ، مگر ڈیسما بجلی کی طرح اپنی خالہ کی محبت آمیز ہلکی گرفت سے نکل کر شریف جوان کے سامنے آ ئی ۔

ڈیسما ۔ آپ کے مہربانیوں کی قدر میرے دل میں بہت ہے ، آپ براہ کرم خالہ جان کے برتاؤ سے کشیدہ خاطر نہ ہوں ۔ . .

دونوں نے ہاتھ ملائے اور ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے ۔

لیڈی پالائن ۔ بیٹی ڈیسما ادھر آؤ ۔

ڈیسما ۔ (حد سماعت سے دور ہو کر) آپ ان سے اس درجہ کیوں خفا ہیں ؟

لیڈی ۔ بیٹی تم ابھی بالکل نادان ہو ، کیا تمھیں پرائے کی مدد منظور کرنا چاہئے تھا؟ اس کے ساتھ بیٹھکر چاء پینا چاہئے تھا ؟

دوشیزہ ۔ کیوں نہیں ؟

لیڈی ۔ اس لئے کہ وہ دنیا والوں میں سب سے برا اور خراب انسان ہے ۔

## باب ۲

"وزر بہ سر فولاد نہی نرم شود "

وہی "دنیا کا سب سے برا انسان " لارڈ جانٹ گلاب باڑی سے نکل کر اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا " نشاط محل " کی طرف جا رہا ہے ، یہ محل ہر طرح سے آپ اپنی ہی نظیر ہے ، دروازہ میں شیرا اور تیندوے کی بے عیب کھالوں کا نہایت قیمتی فرش قرینے سے بچھا ہوا ہے لارڈ صاحب کو داخل ہوتے ہی کمرہ سے تمبا کو کی خوشبو آتی ہوئی محسوس ہوئی ، شاہ بلوط کا منقش دروازہ کھلتے ہی اندر ایک خوبصورت نوجوان شخص مرصع سہری پر آرام سے بیٹھا ہوا نظر آیا ، اس کے کتابی چہرہ میں زنانہ حسن کی نرمی تھی ، اُس کے لب و ابرو اس بات کے عادی ہو گئے تھے کہ آنکھوں کی نیلگونی سے مل کر اپنے مالک کی بے گناہی اور خوش دلی کا راگ گائیں لارڈ جانٹ دروازہ پر ٹھٹھک کر رہ گیا ، اُس کے چہرہ کا رنگ سرخ ہو گیا ، مٹھیاں بندھ گئیں ترشے ہوئے لب غنچہ کی طرح سمٹ گئے ، وہ آتشدان کے قریب جا کر ایک طلائی نشست پر چپ چاپ بیٹھ گیا ، دونوں ایک دوسرے کا منہ گہری خاموشی کے ساتھ دیر تک تکتے رہے گویا دو تصویریں آمنے سامنے رکھی ہوئی تھیں آخر نو وارد ہی نے پہلے مہر سکوت توڑا ۔

مارگن ۔ مزاج شریف ۔

لارڈ صاحب (بہادروں والے مستقل لہجہ میں) آخر تم نے مجھے پالیا۔
مارگن۔ واہ کیا انداز گفتگو ہے، قربان جائیے اس مہمان نوازی کے، یوں ہی بچھڑے ہوئے دوستوں کی آؤ بھگت ہوتی ہے، ایک میں ہوں کہ آپکی تلاش میں برسوں سرگرداں رہا ہوں۔
لارڈ صاحب۔ تم نے میرا پتہ کس طرح چلایا؟ (لارڈ صاحب نے اس لہجہ میں پوچھا جیسے کوئی مریض اپنے معالج سے پوچھے کہ اُس کی مہلک بیماری مریض نے کس طرح معلوم کرلی) نووارد جواب دینے سے پہلے سہری کے بائیں جانب صندل والی میز پر جھکا، اطمینان سے سگرٹ کا گل جھاڑا، جھالردار تکیے درست کرکے استقلال سے لارڈ صاحب کی غضبناک شکل کی طرف دیکھنے لگا۔
مارگن تھارپ۔ بھائی برنرڈ، ارے معاف فرمائیگا، جناب لارڈ صاحب آپ مجھے بے لطف نگاہوں سے کیوں شرف اندوز فرمارہے ہیں، خیال تو کیجئے کہ ابھی دو ہی برس گذرے ہونگے . . . . .
(رخسارے تمتما اُٹھے مگر اُس نے مقراض سخن ہوکر کہا)

"وہ پُرانے واقعات یاد دلانے کی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی"
مارگن۔ معاف فرمائیگا، مجھے تو معلوم ہوتا ہے، آپ کے انداز ایسے بیڈھب ہیں کہ مجھکو مدعی کی جانب سے پیردی کرنی ہوگی۔
لارڈ صاحب نے اپنی نگاہیں دوسری جانب پھیرلیں۔
مارگن۔ واقعہ یہ ہے کہ تین برس ہوئے عرب کے ایک نخلستان میں حسن اتفاق سے آپ کو، مجھے، اور ایک تیسرے شخص کو شب گذارنے کا موقع ہوا تھا، اس غربت کی یکجائی نے ہم لوگوں میں گہرے اتحاد کا رشتہ قائم کردیا جو مجھے یقین ہے کہ اب بھی باقی ہوگا۔
لارڈ۔ بے صبر ہوگیا مگر شوکت محض ظرافت آمیز سادہ انداز سے کہنے لگا، آپ بالکل تن تنہا سرگرم سفر تھے، میری بہن میرے ساتھ تھی جس کی خوبصورتی کا تقاضہ سرگرم ضد تھی۔
(لارڈ صاحب کے لب کپکپا اُٹھے اور ایک سرد آہ لبوں سے نکل گئی۔)
مارگن تھارپ۔ اب آپ سمجھے، آپ نے اپنا نام برنرڈ بتایا اور یہ ظاہر کیا کہ آپ گھر سے خوش حال ہیں اور محض سیر و شکار کی

غرض سے سیاحت کر رہے ہیں، اسی نام سے آپ نے میری معصوم بہن پر عشق کے پھندے ڈالے، محبت کے داؤں کھیلے اور آخر میں میدان الفت آپ کے ہاتھ رہا۔

**لارڈ صاحب۔** ایک قدم آگے بڑھا مگر اُس کی نگاہیں مارگن کے چہرہ پر اس طرح جمی ہوئی تھیں جیسے کوئی قیدی جج کے سامنے آخری فیصلہ سننے کے لئے منتظر ہو۔

**مارگن۔** موصوفہ کی خوش نصیبی نے شکار ہو کر صیاد کا کام کیا، مسرت کی تکمیل محض شادی سے ہو سکتی تھی اس لئے موجودہ قوانین کے ماتحت، شرعیہ رسم و رواج کے مطابق عقد پڑھا گیا اور منکوحہ کی خوش نصیبی نے اطمینان کے راگ گائے ؎

میرے حواس لیلئے یار کی چشم مست نے
فتح کا تاج رکھدیا سر یہ مری شکست نے

آپ اور میری ماہ وش بہن بیاہ ہے جا چکے نکاح نامہ معہ صحیح تاریخ کے میرے پاس موجود ہے اس کے بعد آپ اتنی کم مدت کے لئے جدا ہوئے کہ کئی برس سے کچھ پتہ ہی نہیں چلتا تھا، اب لارڈ سے نہ رہا گیا اور نہایت تلخی آمیز لہجہ سے کہنے لگا۔

اس لئے کہ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ایک خانہ بدوش آوارہ گرد تھی، ایک ایسی عورت جو ...

**مارگن تھا رپ۔** (بات کاٹ کر) خیال رکھئے کہ میں اُسی ماہ جبیں کا بھائی ہوں، یوں کہئے کہ آپ اُن کی نازک مزاجیوں سے کچھ پریشان سے ہو گئے، ایک دن آپ اپنی دلہن کو اس ارادہ سے چھوڑ کر چلے گئے کہ پھر کبھی صورت نہ دکھائیں گے، آپ نے اس بد نصیب مانگ جلی کی بسر اوقات کے لئے ایک فیاضانہ مقرر کر دیا، مگر محبت کی آگ روپیہ سے بجھ نہیں سکتی، میں نے اُن کی دل شکنی کا خیال کر کے شب و روز آپ کی تلاش کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی۔ میں تمام ملکوں کی تلاش کرتا ہوا دو برس کے بعد لندن پہنچا اور آخر کسی نہ کسی طرح آپ کا پتہ لگا ہی لیا، آپ کے فرضی نام نے مجھے بہت سرگرداں رکھا مگر ؎

جو بھی روشنی ہے پھوٹ کر پردوں سے نکلے گی
تجلی حقیقت رہ نہیں سکتی نہاں ہو کر

مجھے یہ بھی دریافت ہو گیا کہ ساحل آر لو پر آپ کا ایک قلعہ ہے، اسکاٹلینڈ میں ایک قیام گاہ لندن میں ایک عالی شان مکان ہے، آپ محض برنرڈ نہیں بلکہ خطاب یافتہ لارڈ جانٹ بہادر ہیں، مختصر یہ کہ ایک عزت و دولت والا کروڑپتی میری عزیزہ بہن کا شوہر ہے

لارڈ صاحب ۔ اب آپ اپنی تحقیقات سے کیا کام لینا چاہتے ہیں ؟

مارگن ۔ عقل سلیم کے نزدیک محض دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ میں اپنی بہن سے اپنی تحقیقات کا انکشاف کردوں اُس کی زندگی اور آپ کی حیات کو تلخ بنا دوں، دوسرے یہ کہ آپکی حالت پر رحم کرکے پچھلی مہربانیوں کا خیال کرتے ہوئے اپنی زبان بند رکھوں۔

لارڈ صاحب ۔ وہ ہیں کہاں ؟

مارگن ۔ وے وہیں ہیں میری تلاش کے نتیجہ کی منتظر ہیں، اگر میں اُن سے جاکر کہوں گا کہ آپ ملک سے باہر چلے گئے ہیں اس وقت یا تو وہ قسمت پر شاکر رہیں گی یا اپنے وطن کی طرف واپس ہو جائیں گی۔

لارڈ صاحب ۔ تو اس کام کے لئے تم کتنی رقم چاہتے ہو، آج تو میں تم دونوں بہن بھائیوں کے قبضے میں مکمل طور پر ہوں تعداد بتا دو ؟

مارگن ۔ کیا آپ کا مطلب اس رقم سے ہے جو آپ کی موجودگی چھپانے کے لئے درکار ہے ؟

لارڈ صاحب ۔ ہاں اپنی زبان بند رکھنے کے لئے ۔

مارگن ۔ فرض کیجئے کہ میں دس ہزار کہوں تو ؟

لارڈ صاحب ۔ ایک منٹ تک غور کرتے کے بعد آہنی صندوقچہ کی طرف بڑھا، ایک اچھی خاصی رقم اشرفیوں کی شکل میں نکالکر میز پر رکھدیا، اور انگلی سے اشارہ کرکے کہنے لگا :۔

”یہ پانچہزار روپئے موجود ہیں۔ جب تک میں اس قید بند سے آزاد نہ ہو سکوں گا اسی قدر ماہانہ ادا کرتا رہونگا۔

مارگن تھارپ نے نئے مہر سے خاموشی کا وعدہ کیا اور اپنے شکار کی آنکھوں میں غصہ کی آگ بھڑکتی ہوئی دیکھکر ذرا رخصتی سلام کیا اور چلتا پھرتا نظر آیا۔

# باب

## ۳

کیسے پچھتائے ہم آنکھوں میں ٹھہر نیکے لئے
پاؤں پھیلائے ہیں اب دلمیں اتر نیکے لئے

جنس لطیف کی معصوم دوشیزہ فطرتوں کے لئے کسی کی بُرائی پہیلیوں سے کم نہیں ہوتی اور ہر پہیلی اپنے دامن میں عجیب

وغریب شوق انگیز طاقت رکھتی ہے۔ سواری گاڑی تیز رفتاری کے ساتھ جا رہی تھی اور ڈیسما اپنی خالہ کے پہلو بہ پہلو بیٹھی ہوئی، نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے خیالات کے مزے لے رہی تھی۔ دوران تخیل میں دوشیزہ نے اپنے دل سے، اکثر سوالات کئے لیکن آج خلاف معمول نرگسی آنکھوں کے ہلالی حلقوں میں خواب آمیز تصور کی شان ہے اور محرک جذبات لبوں کے خم فتنہ انگیز خفیف سی مایوسی کا پتہ دے رہے ہیں اوس کی حیران حیران نگاہوں کے سامنے، گلاب باڑی والے جان کی درد بھری آنکھیں اور غمگین صورت پھر رہی تھی۔ جوان کی تمام مہربانیاں یاد آ رہی تھیں اور اوسکا تعجب بڑھتا جاتا تھا، اوس کی سمجھ قاصر تھی کہ خالہ اماں نے ایسے مہربان آدمی کو 'برے انسان' کے لقب سے کیوں ممتاز کیا ہے۔ اوس نے چاہا کہ خالہ اماں سے، اس معمہ کو پوچھ لے مگر کسی نامعلوم طاقت نے پوچھنے نہ دیا۔ بڑی دیر کے ادھیڑ بن کے بعد، معصوم دوشیزہ اس نتیجہ پر پہونچی کہ مردوں کی ذات بھی عجیب ذات ہوا کرتی ہے اب اس نے چاہا کہ "برے انسان" مگر اپنے مہربان کا نقشہ خیال دل سے محو کردے۔ اس کوشش میں وہ بالکل ناکامیاب رہی اس لئے کہ اوس عجیب انسان کی تصویر اوس کی نگاہوں میں بلا قید اور

بار بار پھر جاتی تھی۔ دوشیزہ حسب معمول آراستہ و پیراستہ نشستگاہ میں داخل ہوئی اوس کی خالہ ایک خط پڑھ رہی تھی، پائوں کی آہٹ پاتے ہی کسی کی نگاہیں تحریر سے اوٹھیں اور دوشیزہ کے چہرہ پر جم گیئں۔ نگاہوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اوسی خط کے متعلق کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن جوش محبت نے مجبور کر دیا اور شاندار خالہ نے دو قدم آگے بڑھ کر، ڈیسما کی پیشانی کے بوسے بے اختیار لے لئے۔ ڈیسما کو معلوم تھا کہ اوسکی خود دار خالہ، رقیق القلب نہ تھی لیکن آج کے بوسوں میں خلاف معمول معنی خیز کپکپی کے احساس نے اوسکو آئینہ بنا دیا۔ کھانے پر بیٹھتے ہی خاتون نے، روپہلی تشتری سے خط اوٹھا کر کہا، بیٹی یہ خط تمھارے باپ کے پاس سے آیا ہے لڑکی نے کچھ جواب نہ دیا اس لئے کہ اُسے اپنے باپ کے متعلق بہت کم واقفیت تھی اور اسکے دل میں والد صاحب کا خیال ایک نقش پارینہ بنکر رہ گیا تھا۔

**خالہ**۔ انھوں نے تمکو بلایا ہے۔

**ڈیسما** (حیرت سے) انھوں نے مجھکو بلایا ہے۔

**خالہ**۔ تم صرف دس برس کی تعلیم و تربیت کے لئے میرے سپرد کی گئی تھیں۔ اگرچہ تم مجھے اپنی لڑکی سے پیاری رہیں لیکن حقیقتاً اپنے والد کی امانت ہو۔

**ڈیسیما۔** اُنھوں نے مجھکو کیوں بلایا ہے اور پھر اسقدر جلد۔

**خالہ۔** (محبت بھرے لہجہ میں) خطا بہت طولانی ہے۔ نفس مطلب یہ ہے کہ امور خانہ داری کی وقتوں کے سبب سے اونکو تمھاری ضرورت پیش آئی ہے تمھارا بھائی، سیانا ہو رہا ہے اور نوکر چاکر بہت اوزیتیں پہونچاتے ہیں۔

**ڈیسیما۔** خاموش ہوگئی، اوس نے زبان سے یہ تو نہ کہا کہ میں والد کے پاس نہیں جانا چاہتی لیکن ماں سے زیادہ پیاری خالہ کے خیال جدائی سے اوسکا دل بے تاب ضرور ہوگیا۔

**خالہ۔** علاوہ اس کے تمھارے باپ کو یقین ہے کہ اونھوں نے حصول خزانہ کی صورت نکال لی ہے۔

**ڈیسیما۔** کیا خزانہ۔ وہ کیا ہیں۔ کیا کرتے ہیں۔

**خالہ۔** وہ موجد ہیں، بہت ہوشیار ہیں اور اکثر ہوشیار آدمیوں کی طرح ابھی تک اپنی تجویزوں میں ناکامیاب ہوتے رہے ہیں لیکن اب کئی برس کی لگاتار محنت کے بعد انھوں نے ایک عجیب بات دریافت کی ہے۔

دوشیزہ کے پیشانی پر بل پڑگئے اور خمدار ابرو جھکر ایک دوسرے سے مل گئے جس سے رخساروں کی جادو بھری نمی میں چار چاند لگ گئے وہ کہنے لگی "ہاں مجھے بھی یاد آگیا، والد صاحب یا تو اپنے کتب خانہ میں بیٹھا کرتے تھے یا پائیں باغ میں اس طرح گھومتے رہتے تھے کہ دونوں ہاتھ پس پشت مقفل ہوتے تھے اور سر جھکا ہوا رہتا تھا۔ بعض وقت وہ اپنی ایجادوں کے متعلق نہایت جوش سے باتیں کرتے تھے مگر دوسرے وقتوں میں خفیف سا جوش بھی اونکی برداشت سے باہر ہوتا تھا - اب وہ مجھکو طلب فرماتے ہیں، اچھی خالہ کیا میرا جانا ضروری ہے۔

**خالہ۔** ہاں بیٹی ضروری ہے (آواز تھرتھرا گئی) میں مجبور ہوں ورنہ ضرور روکتی

**ڈیسیما۔** اپنی کرسی سے اوٹھکر خالہ کے قریب آگئی اور تھوڑی دیر تک مخمل میں ملبوس شانہ پر سہارا دئے ہوئے کھڑی رہی یکایک جی بھر آیا اور اس نے بے اختیار دوزانو بیٹھ کر اپنا سر لیڈی پالائن کی گود میں رکھدیا۔

"پیاری اور اچھی خالہ اماں" یہی چند الفاظ تھے جو اوس کی زبان سے بہ مشکل نکل سکے۔ لیڈی پالائن نے بھی اپنی بھانجی کو زور سے بھینچ کر لپٹا لیا -

تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگی "مجھے صرف تمھارے جانے کا صدمہ نہیں۔

**بھانجی۔** اور کس بات کا قلق ہے؟

**خالہ۔** میں نے تمکو عجیب طور سے تعلیم دی ہے گو اس وقت تم سن کے اعتبار سے سیانی ہوگئی ہو لیکن

حقیقتاً دنیا کے پر زور فریب سخت امتحانات اور
زندگی کی اونچی نیچی گھاٹیوں سے نادان بچوں
کی طرح ناواقف ہو - آج جبکہ تم میری گود سے
جدا ہو رہی ہو مجھکو بار بار شک ہوتا ہے کہ آیا
میں ایسی تعلیم دینے میں حق بجانب تھی یا نہیں -
بھانجی - آپ تو ایسا فرما رہی ہیں گویا میں بے رحم
اور سنگدل جانوروں میں جا رہی ہوں - آخر یہ
ناواقفیت مجھے کیا تکلیف دے سکتی ہے - لیڈی پالائن
نے کچھ جواب نہیں دیا اس لئے کہ مردوں کی زیادتیاں
اور عورتوں کی کمزوریاں دس منٹ میں نہیں بتائی
جا سکتیں -

بھانجی - مجھے کب جانا ہوگا ؟

خالہ - کل -

بھانجی - چونکہ ٹری لیئن اپنی خالہ کی تعلیم کے
مطابق نہ تو اس نے حیرت ظاہر ہونے دی نہ
پریشانی صرف اتنا ضرور کہا "بس قدر جلد"

خالہ - ہاں بیٹی تمہارے والد نے تمکو بلایا ہے
اپنے کمرہ میں چل کر اسباب درست کرو میں بھی مدد
دینے کے لئے آتی ہوں -

اب لیڈی پالائن بھی ضبط نہ کر سکیں اور ڈسیما
نے اونکے کلپ دار شفاف کپڑے پر آنسو کا ایک
موتی ڈھلتا ہوا دیکھ لیا - لیکن جب نگاہیں چار ہوئیں
تو معمر خاتون کی آنکھوں میں وہی ہمیشہ والی اطمینان
بخش موہنی موجود تھی -

## باب ۴

وہ لڑکپن کا تھا حسن اور یہ جوانی کی بہار
گل یہی پہلے بھی تھا رخ پہ مگر قاتل نہ تھا

نازک اندام دوشیزہ اپنی خالہ سے جدا ہوکر
تیز رفتار ریل گاڑی میں سفر کر رہی ہے -
اُس کی آنکھیں روتے روتے سوج آئی ہیں
اور ڈوروں میں مستانہ سرخی دوڑ گئی ہے -
گاڑی اسٹریٹن وُولڈ کے اسٹیشن پر رُکی
اور ڈسیما نے باہر کی طرف نظر دوڑائی -
عمارت مختصر تھی مگر سجی ہوئی ستونوں
پر عشق پیچاں اور سدا بہار کی تازہ بیلیں
چڑھی ہوئی تھیں - پلیٹ فارم پر ایک دیہاتی
قلی اسٹیشن ماسٹر اور ایک فیشن ایبل نوجوان
کے سوا اور کوئی نہ تھا - ڈسیما کا دل ڈوب
گیا کیونکہ والد نے خط میں لکھا تھا کہ اُس کا
بھائی اُسے لینے کے لئے اسٹیشن پر آئیگا -
قلی نے دروازہ کھولا سلام کرکے اسباب
کے بابت پوچھا - ڈسیما اُتر آئی اور حیرت آمیز
مایوسی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی - ڈسیما اپنے
بھائی کے متعلق سوچ رہی تھی کہ فیشن ایبل
نوجوان اُسی طرف سے ٹہلتا ہوا گذرا -

قلی - مس آپ کہاں جائینگی -

ڈسیما - وڈنائمیس -

نوجوان نے یہ الفاظ سن لئے فوراً ڈسیما کے قریب آکر کسی قدر شرمیلے انداز سے کہنے لگا۔ کیا آپ ......؟ پناہ بخدا۔ یہ تو ڈسیما ہی ہیں۔

**ڈسیما**۔ اور تم بھی تو بابی ہو! بچھڑی ہوئی بہن نے اپنے ہاتھ بھائی کے گردن میں ڈالدئے اور ایک گرما گرم بوسہ لے لیا

**بہن**۔ کیوں بابی تم مجھے نہ پہچان سکے اپنے مردانہ انداز سے بے خبر بابی نے ایک سادہ سا قہقہہ لگایا اور اپنی ٹوپی درست کرنے لگا جو اس اچانک پیار کے وقت سر کے ایک طرف جا پڑی تھی۔

**بابی**۔ نہیں میں نے واقعی نہیں پہچانا مجھے تو خیال تھا کہ میں تم سے ادھی قد والی چھوٹی سی بہن سے ملونگا۔

**ڈسیما**۔ (اپنی دھیمی اور شیریں آواز سے ہنس پڑی)

اور میں ایک چھوٹے سے بچے کی منتظر تھی

**بابی**۔ ہم دونوں ناداں ہیں۔ یہ خیال نہ تھا کہ اب ہم تم دونوں سیانے ہو گئے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو اسی حالت میں دیکھنا چاہتے تھے۔ جس حالت میں آج سے دس سال پہلے جدا ہوئے تھے۔

**بابی**۔ آخر تم سیانی ہو گئیں۔ کون کہہ سکتا تھا کہ ویسی شکل وصورت والی بچی کسی دن ایسی نظر فریب خاتون ہو جائیگی۔

**ڈسیما**۔ میں ابھی اُٹھ کر تسلیم بجا لاتی مگر ڈرتی ہوں کہ گاڑی سے نیچے نہ گر پڑوں۔ دوشیزہ کی آنکھیں جوش مسرت سے چمک رہی تھیں اور دلفریب تبسم لبوں سے اٹکھیلیاں کر رہا تھا۔

بابی! تم بھی تو بہت بدل گئے ہو۔ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ یہی پورے قد کا نوجوان شاندار وہی چھوٹا سا بابی بچہ ہے جسے میں لئے لئے پھرا کرتی تھی۔ مگر تم اس وقت بھی نہایت نظر فریب تھے۔

**بابی**۔ ڈسیما! اگر اب تم تکلیف کے ساتھ مجھے لیکر پھر سکوگی۔ اجازت دو تو ایک سگرٹ پیوں۔

**ڈسیما**۔ یہ لو۔ تم سگرٹ بھی پینے لگے اگر نقصان نہ کرے تو شوق سے پیو۔ مگر اب مجھے خبریں تو بتا چلو۔

**بابی**۔ کیسی خبریں؟ میرے پاس تو کوئی بھی نہیں ہے۔

**بہن**۔ ابّا جان۔

**بھائی**۔ وہ حسب معمول ہیں جیسے کل تھے

ویسے ہی آج ہیں۔ ہمیشہ ایک حالت رہتی ہے۔

**بہن**۔ کیا وہ میرے منتظر ہیں۔ پیارے بالی۔ سچ بتاؤ کیا وہ مجھے دیکھکر خوش ہونگے۔

**بھائی**۔ اگر تم مجھے "پیارے" نہ کہو تو میں سب تمھیں کہہ سنا دوں۔ ضرور خوش ہونگے۔ اور میں بھی بہت مسرور ہوں۔ کاشکہ میری یہ حالت کوئی دوسری عورت دیکھتی تم کیا جانو کہ مکان کس حالت میں ہے۔ مجھے اسکول سے آئے ہوئے صرف دو ہفتہ ہوئے مگر نہایت پریشان ہوگیا ہوں۔ سرکار کو سوائے "امور خانہ داری" کے ہر علم میں اچھی خاصی دستگاہ ہے۔ گھر بالکل "نذر قرض و خدام" ہو رہا ہے۔ یہ طریقہ غلام طبیعت حضرات کے لئے آرام دہ ہوگا۔ مگر آپ کا سچا خادم اس نعمت سے محروم ہے۔

**ڈسیما**۔ والد صاحب نے نوکروں کی شکایت کی تھی۔ اور یہ شکایت بھی میری طلبی کی ایک وجہ ہے۔

**بابلی**۔ جی ہاں۔ حالات اس سے بھی بڑھ کر ہیں۔ نوکر ہفتہ وار بدلے جاتے ہیں ہمارا باورچی سبزی کی دو کانوں میں آلو کی شناخت نہیں کر سکتا۔ پیش خدمت مامائیں بھی ایسی مہربان ہیں کہ ہم خود ان کے فرض انجام دیتے ہیں اور وہ باورچی خانہ کے سامنے والے کمرہ میں اپنے مردوں سے گلچھپ فرمایا کرتی ہیں آجکل ایک صاحبہ تشریف رکھتی ہیں جو چھوٹی سی کشتی میں شیشہ اور چینی کے تمام برتن اکٹھا کر لیتی ہیں۔ چلنے میں یقیناً پھسل کر گرتی ہیں اور اپنے بیہنگم ہاتھ پاؤں کے ساتھ سارے برتن بھی چور چور کر ڈالتی ہیں۔ انکو نوٹس دیدیا گیا ہے۔ میں اس بے ایمان کی بچی کو روتا ہوا چھوڑ آیا ہوں۔ اس کی تمنا یہ ہے کہ کاش اس کی والدہ زندہ ہوتی اور وہ اُسے بھی توڑ پھوڑ کر برابر کر دیتی۔

**ڈسیما**۔ ہمارے بھائی! اور ہمارے والد؟

**بابلی**۔ آپ کی ہمدردی کا شکریہ۔ مگر والد صاحب سے کچھ امید نہ رکھئے۔ وہ ان باتوں کی پرواہ ہی نہیں کرتے"

**ڈلیسیا**۔ پرواہ نہیں کرتے!

**بابلی**۔ جی ہاں! وہ تو ہر وقت فلک الافلاک کی سیر کیا کرتے ہیں۔ اور اپنی زرخیز ایجادوں میں مصروف رہا کرتے ہیں۔ برائے نام کھاتے پیتے ہیں اور مجھے تو یقین نہیں ہے کہ سوتے بھی ہوں۔

ڈیسیما۔ میں خوش ہوں کہ انھوں نے
بُلا بھیجا۔ مگر افسوس ہے کہ گھر گرستیوں سے
بہت کم واقف ہوں۔

بابی۔ وہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ مگر کوئی
بات موجودہ حالات سے بُری نہیں ہو سکتی
مجھے افسوس ہے کہ تمھاری خالہ پالاٹن کے
گھر والی آسودہ زندگی کے مقابلہ میں تو غلامانہ
روش کی زندگی تکلیف دہ ہو جائیگی۔

ڈیسیما۔ نہیں مجھے اس کا کوئی خیال
نہ ہوگا۔ تمھارے دیدار نے میری خوشی اور بھی
بڑھا دی ہے۔

بابی۔ شکریہ اور دلی شکریہ۔ مگر آپ
براہ کرم مجھے ان آنسوؤں سے معاف رکھئے
کیونکہ بڑا رقیق قلب ہوں اور میرا دل بہت
جلد بھر آتا ہے۔ دیکھئے کہیں رو نہ پڑوں۔

ڈیسیما۔ بابی۔ تم بڑے ہی شریر اور مسخرے
ہو۔ یہ کہکر ڈیسیما آگے بڑھی اور جوشیلے انداز
سے ایک بوسہ لے لیا۔

بابی نے اپنی مٹھیاں باندھ لیں اور
فوراً دوسری مٹھی سے گال صاف کر ڈالا۔
میری خوبصورت نوجوان خاتون۔ میں
دلی رنج کے ساتھ آپ کی جوشیلی فطرت کے
فیاض جذبات کو روکنا چاہتا ہوں۔ اور یہ
بتائے دیتا ہوں کہ اس جگہ جوان خاتونیں
شریف مردوں کو کھلے بندوں پیار نہیں کرتیں
چاہے ان کا رشتہ بہن بھائیوں کا ہو۔
اگر آپ آیندہ اپنے جذبات کی پوری
روک تھام نہ کرینگی اور...... تو میں آپکا
بہت مشکور ہونگا۔

بابی۔ دیکھو کیا اچھی جگہ ہے۔ اتنے میں
گاڑی ایک بڑے دروازہ کے سامنے رُکی
اور بہن نے بھائی سے کہا

بابی۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ تم اسے
پسند کرتی ہو۔ یہی وُڈ نائیس ہے۔ یعنی جنا
پیٹر ڈین صاحب کی جائے رہایش۔ اور
میری پیاری بہن کا مکان ہے۔

ڈیسیما اُتری اور تیزی سے چلکر پُرانے
طرز کے...... کمرہ میں داخل ہوئی۔ ابھی
پہونچی ہی تھی کہ ایک تشتری کے گرنے اور
اس کے ٹوٹنے کی جھنکار کانوں میں گونج اُٹھی

بابی۔ سارا نے اپنی مالکہ کا شاندار
استقبال کیا ہے۔

ڈیسیما۔ والد صاحب کہاں ہیں۔ دوشیزہ
یہ کہہ کر نشستگاہ کے دروازہ کی طرف بڑھی

بابی۔ میں آپ کو لئے چلتا ہوں۔ مگر
زینوں کا خیال رکھئے گا۔ اس پر ہمیشہ ایک

طناب کھنچی رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے اکثر دردانگیز غلطی کے ساتھ میرے سر میں چوٹ آ چکی ہے۔

بابی نے دھکا دیکر ایک دروازہ کھولا اور پانچ سیڑھیاں اُتر کر شاہ بلوط کے ایک بھاری دروازہ کو کھٹکھٹایا اگرچہ دونوں پٹ اچھی طرح سے بند تھے مگر عُود و عنبر کی تیز اور حیرت انگیز خوشبو کی لپٹیں چلی آ رہی تھیں۔

ایک آواز نے جو بہت دور سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اندر جانے کو کہا اور بہن بھائی کمرے میں داخل ہوئے۔ فرش پر بہت سے نشان کھنچے ہوئے تھے۔ الماریوں پر کتابیں چُنی ہوئی تھیں اور اِدھر اُدھر مختلف میزوں پر عجیب و غریب برقی قوت کے آلے ڈھیر تھے۔ بنچ پر ایک آدمی بیٹھا ہوا کام کر رہا تھا۔ اس کے سفیدی مائل گھونگھروالے بال زبردست پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔ اور دس برس پہلے کی وضع کی قمیص زیب بدن تھی۔ گلے میں کالر نہ تھا اور پاؤں کی جوتیاں اصلی ناپ سے دوگنی بڑی تھیں۔

**بابی** ۔ ابّا جان ۔ ڈیسما آئی ہیں۔

مسٹر ڈین نے نظریں اُٹھائیں۔ پیشانی پر سے بال ہٹائے اور "حسن کی دیوی" کو کنکھیوں سے دیکھا۔

ڈیسما؟ ڈیسما کہاں ہے۔ کیا یہ خاتون اسے اپنے ہمراہ لائی ہیں۔

"یہی خاتون ...... بابی اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ دوشیزہ خود ہی دوڑ کر اپنے عجیب باپ سے لپٹ گئی۔ خوشی سے اس کے آنکھوں میں آنسو بھر آئے جس کی وجہ سے راستہ بھی اچھی طرح نہ سوجھتا تھا۔

"والدیں ہی ڈیسما ہوں۔ آپ مجھے نہیں پہچانتے!

**مسٹر ڈین** ۔ واللہ! تمھیں ڈیسما ہو! (جواب آمیز لب و لہجہ میں) تم بہت جلد سیانی ہو گئی ہو۔ اور ہو بہو اپنی ماں کی طرح ہو۔ گو یا تمہاری شکل میں وہی موجود ہیں۔

**ڈیسما** ۔ میں اس مشابہت سے خوش ہوں اور یہاں آنے سے بیحد مسرور ہوں۔

**مسٹر ڈین** ۔ آخر۔ خیال رکھو۔ خیال رکھو (پریشان آواز سے) تم میری پُتلہ کی طرف جھکی ہوئی ہو۔ پتلہ کی طرف میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ٹوٹ نہ جائے ...... اس نے پتلہ کو اُٹھالیا اور اطمینان آمیز لہجہ میں کہنے لگا۔ ابھی تک تو محفوظ ہے ..... اور تم ڈیسما ہو۔

مگر اس کی نگاہیں پتلہ کی طرف گڑی ہوئی تھیں جسے اُس نے ایک جائے پناہ میں لیجا کر رکھ دیا۔

# باب ۵

یہ کس نے چاندنی کی سیر میں رخ سے نقاب اُلٹی
چکوروں کی پھری جاتی ہیں نظریں ماہ کامل سے

ڈیسما۔" اپنے نام کے کمرے میں داخل ہوتے ہی بول اُٹھی،" واہ واہ کیا ہی عمدہ اور چھوٹی سی خوابگاہ ہے۔

بابی۔ شکر ہے یہ کمرہ تمھیں پسند تو آیا۔ سرکار نے جیسے ہی تمھارے طلبی کا خیال ظاہر کیا۔ میں نے اسے درست کرنا شروع کیا نیا سامان آرایش خریدا نئی قلعی کا اہتمام اور نایاب دیواری کاغذوں کے باسلیقہ چسپاں ہونے کا اہتمام کیا۔ تمھاری دوشیزگی اور معصومیت سے ربط پیدا کرنے کے لیے میں نے کاغذ بھی سفید خالص رنگ کے پسند کیے ہیں۔

ڈیسما۔ بے شک بہت خوبصورت ہے۔ بابی (اسی بات پر) میں تمھارا ایک پیار ضرور لونگی۔

بابی (لڑنے والوں کے ٹھاٹھ سے) گستاخ کنیز۔ خاموش رہ۔ اگرچہ میں بے بس نوجوان ہوں مگر آخری سانس تک اپنی حفاظت کرونگا۔ چلی جاؤ خیر یہ پہلی خطا معاف کی جاتی ہے۔ میں اپنا ارات والا فرض انجام دے رہا ہوں یعنی سرکار کو زبردستی انکی جاءپناہ سے باہر لاکر باصرار اُنکے کپڑے بدلوا دوں۔ تمھیں پورے پینتالیس منٹ کی مہلت دیجاتی ہے یہ کہکر نوجوان بھائی چلا گیا۔

ڈیسما۔ اپنے گرد آلود کپڑے تبدیل کئے اور صاف وشفاف "شام والا لباس" پہنا۔

آسودہ اور بے فکر زندگی میں اتنی تیز اور اچانک تبدیلی واقع ہوئی تھی کہ اُسے بار بار اپنی ہشیاری وبیداری پر سونے اور خواب دیکھنے کا گمان ہوتا تھا کھانے کی گھنٹی ہوئی۔ ڈیسما سیڑھیوں کو طے کرکے ایک خوبصورت نشستگاہ میں پہونچی یہ کمرہ کافی خوبصورت تھا مگر سامان آرایش فرش اور پردے اچھی طرح میلے ہو رہے تھے۔ اور یہ سب پرانی وضع کی تھیں۔ بابی ایک میز کے قریب اپنا نہایت موزوں لباس زیب بدن کئے ہوئے کھڑا ہوا تھا اور اس وقت پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔

بابی۔ آؤ کھانے کے کمرے میں چلیں۔ سرکار کا انتظار بیکار ہے۔ وہ کبھی ٹھیک وقت سے تشریف نہیں لاتے۔ اُنکے سوچتے سوچتے کھانے کا مقررہ وقت گذر جاتا ہے۔ دونوں کمرہ میں داخل ہوئے بیضاوی میز کے گرد کرسیاں رکھی ہوئی تھیں بابی اور ڈیسما بیٹھے ہی تھے کہ کسی کی پاؤں کی چاپ معلوم ہوئی۔

طالب الہ آبادی

(باقی آیندہ)

# مالی

گذشتہ سے پیوستہ

## (۲)

"اے شاعر! شام ہو رہی ہے، تیرے بال سفید ہو چلے ہیں" "کیا تو اپنے تنہائیوں کے تخیل میں دوسری دنیا کا پیغام سنتا ہے؟"



شاعر نے کہا "بیشک شام ہوگئی ہے اور میں ہمہ تن گوش ہوں کہ باوجود دیر ہو جانے کے بھی شاید مجھے کوئی گاؤں سے بلانے آئے"

"میں منتظر ہوں کہ دو مہجور دل یکجا ہوں اور دونوں کی مشتاق و بیتاب نگاہیں مہر خاموشی کے توڑنے اور ترجمانی کرنے کی مجھ سے ملتجی ہوں"

"اگر میں زندگی کے سمندر کے کنارے بیٹھکر موت اور اسکے بعد کے واقعات پر غور کرنے لگوں، تو پھر کون ان کے جذبات سے پر گیتوں کو نظم کریگا"



"شام کا ستارہ غائب ہوتا جاتا ہے"

"خاموش دریا کے کنارے کی روشنی رفتہ رفتہ کم ہوتی جاتی ہے"

"جھکے ہوئے چاند کی روشنی میں ایک ویران مکان کے صحن سے گیدڑوں کی آوازیں آتی ہیں"

"اگر کوئی سیاح اپنا گھر چھوڑ کر رات کی کیفیت کا مطالعہ کرنے کے لئے یہاں آئے اور سر جھکا کر تاریکی کی دھیمی آواز کو سننے کی کوشش کرے اور میں قیدحیات سے نکلنے کی کوشش کروں اور اپنا دروازہ بند کرکے بیٹھ رہوں تو پھر اسکو رموز زندگی سے کون آگاہ کرے گا"



اُونہہ اس کا ذکر ہی کیا کہ میرے بال سفید ہو رہے ہیں"

تیں ہمیشہ اس گاؤں کے بچوں میں بچہ اور بڑوں میں بڑا رہونگا"

"بعض کے تبسم میں سادگی و شیرینی ہے اور بعض کی آنکھوں میں ایک خاص چمک"

بعض کے آنسو دن کی روشنی میں ظاہر ہو جاتے ہیں اور بعض کے آنسو اندھیرے ہی میں پوشیدہ رہتے ہیں"

"ان سب کو میری ضرورت ہے، میرے پاس وقت ہی نہیں کہ میں زندگی کے بعد کے واقعات پر غور کروں"

میں ہر شخص کا ہمعصر ہوں اس سے کیا کہ میرے بال سفید ہو گئے ہیں"



## (۳)

صبح کے وقت میں نے دریا میں جال ڈالا۔ تاریک گہرائیوں سے میں نے ایسی چیزیں نکالیں جو نوعیت اور حسن میں لاثانی تھیں۔ بعض تبسم کی طرح درخشاں، بعض اشکوں کی طرح تاباں اور بعض نوعروس کے شرم آلود رخساروں کی طرح سرخ۔

دن بھر کی محنت کے بعد جب میں واپس آیا میری معشوقہ باغ میں بیٹھی ہوئی ایک پھول کے پنکھڑیوں کو لاپرواہی کے ساتھ نوچ رہی تھی۔

میں نے پہلے کچھ تامل کیا۔ پھر میں نے جو کچھ نکالا تھا اس کے قدموں پر رکھ دیا اور خاموش کھڑا ہو گیا

اس نے ایک غلط انداز نگاہ اس پر ڈالی اور کہا یہ کیسی چیزیں ہیں؟ یہ کس کام کی ہیں؟"

میں نے شرم سے اپنا سر جھکا لیا اور سوچنے لگا "نہ تو میں نے ان کو لڑ کر حاصل کیا ہے اور نہ تو بازار ہی سے خریدا ہے یہ تحفے اس کے لئے ناموزون ہیں"
میں نے رات بھر میں ایک ایک کر کے ان کو گلی میں پھینک دیا۔
صبح کو مسافر آئے اور ان چیزوں کو اٹھا کر دور دراز ملکوں کو لے گئے



## (۴)

افسوس، لوگوں نے میرا مکان اس سڑک کے کنارے کیوں بنایا ہے جو بازار والے گاؤں کو جاتی ہے
مال سے لدی ہوئی کشتیوں کو لوگ میرے درختوں کے پاس باندھتے ہیں۔
لوگ آتے جاتے ہیں اور جہاں ان کا جی چاہتا ہے گھومتے پھرتے ہیں۔
میں بیٹھی ہوئی ان لوگوں کو دیکھا کرتی ہوں اور میرا وقت بیکار ضائع ہوتا ہے۔
میں اُن کو بھگا نہیں سکتی اور اسی طرح میرے دن گذرتے جاتے ہیں



رات دن ان کے قدموں کی آہٹ میرے دروازہ پر معلوم ہوتی ہے۔
میرا کہنا بے سود ہے کہ میں تمکو نہیں جانتی
بعض کو میں صورت سے پہچانتی ہوں، بعض کو میرے رگوں کا خون جانتا ہے اور بعض ایسے ہیں جو میرے خواب میں جلوہ فگن ہیں۔
میں ان کو بھگا نہیں سکتی میں تو ان کو آواز دیتی ہوں اور کہتی ہوں "آؤ ہاں آؤ تم میں سے جس کا جی چاہے میرے مکان میں آؤ"



صبح کے وقت شوالے میں گھنٹہ بجتا ہے
وہ اپنے ہاتھوں میں اپنی ٹوکریاں لئے ہوئے آتے ہیں۔

ان کے ممبر سرخ ہوتے ہیں، صبح کی روشنی کی پہلی شعائیں انکے چہروں پر ہوتی ہیں۔

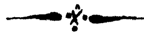
میں ان بھگا نہیں سکتی ہیں تو ان کو آواز دیتی ہوں اور کہتی ہوں ”آؤ آؤ تم میرے باغ کی گل چینی کرو“



دوپہر کے وقت محل کے دروازہ پر گھنٹہ بجتا ہے میں نہیں جانتی کہ وہ اپنا کام چھوڑ کر میرے جھونپڑے کے پاس کیوں پڑے رہتے ہیں

پھول جو ان کے بالوں میں آویزاں ہیں زرد اور مرجھائے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کی بانسری کی آواز بہت دھیمی ہوتی ہے۔

میں انکو بھگا نہیں سکتی ہیں تو ان سے کہتی ہوں کہ ”آؤ دوستو آؤ میرے درختوں کا سایہ بہت ٹھنڈا ہے“



رات کو جنگلوں میں جھینگر بولتا ہے

میرے دروازہ پر آکر آہستگی کیسا تھ کون کھٹکھٹاتا ہے۔

میں کسی کا دھندلا چہرہ دیکھتی ہوں لیکن کوئی گفتگو نہیں ہوتی۔ آسمان پر سکوت طاری ہوتا ہے۔

میں اپنے خاموش مہمانوں کو بھگا نہیں سکتی میں تاریکی میں اسکا چہرہ دیکھتی ہوں اور میرے خواب کی گھڑیاں گذر جاتی ہیں۔

عالی

باقی آئندہ



# ایک واقعہ

(گذشتہ سے پیوستہ)



مرتضیٰ۔ جانوروں کے طریقہ سے پالے جاتے ہیں تاکہ لڑائی کے وقت کام آویں۔
ماجد۔ بہادر تو کیا ہوتے ہونگے! ہاں اوگھڑ ہوتے ہیں
دفعتاً سوا پانچ بجے اور بجلی کے قمقمے روشن ہونا شروع ہو گئے۔
مرتضیٰ۔ سبحان اللہ۔ اس زمانہ کی ایجادین بھی بڑی ہی حیرت انگیز ہیں۔ ایسا خیال کرو کہ بٹن ایک جگہ کہیں پر دبایا گیا ہے اور ستارے یکے بعد دیگرے نکلتے چلے آرہے ہیں اے...... وہ پہونچی ...... اب اس قطار کو لیا...... تمام لیمپ روشن ہو گئے۔
ماجد۔ چشم زدن میں کیا سے کیا ہو گیا! تمام جگ مگ کرنے لگا۔ اور یہ گھنٹہ گھر تو معلوم ہوتا ہے کہ ہیروں سے جڑا ہے۔
مرتضیٰ۔ ہمارا تو جی چاہتا ہے کہ اسکو گھر اٹھالے جاویں۔
ماجد۔ ہم بھی مدد دینے کو تیار ہیں۔
مرتضیٰ۔ میاں کس خبط میں ہو! وہی کرسی والوں کا سا حال ہوگا پانچ بج کے بیس منٹ آئے ہیں چلو چھ بجے سے تو بی گوہرجان کا گانا شروع ہے۔
ماجد۔ چلو!
دونوں تھیٹر کے طرف بڑھے وہاں پہونچکر دیکھا کہ دروازہ کے اوپر بڑی کشمکش ہے دونوں گئے۔ جب مجمع صاف ہو گیا تب اندر داخل ہوئے دیکھا کہ سعید حسین مولوی سعید الدین خان اور شبلی سب کے سب اکٹھا ہیں
سعید حسین۔ آپ لوگ تشریف لاتے ہیں؟ یہاں جگہ نہیں ہے ذرا ادھر رخ نہ کیجیگا۔

شبلی۔ ایک جگہ ادھر خالی ہے چاہے ماجد بیٹھیں اور چاہے مرتضیٰ۔

مولوی۔ چاہے تھوڑا تھوڑا دونوں۔

سعیدالدین خان۔ یا ایک کے اوپر ایک۔

سعید حسین۔ یا ایک کے نیچے ایک!

مرتضیٰ۔ کاہے کو اسقدر افسوس ہے ہم لوگ کھڑے رہ سکتے ہیں۔ مگر سعید حسین صاحب! ذرا کان میں ایک بات سنیئے گا۔ شبلی تم مت آنا۔

شبلی۔ واہ! یہ کیسے ممکن ہے! میں ضرور سنوں گا۔

سعید حسین۔ آگے آگے اور شبلی پیچھے پیچھے آئے اور آکر کھڑے ہو گئے۔

مرتضیٰ۔ ذرا اور آگے آئیے!

وہ لوگ اور آگے بڑھے۔ مرتضےٰ حسین نے ماجد کو اشارہ کیا اور دونوں سعید حسین اور شبلی کی جگہ جا بیٹھے۔

سعید حسین۔ بہئی واہ۔ کیا بات ہے! ایسی بات آج تک نہیں سنی تھی

ماجد۔ مگر آج تو دیکھا!۔ اسی کے مذاق میں بقیہ وقت کٹ گیا۔ ۶ بجے پردہ اٹھا تو بجائے گوہر جان کے ایک شخص نہایت بھدے کپڑے پہنے اور کھوپڑی منڈوائے ایک ستار ہاتھ میں لئے سر ہلا ہلا کر خوب زور زور میں بجاتا ہوا نظر آیا! بڑا قہقہہ لگا!۔

سعید حسین۔ اے سبحان اللہ! واہ!! کیا کہنا!!!

سعیدالدین خان۔ ستار بجا رہا ہے یا بندر کھلا رہا ہے۔

شبلی۔ گوہر جان تو نہیں ہے۔

مولوی سعید گوہر جان کی گت ہے۔

شبلی۔ بھاگئے یہاں سے۔ سعید حسین بھاگو بھر تضے بھاگو! ماجد۔ مرتضیٰ۔ شبلی۔ سعید حسین سب کے سب بھاگو! بھاگو!! بھاگو۔

باقی آیندہ

ماجد بی۔اے

# نقش پائدار پر ایک نظر



جناب مولانا شاد عظیم آبادی نے نقش پائدار" کے نام سے صوبہ بہار کی ایک تاریخ لکھی ہے اسمیں اکثر مضامین وروایتیں غلط شائع کیگئی ہیں تاوقتیکہ دوسرے ایڈیشن مین مناسب تصحیح نہ کردی جائے میں تاریخی حیثیت سے اس کتاب کو مستند نہیں کہہ سکتا - اگر زمانہ نے فرصت دی اور ضرورت ہوئی توآئندہ بھی اس پر کافی روشنی ڈالونگا - فی الحال مندرجہ ذیل غلطیوں پر جناب شاد کو توجہ دلانا چاہتا ہوں -

۱- صفحہ ۲۰۰ میں شاہ ارزان دیوان قدس سرہ کی درگاہ کی تاریخ لکھتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں امرائے اسلام نے خصوص نواب شہید سیدت جنگ وعلی وردی خان مہابت جنگ نے بہت سے گاؤں اس درگاہ کے لئے وقف کئے"- میں نے جہاں تک اسکی تصدیق کی ہے یہ واقعہ بالکل غلط ہے خدا جانے شاد صاحب کو وقف کی خبر کس نے دی یا کس کتاب سے انھوں نے اس واقعہ کو اخذ کیا - کیا جناب شاد اسکے ثبوت میں کسی مستند تاریخی کتاب یا سرکاری دستاویز کا حوالہ پیش کر سکتے ہیں -؟ اسی سلسلہ میں جناب شاد نے ایک اور ایسا قصہ لکھا ہے جس کی صحت میں مجھے بہت شک ہے -

۲- آپ فرماتے ہیں " اسلامی عہد میں یہاں فقرائے مجذوب کی تقسیم کے لئے سالانہ ایک من افیوں دی جاتی تھی - سرکار انگلشیہ نے بھی یہ دستور قایم رکھا - مگر اب شاید بہت کم مقدار میں ملتی ہے " اسلامی عہد میں افیوں کا ملنا اور وہ بھی ایک من بعید از عقل نہیں ہے تو کیا ہے مجھے جہاں تک معلوم ہے گورنمنٹ انگلشیہ کے عہد سے خاص فقرائے درگاہ شریف کے لئے بیس سیر افیوں ضرور ملتی آرہی ہے لیکن اسلامی عہد میں افیونکے ملنے کا ثبوت کتب مستند میں نہیں ہے - جناب شاد کی یہ غیر معمولی اختراع قابل داد ہے -

(۳) صفحہ ۲۰۴ میں لکھا ہے کہ حضرت شاہ ارزانی صاحب کی تاریخ رحلت شاہ حبیب ارزانی ہے افسوس ہے کہ اس فقرہ سے سنہ مطلوب نہیں نکلتا" چہ خوش مصرع بھی غلط لکھیں اور صحت کی بھی امید رکھیں۔ اگر شاد صاحب ایسی غلط تاریخ نہ لکھتے تو انکی تاریخ دانی کی پردہ دری نہ ہوتی جناب شاد کو معلوم ہونا چاہئے کہ تاریخ رحلت جو مزار شریف کے کتبہ پر لکھی ہے وہ یہ ہے "گفت دل شاہ جنت ارزانی" مجھے تعجب ہے کہ جناب شاد سے ایسی ناقابل قبول غلطی کیسے ہوئی کوئی پٹنہ سے باہر رہنے والا شخص اگر تاریخ مرتب کرتا تو اس سے ایسی غلطیوں کا احتمال ہو سکتا تھا۔ جناب شاد جو خود پٹنہ میں رہتے ہیں ان سے ایسی خاص غلطی کا ہونا بہت ہی قابل افسوس ہے۔ اگر جناب شاد اپنے دولت کدہ سے باہر نکلکر مزار شریف تک جانا کسر شان سمجھتے تھے تو موجودہ سجادہ نشین ہی سے دریافت کر لیتے۔ جب شہر پٹنہ کے حالات میں (جہاں جناب شاد خود سکونت پذیر ہیں) ایسی فاش غلطیاں ہیں تو صوبہ بہار کے اور شہروں کی تاریخ کا کیا اعتبار کیا جا سکتا ہے

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا۔ مجھے امید ہے کہ جناب شاد جلد از جلد اسکی تصحیح کسی معزز اخبار یا رسالہ میں شائع فرمائیں گے اور "نقش پائدار" کے دوسرے ایڈیشن میں اسکا اعلان کرینگے

## حسن تخیل

سلیم اللہ۔ بی۔ اے

مجموعہ عناصر کا ہر سمت پریشان ہے
یہ نقش تغیر ہے یا عالم امکان ہے

وہ قصہ ایمن کیا، اک شوخی عنوان ہے
یہ برق تجلی کیا، حسن رخ جانان ہے

ہر صفحہ رنگین پر ہر قطرۂ شبنم میں
وہ شوخ حیا پرور اک جلوۂ عریان ہے

جذب دل عاشق کی اللہ رے نیرنگی
اب حسن ادب آراء، خود دست و گریبان ہے

اے تیر نظر باہم کچھ چھیڑ چلی جائے
ہر زخم میرے دل کا اب تشنۂ پیکان ہے

بالوں کو نہ بیلوں بکھر، نظروں کو اٹھا، ادیب
یہ حسن ادا ظالم غارتگر ایمان ہے

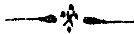
اشکوں سے مرے نسبت معنی کو نہیں حافظ
یہ دل کے جو ہیں ٹکڑے وہ قطرۂ نیسان ہے

حافظ غازیپوری

# دربار اکبری



عرصہ تک "طوفان" کی ادارت کرنے کے بعد جب ۱۹۲۱ء میں مجھے اس سے نجات ملی تھی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا تھا۔ چپ چاپ ایک گوشہ میں پڑا تھا نہ تو کوئی علمی رسالہ یاد کرتا تھا اور نہ میں ہی اُس کی کوئی خدمت کرتا تھا۔ دنیائے ادب سے کنارہ کش ہو کر بڑے اطمینان سے زندگی بسر کر رہا تھا غرضکہ سودائے خام کو پختہ جنون ہوئے عرصہ ہو چکا تھا دل کی خلش رفتہ رفتہ ٹیس سے بدل گئی تھی کہ یکایک لسان العصر حضرت اکبر مرحوم کی یادگار میں "اکبر" نکلا۔ اس نام میں وہ کشش تھی کہ میں تو کیا ہندوستان کے بڑے بڑے ادیبوں نے اکبر کیلئے اپنی خدمات پیش کیں مجھ سے بھی جو کچھ خدمت ہو سکی کرتا رہا یہانتک تو غنیمت تھا لیکن اب ستم یہ ہوا کہ مجھے "اکبر" کی ادارت کے لئے بھی مجبور کیا گیا۔ میں نے اپنی شوریدہ سری۔ وحشت مزاجی۔ عدیم الفرصتی اور سب سے زیادہ اپنی کم مائگی کا عذر پیش کیا۔ لیکن کون سنتا ہے "فغانِ درویش" آخر کار احباب کی پریشان کن تقریروں خصوصاً بھیا طالب و میرے عزیز بھائی شرقی صاحب کی ناقابل رد و پرخلوص اصرار نے "قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند" کا کام کر دیا۔



اکبر کا گذشتہ نمبر ذرا تاخیر سے شائع ہوا تھا لیکن موجودہ نمبر وقت پر شائع ہو رہا ہے جس کے لئے میں سید محمود الحسن صاحب بی۔ اے (علیگ) مالک اسٹار پرنٹنگ ورکس کا ممنون ہوں اگر ان کی روز افزوں عنایات کا یوں ہی سلسلہ جاری رہا تو "اکبر" کی کتابت بھی دیدہ زیب ہو جائیگی



اس مرتبہ میرے قوت بازو جناب خانصاحب محمود علی خان عرف آغا علی خان صاحب اسپشل مجسٹریٹ الہ آباد کی تصویر اکبر کو مزین کر رہی ہے۔ خانصاحب کی شخصیت ادبی دنیا میں محتاج تعارف

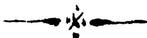
نہیں ہے اور چونکہ اس نمبر میں حضرت نوح ناروی مدظلہ نے خالصاحب پر ایک نہایت ہی عالمانہ مضمون لکھکر اپنے قابل قدر خیالات کا اظہار فرمادیا ہے میں زیادہ لکھنا غیر مناسب سمجھتا ہوں۔



"اکبر" میں مختلف زبانوں کے ترجموں کا سلسلہ اسی نمبر سے شروع کیا جاتا ہے "گوہر عصمت" و "مالی" اس سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں۔ مستقبل کے لئے ابھی کچھ نہیں کہ سکتا میں وعدہ وعید کرنے میں ہمیشہ سے محتاط رہا ہوں اور یہی احتیاط اس وقت بھی مانع ہے مگر اتنا ضرور کہونگا کہ اکبر کے خریدار ختم سال تک کئی مستقل اور مکمل کتابوں کے مالک ہوجا ئینگے۔



"گوہر عصمت" انگریزی کے ایک مشہور ناول "بذ ہارٹس ڈیزائر" کا ترجمہ ہے جناب طالب ادبی دنیا میں قبولیت عام کا تمغہ حاصل کرچکے ہیں اور انکی شہرت مزید تعریف سے بے نیاز ہے پھر بھی میں اتنا کہونگا کہ طالب صاحب نے ترجمہ میں جس سچائی اور صفائی سے کام لیا ہے قابل داد ہے مجھے افسوس ہے کہ "باقی دارد" کے الجھن میں ناظرین کو رہنا پڑے گا لیکن اس کا خاص اہتمام کیا گیا ہے کہ اس ناول کے کم سے کم ۱۶ صفحے ہر نمبر میں شائع کئے جا ئینگے جس سے اس کی دلچسپی میں کوئی فرق نہ آنے پائیگا۔



ٹیگور کے گارڈنر کا ترجمہ اُردو کے اکثر رسائل میں شائع ہوچکا ہے لیکن جو صفائی سلاست و روانی میں نے عزیزی اولاد اللہ عاکی کے ترجمہ "مالی" میں پائی ہے وہ کہیں نظر سے نہیں گذری۔ میں اس خاموش ہستی کے اس کامیابی پر نازاں ہوں۔



عزیزی مولوی اسرار احمد و چودھری سید افضال احمد کے عالمانہ و محققانہ مضامین پر اکبر فخر کرتا ہے۔ مجھے ان دونوں ہونہار نوجوانوں کی روزافزوں علمی ترقی پر دلی مسرت ہے۔



اگر آپ اُردو کو ملک کی متحدہ زبان بنانا چاہتے ہیں تو للٰلہ اپنے ان حیاتیات اور نوازشات

سے غریب اُردو کو معاف رکھئے نظم میں حقیقی جذبات۔ متانت بندش اور زبان کا خیال رکھئے لغو بے ضرورت لچر پوچ تک بندیوں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ رائج الوقت بحور اور قوافی کے پابند رہئے اسوقت تک جب تک زمانہ کوئی نیا آہنگ نہ اختیار کرے نثر میں چھوٹے چھوٹے فقرے۔ ستھری ترکیبیں عام فہم اور سب سے زیادہ حقیقی جذبات اور الفاظ پر قدرت پیدا کر کے عبارت کو زور آور کیجئے زندہ زبانوں کے جامع الفاظ۔ سہل ترکیبیں مفید اور قابل قبول اصطلاحین اپنی زبان میں شامل کیجئے ترجموں کے لئے اگر ہم معنی الفاظ نہ ملیں تو کچھ پرواہ نہیں وہی الفاظ جو اس ضرورت کو پورا کریں بے تکلف استعمال فرمائے لیکن اسطرح سے کہ جو الفاظ آپ استعمال کریں ان کی تذکیر و تانیث کانوں کو بری نہ معلوم ہو اسطرح سے اُردو مالا مال ہو جائیگی اور جو کچھ ہم بولتے ہیں وہی نظم بھی کرینگے اور جو خیالات ہمارے دل و دماغ میں موجزن ہوتے ہیں ان ہی کی لہریں کاغذ پر بھی نظر آئینگی۔



آج کل بعض شہرت کے شیدائی نام نہاد نقاد جب کسی کو پھولتے پھلتے دیکھتے ہیں تو خواہ مخواہ کی الٹی سیدھی تنقید دں سے اس کے استقبال کی مساعی میں منہمک ہوجاتے ہیں ایسی ہی بیکار تنقیدوں کا نتیجہ ہے کہ اہل قلم میں ہٹ دھرمی کا مرض پیدا ہوتا جاتا ہے ذاتیات پر بحث شروع کر دی جاتی ہے چنانچہ اسکا ثبوت ملک کے بعض رسائل کے "شذرات" "وجرعات" میں آپ ملاحظہ کرسکتے ہیں جو ذاتیات کے اکھاڑے بنے ہوئے ہیں تہذیب مانع ہے ورنہ چند نمونے پیش کرتا۔
اگر آپ کسی مطلق العنان ادیب کے قلم کو جادہ اعتدال سے ہٹتے ہوئے دیکھیں تو ہمدردانہ لہجہ میں تنقید کریں ذاتیات کی بحث میں پڑنا عقلمندوں کا کام نہیں ہے۔



اب میں ملک کے بعض مطبوعات جدیدہ و رسائل پر ایک سرسری نظر ڈالتا ہوں۔ "اکبر" ہر دلعزیز ہے وہ ہندوستان کی تمام اہل قلم کو اعلےٰ قدر و مراتب اپنا مربی و محسن سمجھتا ہے نہ اسے کسی سے ایسی خصوصیت کہ وہ اسکی پاسداری میں سب کو اپنے دل سے بھلادے نہ ایسی خصوصیت ہے کہ بلاوجہ کسی کو رنج پہنچائے چنانچہ میں نے یہاں پر جن مطبوعات جدیدہ و رسائل پر اپنے ناچیز مگر پر خلوص خیالات پیش کئے ہیں وہ ناگواری کا کوئی پہلو نہیں رکھتے ہیں جن رسائل اور کتب پر اس نمبر میں تنقید

نہیں کرسکا آئندہ نمبر میں انجام دینے کی کوشش کرونگا۔



خدا کا شکر ہے کہ کچھ عرصہ سے ہمارے تعلیم یافتہ انگریزی دان ادیب مغرب کی گلکاریاں مشرقی انداز میں پیش کر رہے ہیں ترجموں کا شغل بڑھتا جاتا ہے۔ میرے سامنے اسوقت تین انگریزی کتابوں کے ترجمے ہیں "ماہ نو" "تاریخ زوال روما" اور "سالومی"

**ماہ نو** | ڈاکٹر رویندر ناتھ ٹیگور کے "کرسنٹ مون" کا اُردو ترجمہ ہے جسے ملک کے مشہور واقعہ نگار حضرت افسر میرٹھی نے صاف اور شستہ زبان میں پیش کیا ہے اُردو اب تک ٹیگور کے خیالات سے ناواقف ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ کسی نے اسکے خیالات کی صحیح ترجمانی نہیں کی جن کو ذرا بھی انگریزی سے واقفیت تھی انھوں نے غیر مانوس لفظوں میں ٹیگور کا پیام پہونچانا شروع کردیا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ ٹیگور کے کلام کو محض بے معنی اور الجھے ہوئے خیالات کا مجموعہ سمجھنے لگے لیکن اسکے برخلاف حضرت افسر نے جو اُردو انگریزی کے مشہور ادیب ہیں ٹیگور کے خیالات کی صحیح ترجمانی کی ہے جس سے ٹیگور کی انشاپردازی کی خوبیاں نمایاں ہوگئی ہیں "ماہ نو" کی زبان بہت صاف شستہ اور بامحاورہ ہے کتابت، طباعت دیدہ زیب ضخامت ۹۵ صفحات۔ قیمت ۱۲ر ملنے کا پتہ منیجر انڈین بک ڈپو اندرکوٹ شہر میرٹھ۔

**تاریخ زوال روما جلد اوّل** | جناب سید مطلب حسین صاحب بی۔ اے نے گبن کی تاریخ "ہسٹری آف دی ڈکلائن اینڈ فال آف دی رومن امپائر" کا ترجمہ اس نام سے کیا ہے جسکو دائرہ ادبیہ لکھنؤ نے شائع کرکے ایک بڑی کمی کو پورا کردیا۔ اب تک اس مقبول و ضخیم کتاب کا ترجمہ اُردو میں کسی نے نہیں کیا تھا۔ جناب مطلب حسین صاحب قابل صد آفریں ہیں جنکی کاوش اور محنت سے اردو دان پبلک کو اس تاریخ کے پڑھنے کا موقعہ ملا۔ ترجمہ ہر لحاظ سے اچھا ہے جس سے امید کیجاتی ہے کہ بہت جلد مقبول عام ہو جائے گا ضخامت ۱۰۷ صفحات، کتابت و طباعت قابل ستائش۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ دائرہ ادبیہ لکھنؤ۔

**سالومی** | اسکر وائلڈ کے مشہور سالومی کا بامحاورہ اور سلیس ترجمہ ہے۔ اس کے مترجم جناب مجنوں گورکھپوری ہیں کتابت و طباعت عمدہ قیمت ۱۲ر ملنے کا پتہ اسٹار الکٹرک پرنٹنگ ورکس الہ آباد۔

**دلکش** | ایک ادبی ماہواری رسالہ ہے جو زیر ادارت جناب یزدانی لاہور سے شائع ہوتا ہے مضامین زیادہ تر عام مذاق کے ہوتے ہیں مختصر فسانوں کے علاوہ مسلسل ناول بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ حصہ نظم خاص طور سے دلچسپ ہے۔ فاضل مدیر کو مضامین نثر کیطرف سبت توجہ کرنی چاہئے تاکہ رسالہ مقامی معاصرین سے کسی حیثیت میں کم نہ رہے حجم ۸۰ صفحات سائز ۲۰×۲۶/۸ کاغذ خاصہ چندہ سالانہ ہے۔

**قوس قزح** | یہ رسالہ بھی لاہور سے جناب محمد وحید گیلانی کی ادارت میں پابندی وقت کیساتھ ہر انگریزی مہینہ کے نصف اول میں شائع ہوتا ہے میرے پیش نظر "بہار نمبر" ہے

تصاویر کے اعتبار سے "قوس قزح" ہندوستانی صحافت میں ایک نئی چیز ہے مریم زمانی کی تصویر تو بے نیاز تحسین ہے۔ مضامین بھی اچھے ہیں "فن تحریر" تحقیقی مضمون ہے اور خوب ہے "مریم زمانی" پر جناب سالک کا مضمون بھی تاریخی حیثیت سے قابل قدر ہے نظمیں اکثر نئے طرز کی ہیں جن کے انتخاب میں اگر میرے دوست گیلانی صاحب زیادہ احتیاط سے کام لیں تو بہتر ہے۔

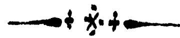
کاش "قوس قزح" سادہ اور صاف زبان میں شائع ہوتا تو اسکی قدر اور بھی بڑھ جاتی لیکن "بہار نمبر" کے بعد کے نمبروں میں عزیز مدیر نے حتی الامکان اس طرف بھی خاص توجہ کی ہے اور "قوس قزح" میں اب بہت کم غیر مانوس ترکیبیں والفاظ متعلقہ دکھائی دیتے ہیں بہار نمبر کی ضخامت ۹۶ صفحات ہے لکھائی چھپائی پاکیزہ ہے چندہ سالانہ ہے، نمونہ کا پرچہ ۵/ ۔ ملنے کا پتہ منیجر قوس قزح مسی گیٹ لاہور

**تجلی** | مذہبی۔ علمی ومعاشرتی رسالہ ہے جو سید ظہور احمد صاحب وحشی کے زیر ادارت دہلی سے شائع ہوتا ہے جناب وحشی اس سے بیشتر دین و دنیا کے مدیر رہ چکے ہیں اس لئے وہ دنیائے صحافت میں کافی مشہور ہیں تجلی ہر لحاظ سے ایک مفید رسالہ ہے قریب قریب کل مضامین جناب وحشی ہی کے قلم سے ہوتے ہیں ضخامت ۴۲ صفحات سائز ۲۰×۳۰/۸ کتابت عمدہ کاغذ معمولی قیمت سالانہ عہ ملنے کا پتہ منیجر تجلی فراشخانہ دہلی۔

**انقلاب** | سیاسی وادبی رسالہ ہے جو لاہور سے جناب فتح چند نسیم کی ادارت میں ماہواری شائع ہوتا ہے رسالہ اپنے مقصد کے لحاظ سے قابل قدر ہے ہر نمبر میں ایک آدھ تصویر بھی ہوتی ہے حجم ۴۶ صفحات سائز ۲۰×۲۶/۸ قیمت سالانہ ہے۔

**نظارہ** | جناب ثاقب کی ادارت میں شائع ہوتا ہے مضامین وقتی ضرورت کی وجہ سے اکثر ادبی ہوتے

ہیں نظمیں اور غزلیں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں قیمت سالانہ عا۔ ملنے کا پتہ خانقاہ شریف کانپور

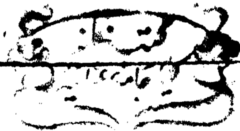


گذشتہ نمبر میں خان بہادر کی سرخی سے میرا ایک فسانہ اکبر میں شائع ہوا تھا اس کا پلاٹ اور اوس کے تمام خاص مواقع ہندی کے فسانہ "رائے بہادر" سے ماخوذ ہیں مگر بقول اکبر ؎

غلط فہمی بہت ہے عالم الفاظ میں اکبر بڑی دشواریوں کے ساتھ اکثر کام چلتا ہے

کچھ لوگ اسکو خواہ مخواہ مخصوص معزز ہستیوں کی طرف منسوب کر رہے ہیں حالانکہ مؤلف کے دماغ میں اس فسانہ کو لکھتے وقت کسی خاص فرد کا کوئی خیال بھی نہ تھا۔ میں صاف لفظوں میں بتانا چاہتا ہوں کہ خان بہادر میرے دماغ کی تخلیق اور دنیائے فسانہ کی ہستی ہے اس کا وجود کبھی مادی دنیا میں تھا نہ ہوگا۔ مجھکو خود ذاتیات سے سخت نفرت ہے میری عمر کا ایک خاص حصہ فسانہ نگاری میں بسر ہوا ہے لیکن میری تحریر آج تک ذاتیات سے ملوث نہیں ہوئی جن احباب کو مزید اطمینان مطلوب ہو وہ رونیدر ونا تھ ٹیگور کا انگریزی فسانہ "رائے بہادر" ہندی کا فسانہ رائے بہادر اور رسالہ شباب اردو لاہور کے مندرجہ ذیل مضامین ملاحظہ فرمائیں۔ (۱) احیا قرض چکا یا (۲) اپریل ۲۲ء (۳) میلہ کا تماشا نومبر و دسمبر ۲۱ء (۴) جھی شکار اگست ۲۲ء خون کے پیاسے جو نومبر ۲۱ء سے ۲۲ء تک مسلسل شائع ہوتا رہا

مدیر



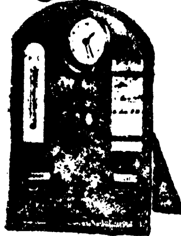
## مت کہو

کہ ککروں کا کوئی مجرب علاج نہیں یہ مانا کہ آپ کا برج کاسٹک اور اپریشن کرا کر تنگ آچکے ہیں جہاں آپ نے اسقدر تکلیف اٹھائی ہے صرف ایک بار راحی سرمہ متصدقہ ڈاکٹر جے سی بوس لابیریری کلکتہ کا استعمال کریں ککروں سے ہمیشہ کے لئے نجات مل جاویگی لگانے میں نہ تکلیف اور نہ درد ہوگا تب مان جائینگے کہ دیسی ادویات کا عنصر برباد نہیں ہوا۔ اب ڈاکٹر لوگ بیمار و نکو اسی کے استعمال کا مشورہ دیتے ہیں۔ قیمت فی ڈبیہ ایک روپیہ ۱۲ آنہ

منیجر راحی سرمہ فارمیسی۔ رام بازار۔ ڈیرہ اسمعیل خان



# کلنڈر ٹیبل واچ



گارنٹی دو سال قیمت صرف
یہ گھڑی کیا ہے عمرو عیار کی زنبیل ہے -
مہینہ معلوم ہوتا رہے گا - حرارت
وقت بہت سچا دیتی ہے - پنسل اور پیڈ
یا جس میز پر رکھ دیجائے

ے؍ علاوہ محصول ڈاک
اس میں قیامت کے دن تک تاریخ - وقت اور
دھوپ اور رات کی گرمی سردی کا پتہ چلتا ہے -
یادداشت لکھنے کے لئے موجود - جس کمرے میں
اُس کی زینت بن جائے -

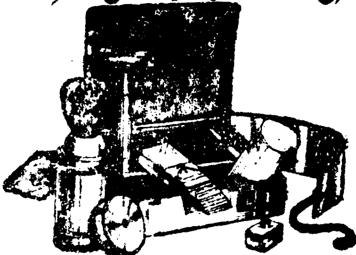
# "VALET"
## Auto Strop
## Safety Razor

## سنہری ویلٹ کا بے مثل سیفٹی استرہ



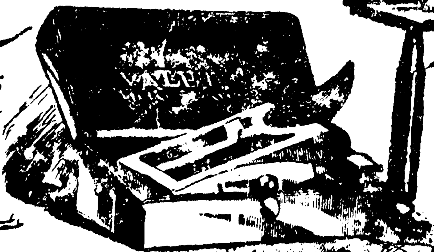
جگمگاتا ہوا استرہ بات کی بات میں اپنا کام کر گزرتا ہے دیکھنے میں بہت حسین اور کام دینے میں اپنا جواب نہیں رکھتا - ۳ عدد پھل ساتھ ملتا ہے جو ۶ مہینہ تک کام دیتے رہتے ہیں - پھر قیمت کو پوچھئے تو صرف ے؍ جو خوبیوں کے لحاظ سے بالکل کم ہے -

## نقرئی ویلٹ کا لاجواب سیفٹی استرہ



دس برس تک کام لیجئے اور پھر جس جوہری کے یہاں بنا ہے اپنے دام کھرے کر لیجئے اس کے ساتھ ۱۲ عدد پھل ہیں - بکس جرمن سلور کا ہے اور اتنا چمکدار کہ آنکھ نہیں ٹھہرتی - اسکے استعمال سے چہرہ گلاب کے پھول کی طرح تر و تازہ رہتا ہے - پھوڑے پھنسیاں - داغ - دھبے سب مٹ جاتے ہیں - ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر آپ اسکو نقلی استرہ ثابت کر دینگے تو ہم پوری قیمت واپس دیدینگے - قیمت صرف ۱۶؍ معہ جملہ خرچ محصول وغیرہ -

## روپہلی ویلٹ کا بے نظیر سیفٹی استرہ



نہایت ہلکا - بہت پائدار - خالص لوہا - غائب ہو جاتے ہیں جیسے کبھی جلد پر تھے ہی ویلٹ کا اصلی سیفٹی ریزر ہے اسکے ساتھ ہیں اور ایک ایک پھل دو دو مہینہ کام اسپرنگ دار اور نکل کا ہے قیمت صرف

ذرا سا ہلکا ہوا ہے اور بال اس طرح نہیں - یہ استرہ دنیا کی مشہور کمپنی جانچ کئے ہوئے بارہ پھل رہتے دیتا ہے - اس کا خانہ روپہلا اور ے؍ علاوہ محصول ڈاک -

## امپائر ٹریڈنگ کمپنی نمبر ۳ جانسین گنج الہ آباد

# "آئین اکبری"

(۱) "اکبر" ہر ماہ کے اخیر ہفتہ میں شائع ہوگا

(۲) "اکبر" کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ حضرت لسان العصر اکبر مرحوم کے غیر مطبوعہ کلام و خطوط شائع کئے جائیں

(۳) "اکبر" میں تمام ایسے عالمانہ و محققانہ مضامین شائع ہونگے جن میں ادبی رنگ غالب ہو

(۴) "اکبر" للعہ بارہ مہینے اور عہ میں چھ ماہ کے لئے جاری کیا جائیگا نمونہ کے لئے ۲ کا ٹکٹ آنا ضروری ہے

(۵) جو اصحاب ایک سال کے لئے پانچ خریدار دینگے اُن کی خدمت میں صہ پانچ روپیہ نقد یا ایک سال کے لئے رسالہ "اکبر" مفت حاضر ہوگا

(۶) مضامین کے متعلق جملہ خط و کتابت جناب مدیر کے نام اور دیگر امور و ترسیل زر منتظم کے نام ہونی چاہئے

(۷) جواب طلب امور کے لئے ایک آنے کا ٹکٹ ارسال فرمائیے۔ جو مضامین شائع نہ کئے جائیں گے اگر ٹکٹ آنے پر واپس کئے جا سکتے ہیں۔

## نرخ نامہ اشتہارات

| تعداد طبع | ایک صفحہ |
|---|---|
| ۱۲ | سے |
| ۹ | سہ |
| ۶ | عہ |
| ۳ | عہ |
| ۱ | للعہ |

منتظم "اکبر" الہ آباد

مطبوعہ دی اسٹار الکٹرک پرنٹنگ ورکس نمبر ۲۴ شیو چرن لعل روڈ الہ آباد

پرنٹر سید محمود الحسن بی۔اے (علیگ)

پبلشر حبیب الرحمٰن صاحب فاضل ادب

رجسٹرڈ نمبر اے-۱۵۶۶

انجمن رہنمائے ادب الہ آباد کا ماہوار رسالہ



# اکبر

بیادگار لسان العصر حضرت اکبر مرحوم الہ آبادی

# چند عجیب و غریب اشیاء

## جیبی سگریٹ مشین

ایک گھنٹہ میں ۲۰۰ سگریٹ تیار کرتی ہے ترکیب نہایت سہل ہے تمام کی تمام گلٹ کی ہوئی ہے نہایت ہی مختصر اور چھوٹی سی مشین ہے سفر کے لئے نہایت ہی مفید چیز ہے کیونکہ یہ کوٹ کی جیب میں بھی رکھی جا سکتی ہے قیمت فی مشین صرف چار روپیہ ڈاک خرچ علاوہ۔

## آگ جلانے کی مشین

اس مشین سے کئی کام لئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً بلا مدد دیا سلائی آگ جلانا سگریٹ جلانا وغیرہ وغیرہ قیمت فی مشین صرف ایک روپیہ آٹھ آنہ علاوہ خرچ ڈاک۔

## جیبی چھاپا خانہ یا مہر گھر

یہ انگریزی کا جیبی چھاپا خانہ قابل تعریف ہے اس سے لفافہ ملاقاتی کارڈ اور ہنر میں جو دل چاہے چھاپ سکتے ہیں قابل خریدہے قیمت فی چھاپہ خانہ صرف دو روپیہ علاوہ خرچ ڈاک۔

## ہینڈ کیمرہ

یہ کیمرہ خاص طور پر جرمنی سے تیار کروایا گیا ہے عورت مرد جانور درخت مکان گرجا مسجد مندر اور ریل وغیرہ چلتے پھرتے اور بیٹھتے ہوئے کی خوبصورت اور دلپسند فوٹو اتارنے کے لئے کم از کم ایک بار ضرور منگائیں قیمت چھوٹا سائز پانچ روپیہ بڑا سائز دس روپیہ علاوہ خرچ ڈاک۔

## کشیدہ کاڑھنے کی مشین

لڑکیاں اس سے کرسیوں کی گدیاں سرہانوں کے غلاف غالیچے شال چادریں ڈوپٹے سوٹ وغیرہ وغیرہ غرضکہ ہر قسم کے گرم سرد اور ریشمی کپڑوں پر اون سوت اور ریشم سے ہر قسم کے پھول اور گلکاریاں بنا سکتی ہیں ترکیب نہایت آسان ہے غریب لڑکیوں کے لئے روزگار اور امیروں کے لئے ایک اعلیٰ تحفہ ہے قیمت فی مشین صرف چار روپیہ علاوہ خرچ ڈاک

**منیجر ریکماس اینڈ کمپنی پوسٹ بکس ۹۹ لاہور**

# چیف ایڈیٹر

(خاں صاحب) جناب آغا علیخاں صاحب عرف محمود علیخاں صاحب - اسپشل مجسٹریٹ الہ آباد

مدیر - جناب ڈاکٹر اعظم صاحب کریوی نائب مدیر - جناب طالب علی صاحب طالب الہ آبادی

| جلد ۲ | رسالہ اکبر بابتہ ماہ جون ۱۹۲۶ء | نمبر ۶ |
|---|---|---|



| نمبر شمار | مضمون | مضمون نگار | صفحہ |
|---|---|---|---|
| ۱ | جذبات محمود | چیف ایڈیٹر | ۲ |
| ۲ | دو آتشہ (نظم) | حکیم مظفر حسین صاحب دہلوی | ۲ |
| ۳ | کلام اکبر | لسان العصر حضرت اکبر مرحوم | ۳ |
| ۴ | مکتوب اکبر | بنام تدبیرالدولہ نواب میکسویل۔ آئی سی ایس - [illegible] | ۴ |
| ۵ | غزل | اثر صاحب لکھنوی بی اے - ڈپٹی کلکٹر | ۵ |
| ۶ | شانتی | مدیر | ۶ |
| ۷ | غزل | ریاض احمد صاحب ریاض الہ آبادی | ۱۲ |
| ۸ | غزل | حضرت نوح ناروی | ۱۳ |
| ۹ | غزل | محمد زبیر صاحب روحی حلیم مسلم ہائی اسکول کانپور | // |
| ۱۰ | تفریح | نائب مدیر | ۱۴ |
| ۱۱ | شب ہجر | // | ۱۸ |
| ۱۲ | زمزمۂ عندلیب | جلیل حسین صاحب نوگانوی نائب مدیر رہنمائے تعلیم | ۱۹ |
| ۱۳ | انشا کی شاعری | اسرار احمد صاحب فاضل ادب و دینیات | ۲۰ |
| ۱۴ | غزل | حافظ صاحب غازی پوری | ۳۱ |
| ۱۵ | ہر کس بخیال خویش خبطے دارد | پروفیسر زبید احمد صاحب ایم - اے الہ آباد یونیورسٹی | ۳۲ |
| ۱۶ | مالی | اولاد احمد صاحب عالی | ۳۹ |
| ۱۷ | گوہر عصمت | نائب مدیر | ۴۱ |
| ۱۸ | دربار اکبری | مدیر | ۵۷ |
| ۱۹ | بزم احباب | سلیم اللہ صاحب بی - اے | ۶۱ |

# جذبات محمود

بدلتا جاتا ہے رنگ محفل اُٹھیگی رخ سے نقاب کب تک
ارے زبان سے تو کہدے ظالم رہیگا آخر حجاب کب تک

نوائے الفت بھی سن لے اے دل کہ تجھکو جانا ہے بزم غم میں
سنے گا کب تک یہ ساز عشرت رہیگا محو رباب کب تک

ہوا نتیجہ یہ عشق کا اب کہ دور مجھسے سکون دل ہے
بتا دے مجھسے یہ ذوق الفت رہیگا دل پر عذاب کب تک

چھلک رہا ہے وہ بادۂ دل نگہ میں بجلی تڑپ رہی ہے
گرینگی آخر یہ بزم دل میں نظر کی برق سحاب کب تک

سمجھ لے محمود دل میں اپنے کہ بحر عالم وہ موجزن ہے
ابھر کے تیرا یہ داغ ہستی رہیگا مثل حباب کب تک

چیف ایڈیٹر

# دو آتشہ

(تضمین بر نظم حضرت اکبر الہ آبادی)

جو ہوں مانوس رخسار حسین سے
انھیں کیا کام قرآن مبیں سے

تعلق کیا ہو ایمان و یقین سے
نہیں سائنس واقف کار دین سے

خدا باہر ہے حد دوربین سے

بت مغرب نے دکھلائی یہ جدت
کہ پرّاں ہوگیا۔ رنگ قدامت!

فسانہ ہوگئی۔ مشرق کی عظمت
مشینوں نے کیا نیکو رخصت!

"کبوتر اڑ گئے۔ انجن کی بین سے!"

گزٹ سرکار کا۔ کونسل کا بل دیکھ
نہ قرآن میں نکات اہل دل دیکھ

مس لندن کے رخسار کے تل دیکھ
نشاط حلقۂ میونسپل دیکھ

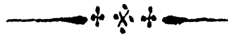
تجھے کب کام ہے جاپان و چین سے

(حکیم مظفر حسین اظہر دہلوی)

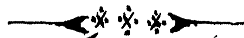
# کلام اکبر



سر پر ہیں مجیدیٔ و رؤفی محفوظ نہ مولوی نہ صوفی



چھکڑے ہوں کہ گاڑیاں کہ موٹر جس پر دیکھو لدے ہیں اوٹر



حضرت والد کی عزت یوں تو کرتا ہوں ضرور دل کی لذت بڑھتی ہے لیکن سسر کو دیکھکر



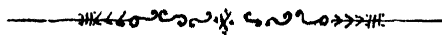
بتان کافر حصول سیمیں فضول تعجیل کر رہے ہیں سنا ہے ہم نے کہ نوح صاحب وصول تحصیل کر رہے ہیں



ساتھ ہمجنس کے مل جانیکا معمول اچھا جو فضا میں نہ شگفتہ ہو وہی پھول اچھا



مجھکو شب ہجراں میں قضا نے بھی نہ پوچھا اس بت نے نہ پوچھا تو خدا نے بھی نہ پوچھا



# مکتوب ۴ اکبر

۱۹ر اگست ۱۹۲۰ء

محب اکبر سلمہ اللہ تعالےٰ

قرآن مجید میں خدا کی تعریف ہے۔ رب العالمین۔ رب کے معنی ہیں بتدریج اوج کمال یا مسافت یا ہستی پر پہونچانے والا۔ خدا رب المین ہے۔ اب یہ بحث کہ کس طور پر چیزوں کو پیدا کیا ہے پورا علم اسکا کس کو ہو سکتا ہے عقلی تفسیر کیا کرتی ہے۔ ڈارون بھی ایک مفسر رب المین کے ہیں۔ صحیح تفسیر کی یا غلط یا کچھ صحیح یا کچھ غلط اور کیا صحیح کیا غلط۔ اس پر رائیں مختلف ہیں۔ ارتقا کا مسئلہ مسلّم نہیں ہے۔ صرف تھوری یا قیاس ہے۔ ڈراون اگر اللہ کا نام بھی لیتا جاتا تو ہم کو زیادہ اعتراض نہ ہوتا۔ انسان کو اللہ نے ابتدا ہی سے انسان بنایا۔ گو اسکو مدارج ہستی طے کرنے پڑے ہوں۔ اسی طرح اور مخلوقات کو ایک قطعہ میں جو ہنوز نہیں چھپا یعنی کلیات میں داخل نہیں ہوا۔ اسی مضمون کو میں نے بوضاحت لکھا ہے۔ بس یہی مطلب شعر کا ہے کہ ارتقا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یورپ کے لئے کچھ قابل فخر و ناز نہیں ہے بلکہ آیت الحمد للہ رب العالمین کی تفسیر کی کوشش کیگئی ہے

عزیز من میں نے دیوان لکھا ہے۔ کوئی کتاب سائنس یا فلسفہ پر نہیں لکھی۔ شاعر کے خیالات اور طریق بیان۔ دلی جذبات سے متعلق ہوتے ہیں۔ میرا دیوان ذمہ دار بیان حقایق اشیا کا سائنٹفک طور پر نہیں ہے بلکہ قافیوں کے ساتھ ہے۔ ماشا اللہ آپ کا مذاق عالمانہ ہے معلوم نہیں آپ نے میری یہ نظم سنی ہے یا نہیں۔ انگلستان میں خواجہ کمال الدین نے کئی سال ہوئے اسلامک ریویو میں اسکا ترجمہ شائع کیا تھا۔

| | |
|---|---|
| مشرقی کو ہے ذوق روحانی | مغربی میں ہے میل جسمانی |
| کہا منصور نے خدا ہوں میں | ڈاروِن بولے بوزنہ ہوں میں |
| ہنسکے کہنے لگے مرے اک دوست | فکر ہر کس بقدر ہمت اوست |

جو آیات قرآنی پیش نظر ہیں اگر آپ سامنے ہوتے تو عرض کرتا۔

سوہدرے کے بزرگ کا خط میرے نام بھی آیا تھا۔ عشرت صاحب کے نام بھی آیا ہے۔ وہ قومی فائدہ

---

نوٹ (۱) حضرت اکبرؒ کا ایک شعر ہے۔ ادیلوشن بین اک افسیر رب العالمین + کاش اس نکتہ سے واقف ہوں مسلمان اندنوں۔ جسکے متعلق لکھا تھا اور موجودہ علما کا نظریہ پیش کیا تھا۔

نوٹ (۲) سوہدرہ ضلع گوجرانوالہ سے ایک صاحب نے کلام اکبر کے نام سے ایک چھوٹا سا رسالہ شائع کیا تھا اسمیں بہت سی اغلاط تھیں حضرت اکبر نے مجھے لکھا میں نے سوہدروی صاحب کو لکھا انھوں نے بلا اجازت چھاپنے کی معافی مانگی۔ بعد میں انکی اور حضرت کی اس معاملہ پر خط و کتابت ہوتی رہی۔

رسائی کے لئے بے چینی ظاہر کر رہے ہیں لیکن اور صاحبوں کے خط بھی ان اطراف سے اسی درخواست کے ساتھ آ رہے ہیں بہرکیف ان سے کہدیا جاوے کہ تاجرانہ منفعت منظور ہے تو جب کسی کو ٹھیکہ دیا جاوے تو لحاظ کیا جاوے گا اگر کار ثواب اور خدا پرستی اور وعظ کا خیال ہے تو اسکی فکر ہو رہی ہے۔ کہ حصہ سوئم جلد اشاعت پا جائے۔ پولٹیکل نزاکتیں مجھ سے اور عشرت سے ایسی متعلق ہیں جنکا خیال ان نیک نہاد درخواست کرنے والوں کو نہیں ہو سکتا۔ آپ کی خاطر سے بمشکل یہ دو صفحے لکھے ان روزوں شکایتیں زیادہ ہو گئی ہیں میں خوش ہوں کہ آپ مصروف عبادت ہیں۔

نیازمند

اکبر

# غزل

کب حُسن خود آرا کا جلوہ نظر آتا ہے
ہاں ذوق نظر رسوا ہوتا نظر آتا ہے

میں مثل حباب اپنی ہستی کا ہوں آئینہ
قطرہ مری آنکھوں میں دریا نظر آتا ہے

پھر یاد کوئی آیا پھر ٹھیس لگی دل کو
پھر دیدۂ خوں بستہ رستا نظر آتا ہے

اے ہم قفسو شاید گلشن میں بہار آئی
تاریک بہت داغِ سودا نظر آتا ہے

ہے سیر فقط اتنی اس گلشن ہستی کی
کچھ رنگ ہر اک جانب اُڑتا نظر آتا ہے

وہ اپنے ہی جلووں میں مستور ہوا ایسا
خود حُسن، حقیقت کا پردا نظر آتا ہے

اُس وقت کوئی دیکھے جب نیند سے وہ اُٹھے
یہ نجم سحر آنکھیں ملتا نظر آتا ہے

افسانۂ و افسوں ہے جلووں کی فراوانی
جب تو نظر آتا ہے تنہا نظر آتا ہے

کچھ بھی نہ نظر آئے یوں محو تماشا ہو
پھر دیکھ اثرؔ تجھکو کیا کیا نظر آتا ہے

اثرؔ لکھنوی

# شانتی

## (۱)

لڑکپن ہی سے مجھے شعر و شاعری سے خاص الفت تھی۔ لیکن جب میں انٹرنس پاس کرکے کالج میں پہونچا تو یہ شوق جنوں کے درجہ تک پہونچ گیا۔ اور شاید یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ میں بھی شاعری کرنے لگا۔ میری شاعری نیچرل ہوتی تھی "بگلا، تیتری، اونٹ، برگد، جامن اور یہ ندہ" پر میں نے کئی نظمیں لکھیں اپنے احباب کو سنایا، انھوں نے بہت پسند کیا۔ لیکن جب میں نے کسی ادبی رسالہ میں اپنا کلام شائع ہونے کو بھیجا تو وہ ہمیشہ واپس کردیا گیا۔ اسکا مجھے نہایت افسوس تھا اور کوئی وجہ عدم اشاعت کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ جب میری نظموں کے ساتھ کئی مرتبہ ایسا سلوک کیا گیا تو میں نے نظم کے بجائے غزل میں طبع آزمائی کی۔ اس میں مجھے کچھ کچھ کامیابی ہوئی۔ کالج میں میرے دو چار شاگرد ہو گئے اور میں اپنے کو شاعر سمجھنے لگا۔ لیکن سچ پوچھئے تو میں ایک مصرع بھی موزوں نہیں کرسکتا تھا۔ جب مجھے کوئی غزل کہنی ہوتی تو میں اپنے سامنے مشاہیر شعرا کے دواوین رکھ لیتا اور اسی میں سے کچھ تغیر و تبدل کرکے اپنی غزل تیار کرلیتا۔ اور اگر کچھ کمی رہ جاتی تو شاگردوں کی غزل سے دو چار اشعار لے لیتا اور انکو سمجھا دیتا کہ یہ اشعار میرے ہیں۔ مصرعے لڑ گئے ہیں،" چونکہ میں اپنی غزل گاکر پڑھتا تھا اسوجہ سے نغمہ پیدا ہو جاتا تھا اور مشاعرہ میں مجھ سے زیادہ شاید ہی کسی کو داد ملتی تھی۔

ایک دن میں اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا کہ پرتاب نرائن جو عرصہ تک میرا شاگرد رہ چکا تھا آیا اور اپنی ایک غزل اصلاح کے لئے دی۔ پرتاب نرائن پیشتر مجھ سے اصلاح لیتا تھا۔ لیکن پھر خدا جانے کیوں کسی دوسرے شاعر کو اپنی غزلیں دکھانے لگا۔ آج میں نے جو اسے بہت دنوں کے بعد اپنے پاس دیکھا تو مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ کل گیارہ اشعار تھے۔ لیکن میں نے اسمیں قریباً بیس الفاظ تبدیل کئے اور بڑی کاٹ چھانٹ کی۔ پرتاب نرائن اس عرصہ میں خاموش بیٹھا رہا۔ جب میں نے غزل اصلاح کرکے اسکو واپس دی تو وہ مسکرانے لگا۔ میں نے سمجھا کہ وہ میری اصلاح سے بہت خوش ہے۔ لیکن اس نے

جیب سے ایک کتاب نکالی - میں نے دیکھا کہ وہ مشہور رسالہ "نغمہ" ہے اس نے رسالہ کھول کر ایک غزل دکھائی - جسکو رسالہ کے ایڈیٹر نے بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا - یہ وہی غزل تھی جس پر میں ابھی اصلاح کر چکا تھا - شرم کے مارے میرا جو حال ہوا وہ ناقابل تحریر ہے میں نے سر اٹھا کر چاہا کہ پرتاب نرائن کو کچھ جواب دوں لیکن وہ میرے کمرے سے جا چکا تھا - اور میں ہاتھ ملکر رہ گیا -

## (۲)

اس واقعہ کا مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ میں نے شاعری ترک کر دی - مشاعرہ سے نفرت ہو گئی میں نے سمجھ لیا کہ میں شاعر نہیں بن سکتا - میری طبیعت اسکے لئے موزون نہیں ہے - مجھے نثر لکھنی چاہئے - میرا پہلا مضمون "ہندی کی شاعری" پر کالج کے میگزین میں شائع ہوا - یہ مضمون اسقدر پسند کیا گیا کہ مجھے سونے کا تمغہ انعام ملا - میرا دل بڑھ گیا اور اب میں ہندوستان کے مشہور اردو ہندی رسالوں میں اپنے مضامین شائع کرانے لگا - چندہی روز کے تجربہ سے معلوم ہو گیا کہ اردو سے زیادہ ہندی کے رسائل مضمون نگاروں کی قدر کرتے ہیں - اسکی وجہ میرے سمجھ میں یہ آئی کہ بقدر سرمایہ ہندی والوں کو پاس ہے اردو والوں کو نصیب نہیں میں نہیں کہہ سکتا کہ میرا یہ خیال کہاں تک صحیح تھا - بی - اے - پاس کرنے کے بعد میں لا کالج ( Law College ) میں داخل ہو گیا - میرے ادبی ذوق میں اسوقت کوئی کمی نہ آئی تھی - میں برابر اپنے مضامین ہندی پرچوں میں شائع کراتا رہا تنقید و تبصرہ لکھنا میرا خاص مقصد تھا - اس میں مجھے میرے وہم خیال سے بھی زیادہ کامیابی حاصل ہوئی - میرے اکثر مضامین کلکتہ کے مشہور ہندی رسالہ "نورتن" میں شایع ہوتے تھے -

ایک دن جب میں کالج سے واپس ہوا تو مجھے "نورتن" کا سالانہ نمبر ملا - میں نے بڑے شوق سے کھول کر پڑھا اس میں میرا بھی ایک مضمون تھا اپنا مضمون پڑھکر میں دوسروں کے مضامین پڑھنے لگا میری نظر ایک نظم پر پڑی جسکی سرخی "عیب جو" تھی نظم کو پڑھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ میرے ہی اوپر لکھی گئی ہے اس نظم کی کہنے والی ایک عورت تھی جسکا نام "مدمالتی" تھا - اس نظم کو میں نے کئی مرتبہ پڑھا اور اپنے دل کو سمجھایا کہ یہ میرے اوپر نہیں لکھی گئی ہے مگر میرے

دل کو اطمینان نہ ہوا۔

میں فوراً اس کا جواب دینے کیلئے تیار ہوگیا۔ نظم بہت اچھی لکھی گئی تھی۔ لیکن مجھے اس میں برائی کے سوا بھلائی کی کوئی بات نہ دکھائی دیتی تھی۔ انتقام اور تعصب نے مجھے اندھا بنادیا تھا۔ میں نے اس نظم پر ایک زبردست تنقید لکھی اور "نورتن" میں ایک فرضی نام سے شائع ہونے کو بھیجدی۔ لیکن دل مجھسے کہہ رہا تھا کہ میرا یہ فعل قابل تعریف نہیں ہے۔

## ( ۳ )

"نورتن" کا نیا نمبر آیا۔ اس میں میری تنقید شائع ہوگئی تھی اس مرتبہ بھی "مالتی" کی ایک نظم بہ عنوان "معافی" نظر سے گذری جس میں درپردہ میرا مضحکہ اڑایا گیا تھا۔ اس نظم کو پڑھکر میں غصہ سے کانپنے لگا مگر کر ہی کیا سکتا تھا۔ اس وقت شام ہوگئی تھی۔ ٹہلنے کے لئے باہر نکلا۔ میرے مکان سے تھوڑی دور پر میرے ایک دوست پنڈت رام نرائن کا مکان تھا یہ لا کالج (Law College) میں پروفیسر تھے۔ ہر اتوار کو مجھے چاء پر مدعو کرتے تھے۔ آج اتوار کا دن تھا ٹہلتے ٹہلتے جب میں انکے مکان پر پہونچا تو بہت دیر ہوگئی تھی۔ پروفیسر صاحب نے مجھے دیکھتے ہی کہا "مسٹر شیام آج بڑا انتظار دکھایا"۔ میں اپنے اس تاخیر کی معافی مانگتا ہوا ایک کرسی کھینچکر پروفیسر صاحب کے پاس بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں پروفیسر صاحب کی بیوی اور ان کی اکلوتی لڑکی شانتی بھی اس جگہ پر آگئیں اور ہم سب چاء پینے لگے اثناء گفتگو میں "شانتی" نے مجھ سے کہا "پنڈت جی اس مرتبہ تو "نورتن" میں مالتی نے معافی مانگی ہے" "لیکن اس معافی کے پردہ میں "مالتی" نے جس جرأت و شرارت سے کام لیا ہے وہ سخت ہتک آمیز ہے" میں نے جواب دیا۔

شانتی۔ لیکن میرا تو یہ خیال ہے کہ اس نے آپ کے زور قلم سے مرعوب ہوکر کھلی معافی مانگی ہے میں۔ شانتی تمہارا خیال غلط ہے۔ اسکو معافی مانگنی تھی تو وہ میرے پاس خط لکھتی مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ رسالہ میں شائع کرکے میرا مذاق اڑایا ہے اسکا جواب ضرور دیا جائیگا۔
شانتی "تو کیا آپ نے جواب بھی لکھ ڈالا"

میں۔ ابھی تک تو نہیں لکھا مگر آج رات کو لکھنے کا ارادہ ہے"۔

چونکہ رات زیادہ ہو گئی تھی۔ میں سب سے رخصت ہو کر اپنے گھر واپس آیا۔ اس مرتبہ میں نے "مالتی کی مخالفی" پر کوئی تنقید نہیں لکھی بلکہ اس کی متفرق نظموں اور غزلوں پر جو وقتاً فوقتاً "نورتن" میں شائع ہو چکی تھیں تبصرہ کیا۔ میرے مضمون کا خلاصہ یہ تھا کہ "عورتوں کو غزلیں نہیں لکھنی چاہئیں۔ اسی سلسلہ میں میں نے "مالتی" کی بھی خوب خبر لی تھی۔ اُسے بے عزت، بے شرم، ملک اور قوم کو بدنام کرنے والی عورت ثابت کیا تھا۔ مضمون کی سرخی "عورتوں کی شاعری" تھی۔ مضمون لکھکر میرا جی ہلکا ہو گیا۔ رات کے دو بجے چکے تھے۔ میں سو گیا۔

## (۴)

خدا خدا کر کے مہینہ ختم ہوا اور "نورتن" کا نیا پرچہ آیا۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے کھول کر پڑھا۔ میرا مضمون شائع ہو گیا تھا۔ مالتی کی ایک نظم "آپ اپنے عیب سے ہوتا نہیں واقف کوئی" نظر سے گذری۔ اس میں میری ان تمام باتوں کا جواب دیا گیا تھا جو میں نے اپنے مضمون "عورتوں کی شاعری" میں لکھی تھیں۔ جس لہجہ میں میں نے اپنا مضمون لکھا تھا اس سے سخت لہجہ میں جواب دیا گیا تھا۔ تعجب تو اس بات کا تھا کہ مالتی کو "عورتوں کی شاعری" کا مضمون کیسے معلوم ہوا کیونکہ اس راز سے سوائے میرے اور شانتی کے کوئی واقف نہیں تھا۔ کیا شانتی نے مالتی کو اسی کی خبر دی؟ لیکن مجھے شانتی کے طرف سے ایسی امید ہرگز نہیں تھی۔ پھر مالتی کو میرے مضمون کا حال کیسے معلوم ہوا۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

میری اس سے زیادہ ہتک کبھی نہیں ہوئی تھی۔ "مالتی" نے میری شہرت کو خاک میں ملا دیا غصہ سے میرا برا حال تھا۔ اگر مالتی مجھے مل جائے تو ——————— میں رنج و غم میں ڈوبا ہوا دل بہلانے کی غرض سے باہر نکلا۔ باہر پروفیسر صاحب کا اردلی کھڑا تھا، اس نے مجھے ایک خط دیا۔ میں نے خط کھول کر پڑھا۔ خط کے مضمون کو پڑھکر میرا رنج و غم دور ہو گیا۔ میں جوش مسرت میں سب کچھ بھول گیا۔ خط میں پروفیسر صاحب نے "شانتی" یعنی میری پیاری شانتی کے ساتھ میری شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اور آج شام کو چاء پر مدعو کیا تھا۔ میں نے جواب میں پروفیسر صاحب کے اس خاص محبت کا شکریہ ادا کیا اور لکھدیا کہ ان کی تعمیل ارشاد میں مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔

شام کے وقت جب میں پروفیسر صاحب کے مکان پر پہونچا تو وہاں پر شانتی کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ شانتی سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کی ماں اور پروفیسر صاحب اپنے کسی دوست کی تقریب میں گئے ہوئے ہیں لیکن جلد واپس آنے کو کہہ گئے ہیں۔

شانتی بسنتی ساری پہنے ہوئے تھی۔ وہ اس لباس میں آج میرے وہم وخیال سے بھی زیادہ حسین معلوم ہوتی تھی جیطرح دِدج چاند کو دنیا دھرم سمجھکر دیکھتی ہے اسی طرح میں شانتی کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔

شانتی نے میری اس وحشت کو تعجب آمیز نگاہوں سے دیکھا اور شرما کر سر جھکا لیا۔ اس عرصہ میں نوکر چاء لایا اور ہم دونوں چاء پینے لگے۔ چاء پی کر میں رخصت ہونے لگا تو شانتی نے روک کر کہا "پتاجی کہہ گئے ہیں کہ ۱۰ بجے تک میرا انتظار کرنا۔ اگر میں اسوقت تک نہ آیا تو پنڈت جی کو جانے دینا"۔

میں نے شانتی کی طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا "اگر یہ بات ہے تو میں نہیں جاؤنگا"۔ اسکے بعد ہم دونوں تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ میں دل میں سوچ رہا تھا کہ کیا شانتی کو پروفیسر صاحب کے خط کی خبر نہیں ہے۔ میں نے چاہا کہ شانتی کو وہ خط دکھا دوں لیکن اسوقت خلاف تہذیب سمجھکر میں چپ چاپ ہی رہا۔

شانتی۔ آپ کا مضمون "عورتوں کی شاعری" جو "نورتن" میں اس مرتبہ شائع ہوا ہے بہت دلچسپ ہے۔ میری نظر سے ایسا لاجواب مضمون کبھی نہیں گذرا۔

شانتی کی زبان سے اپنی تعریف سنکر میں بہت خوش ہوا۔ لیکن اسکے ساتھ ہی جب مالتی کی نظم "آپ اپنے عیب سے ہوتا نہیں واقف کوئی" کا خیال آیا تو مجھے غصہ آگیا۔ اور کہا۔

میں۔ شانتی! کیا تم نے مالتی کی نظم "آپ اپنے عیب سے ہوتا نہیں واقف کوئی" دیکھی ہے؟

شانتی۔ جی ہاں۔

میں۔ کیا عورتوں کو اس ڈھٹائی سے کام لینا چاہیئے؟ کیا عورتوں کو ایسی بیہودہ نظمیں لکھنی چاہیئے؟ میرا تو خیال ہے کہ اس سے زیادہ واہیات نظم شاید ہی کسی نے لکھی ہو۔ مالتی بے حیا ہے۔ بے شرم ہے۔

شانتی۔ (گویا اس کے دل پر بھی میرے رنج وغم کا اثر پڑا ہے) مجھے بھی مالتی کی اس حرکت سے سخت غصہ و رنج ہے۔

میں - اس مرتبہ میں ایسا جواب لکھونگا کہ مالتی بھی کیا یاد کرے گی - میرا خیال ہے کہ کوئی مرد مالتی کی طرف سے مضمون لکھتا ہے -

شانتی - شاید ایسا ہی ہو - لیکن جہاں تک میں جانتی ہوں یہ اسی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے -

میں - کیا تم مالتی سے واقف ہو ؟

شانتی - ہاں وہ میری سہیلی ہے -

میں نے شانتی کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھا اور کہا کہ "مالتی تمہاری سہیلی ہے"۔

شانتی - جی ہاں - وہ آپ کے ملنے کی مشتاق ہے - کیا آپ اس سے ملکر اسکی خطا معاف فرما سکتے ہیں -

میں - (جوش مسرت سے) ہاں - میں اسے ضرور معاف کر دونگا - اگر وہ میرے سامنے آکر معافی مانگے -

شانتی - اور اگر میں خود ایسا کوئی مضمون لکھتی تو کیا آپ مجھے معاف کر دیتے -

میں - آہ شانتی! تمہیں کیا معلوم کہ میرے دل میں تمہاری کتنی عزت ہے - اگر تم کوئی ایسا مضمون لکھتیں تو تنقید لکھنا تو کجا میں تو اسکی تعریف میں تمام رسالوں میں مضامین لکھتا -

شانتی - تو پھر مالتی نے آپ کا کونسا قصور کیا ہے - میں بھی عورت وہ بھی عورت -

میں - یہ سب کچھ سہی - لیکن "میں کیا کروں تیری صورت ہے پیار کے قابل"۔

میں جوش میں کہنے کو تو کہہ گیا لیکن اپنی اس بدتہذیبی پر مجھے بہت غصہ آیا - میں نے اس سے پیشتر کبھی شانتی سے اس بیباکی سے گفتگو نہیں کی تھی - میں نے پروفیسر صاحب کا خط جیب سے نکالا اور شانتی (جو سر جھکائے ہوئے چپ چاپ بیٹھی تھی) کی گود میں ڈالدیا - شانتی نے پڑھا اور مسکرا کر مجھے خط واپس کر دیا -

شانتی نے اٹھکر کہا "اچھا ٹھہرئے! میں مالتی کو بلائے لاتی ہوں - آپ اسکی خطا معاف کر دیجئے - یہ کہکر وہ گھر کے اندر گئی اور تھوڑی دیر میں واپس آگئی - اسکے دونوں ہاتھ رومال سے بندھے ہوئے تھے - میں نے تعجب سے شانتی کو دیکھکر کہا "یہ کیا"۔

شانتی - آپ اپنا وعدہ وفا کیجئے -

**میں**۔کیسا وعدہ ؟

**شانتی**۔مالتی آپ کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی ہے۔وہ اپنی گستاخی کی معافی چاہتی ہے۔ امید ہے کہ آپ معاف فرمائیں گے۔

میں حیرت سے شانتی کا منہ تکنے لگا۔میں نے کہا "کیا شانتی اور مالتی دونوں ایک ہیں" ؟

**شانتی**۔بیشک :۔

شانتی اسوقت مسکرا رہی تھی۔فضا خاموش تھی۔چودھویں کا چاند بڑی آب وتاب سے چمک رہا تھا۔جس طرح سے کنول کے پھول پر بھونرے اپنی آنکھیں ملتے ہیں اسی طرح شانتی کے بکھرے ہوئے بال اس کے چاند سے مکھڑے کی بلائیں لے رہے تھے۔میں فرط محبت سے بیتاب ہو کر کھڑا ہو گیا اور "بڑھ کے کافر کو کلیجہ سے لگایا میں نے" اسوقت چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا لیکن میری آنکھوں میں دل میں شانتی ہی شانتی تھی۔

وکالت پاس کرنے کے بعد میری شادی شانتی کے ساتھ ہو گئی۔اب ہم دونوں بڑے آرام سے رہتے ہیں۔شانتی اب بھی اپنے مضامین اردو ہندی کے رسائل میں شائع کراتی ہے۔ لیکن اب کوئی اس پر تنقید نہیں لکھتا۔میں دنیا میں جس طرف نظر اٹھا کر دیکھتا ہوں شانتی ہی شانتی دکھائی دیتی ہے۔

اعظم کریوی

# غزل

چلا ہوں گھر سے پھر اپنے خیال زلف پیچاں میں
لئے جاتا ہے پھر شوق اسیری مجھکو زنداں میں

نہیں ہے کوئی بھی بجز حباب میں ناخدا اپنا
ہماری کشتئ دل ڈوبتی ہے غم کے طوفاں میں

اسیروں نے یہ کسکی آمد آمد کی خبر پائی
جگر کے داغ روشن ہو گئے تاریک زنداں میں

بگولے اڑھ رہے ہیں چارسو سے پردہ پوشی کو
کسی دیوانے کی کیا لاش عریاں ہے بیاباں میں

ریاض خستہ ان روزوں بہار آئی ہے گلشن میں
غموں کو اپنے جا کے اب تو رکھ دو طاق نسیاں میں

ریاض الہ آباد

# غزل

جہاں میں ہر شے ہے آنی جانی نشاط غم اضطراب کب تک
یہ جوش کب تک امنگ کب تک ترنگ کبتک شباب کب تک

ہمیں کچھ اسکی خبر نہیں ہے کہ آگیا آفتاب سر پر
جو دل ہو بیدار تو یہ سوچیں سکون و آرام خواب کب تک

جو ہے انہیں شوق خود نمائی تو آہی جائیں گے سب کے آگے
رہیں گے پردے میں وہ کہانتک نبھے گا انکا حجاب کب تک

یہ ہم لڑکپن میں چاہتے تھے کہ جلد آئے کہیں جوانی
شباب میں اب یہ سوچتے ہیں کہ آخر اپنا شباب کب تک

کہاں وہ ساغر کہاں وہ مینا مگر وہی تشنگی ہماری
شراب نوشی کی حد ہے کوئی پلائے کوئی شراب کب تک

نقاب چہرے سے وہ اٹھائیں کہ حسن ان کو خدا نے بخشا
عیاں نہ ہو ماہتاب کیونکر نہاں رہے آفتاب کب تک

سکون خاطر کے واسطے ہم دوا کریں گے دعا کریں گے
ہمیں بھی اب دیکھنا ہے اسکو نچائیگا اضطراب کب تک

اگر ہو ملنا تو ہمسے ملئے نہ ہو جو ملنا تو صاف کہئے
سلام کب تک پیام کب تک سوال کبتک جواب کب تک

کبھی نہ آئے جہاں یہ آفت کبھی نہ ہو جائے غرق عالم
جناب نوح اپنے اشک روکیں یہ جوش طوفان آپ کبتک

(نوح ناروی)

# غزل

غم جہاں کے لئے روح تن میں آئی ہے
کس انبساط سے قید محن میں آئی ہے

وہی شراب ازل جس نے مجھ کو مست کیا
وہ بن کے بوئے گل تر چمن میں آئی ہے

صبا نہ گل نہ عنادل نہ نغمۂ سحری
کہاں کی آج اداسی چمن میں آئی ہے

وہی سکوت کا عالم وہی مناظر یاس
مصیبت شب غربت وطن میں آئی ہے

ہماری حسرت دل بھی عجیب حسرت ہے
تہ مزار بھی چھپ کر کفن میں آئی ہے

کسی کی بزم میں روشن ہے شمع بھی دل بھی
صبا بجھانے کسے انجمن میں آئی ہے

کسی کے کاکل مشکیں کو چھیڑنے روحی
شمیم نافۂ آہو ختن میں آئی ہے

محمد زبیر روحی علیم ہائی اسکول کانپور

# تفریح

## اکبر اور ظرافت

حضرت اکبر الہ آبادی نے جو خاص نام اور مرتبہ دنیائے صحافت و سخن میں حاصل کیا ہے وہ محتاج تعارف نہیں۔ موصوف کا دلکش کلام ہند کے گوشہ گوشہ میں عزت و محبت کے ساتھ پہونچ چکا ہے۔ طرز بیان اسقدر سلیس اور عام فہم ہوتا ہے کہ عورتیں اور بچے بھی بقدر ذوق و ادراک محظوظ ہو سکتے ہیں۔ ظرافت کے متعلق قرون وسطےٰ کے ایک زبردست فلسفی کا قول ہے "زندگی کے جتنے منٹ تفریح میں گذر جاتے ہیں وہ حیات میں شمار نہیں کیئے جاتے" دوسرے لفظوں میں اصل مفہوم یوں سمجھ لیجئے کہ جو وقت تفریح میں گذر جائے انسانی زندگی اسیقدر بڑھ جاتی ہے۔ طبی اعتبار سے بھی تفریح صحت کا جزو اعلیٰ ہے یہی وجہ ہے کہ مہذب ملکوں میں جسم و دماغ کی تسکین و تفریح کے لئے تھیٹر۔ سینما۔ بال روم، کتب خانہ، کلب گھر۔ تاش۔ شطرنج۔ گیند بلا۔ ٹینس۔ ہاکی۔ گھوڑ دوڑ وغیرہ ہزاروں قسم کے کھیل رائج ہیں۔ حضرت اکبر کی عام قبولیت اس امر پر شاہد ہے کہ ظرافت کے پیرایہ میں خشک سے خشک مضامین بھی نہایت دلچسپ و موثر بنائے جا سکتے ہیں۔ موصوف کے کلام کا خیر مقدم ہندوستان جیسے ملک میں بھی ہر جگہہ اور ہر طبقہ میں کمال گرمجوشی سے کیا جاتا ہے جسکی وجہ صرف یہ ہے کہ اس بہتے ہوئے دریا میں ہر مذاق اور ہر طبیعت کے موافق انمول موتیوں کا ڈھیر ہے۔ ظرافت کا لفظ بہ نفسہ نہایت جامع اور وسیع ہے۔ ظرافت کی بہتیری تعریف جو زمانہ موجودہ و گذشتہ کے زبردست فلسفیوں نے متفقہ طور پر تسلیم کر لیا ہے یہ ہے "ظرافت ایک لطیف شے ہے جس سے انسانی دماغ کو فرحت حاصل ہوتی ہے۔"

ظرافت کے لئے (جیسا عام طور پر سمجھا جاتا ہے) ہنسی یا مسکراہٹ ضروری نہیں ہے یہ لطیف اثر اکثر الفاظ یا حرکات میں مضمر ہوتا ہے۔

ظرافت کی قسمیں جن سے اکبر کا کلام مالا مال ہے کم از کم میرے احاطۂ شمار سے باہر ہیں بہر طور چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

رشوت ہے گلوئے نیکنامی کا چھرّا عیاشی بھی ہے بدی کے پہیئے کا دھرا
ہر چند کہ بے محل خوشامد ہے بری گستاخ ہے مگر خوشامدی سے بھی برا

یہہ اخلاقی ظرافت ہے۔

چار مصرعوں میں ہندوستان کے چار طبقوں (راشی۔عیاش۔خوشامدی اور گستاخ) کی مکمل تصویریں موجود ہیں۔چھرّا۔اور دھرا صرف قافیہ کی غرض سے نہیں لائے گئے بلکہ خاص مفہوم کے حامل ہیں۔اہل نظر و تجربہ خوب جانتے ہیں کہ راشی آدمی خواہ کیسے ہی معزز عہدہ پر ممتاز ہو اپنی زندگی کے کسی نہ کسی حصہ میں حضرت معلم الملکوت کی طرح مشہور و نیکنام ضرور ہو جاتا ہے فارسی کے اکثر شعرا نے رشوت کو "خنجر طلائی" سے تشبیہہ دی ہے دوسرے مصرعہ میں دائرہ بدی کے اندر عیاشی کا وہی مرتبہ دکھلایا گیا ہے جو اہمیت پہیئے میں دُھرے کی ہے۔کیا اس امر سے کوئی عقل والا انکار کر سکتا ہے کہ عیاشی اور صدہا برائیوں کا ساتھ چولی دامن کا ہے سب سے پہلے بدی جو عیاشی کا ضمیمہ ہے قرض کی عادت ہے نفس امارہ کی "بالک ہٹ" پوری کرنیکے لئے قرض وام کی لت ہو جاتی ہے جنکا آخر نتیجہ یہی ہے کہ اینٹ سے اینٹ بج جائے۔دوسری بدی شراب اور کسی منشّی شئے کا استعمال ہے تیسری بدی خرابی صحت ہے جسکی بدولت عیاش کا کیسۂ زر ہمیشہ حکما اور اطبا کے لئے کھلا رہتا ہے، مگر کب تک ؟ بعض وقت مقدمہ بازی، مار پیٹ اور قتل و غارت کا اصلی سبب بھی یہی عیاشی ہے۔بے محل خوشامد بُری ضرور ہے لیکن گستاخی سے کہیں اچھی ہے۔گستاخی سے کبھی کوئی ضرورت رفع نہیں ہوتی مگر خوشامد سے ۵۰ فیصدی کام چل جاتا ہے۔اگر ان چاروں مصرعوں کو وسعت دی جائے اور اثرات و نتائج سے واقعات کے ساتھ بحث کی جائے تو چار مستقل کتابیں لکھی جاسکتی ہیں مگر علم و فضل کا بہترین مصرف یہی ہے کہ دریا کو کوزہ کے اندر بند کر دیا جائے۔وہ تمام نصیحتیں جو ان چند لفظوں میں سامع کے حواس پر اثر ڈالتی ہیں

اگر دنیا کے بیش بہا جواہر کے ساتھ تولی جائیں تو بھی انہیں کا پلہ بھاری رہے گا۔

چٹکیاں اک دوسرے کی وقت پر جڑتے بھی ہیں　　ناگہاں غصہ جو آ جاتا ہے لڑ پڑتے بھی ہیں

ہندو و مسلم ہیں پھر بھی ایک اور کہتے ہیں سچ　　ہیں نظر آپس کی ہم ملتے بھی ہیں لڑتے بھی ہیں

یہ سیاسی ظرافت ہے۔

مگر معاشرتی پہلو لئے ہوئے۔ چوتھے مصرعہ میں شستگی بیان۔ لطف زبان۔ بندش محاورہ۔ نشاط تشبیہہ اور بلاغت کے علاوہ حسیات وجذبات کا ایک دریا لہریں لے رہا ہے۔ لڑنے اور ملنے کے مختلف مگر برابر کی لطیف کیفیتوں کا لطف اونھیں کے دل سے پوچھیئے۔ جو صاحب نظر ہیں۔ پہلے مصرعہ میں چغلی جڑنا چغلی کھانے سے زیادہ عمدہ ہے۔ محاورہ کا تصرف بھی نہیں۔ پہلے اور دوسرے مصرعہ میں بعض وطن پرست حضرات کی دو خاص کمزوریوں کا پردہ فاش کیا گیا ہے۔ تیسرے اور چوتھے مصرعہ میں ہندو و مسلم کے اتحاد کی ضرورت اور اہمیت آزادی کے ساتھ دکھائی گئی ہے کہ ہندو و مسلم ایک جسم کی دو آنکھیں، ایک آنکھ کی دو نگاہیں اور ایک نگاہ کی دو کیفیتیں ہیں۔ کیا کیفیت نگاہ سے، نگاہ آنکھ سے اور آنکھ جسم سے دور ہو سکتی ہے؟ کاش ہندوؤں اور مسلمانوں میں تعصب کے بعض متوالے اس حقیقت کو سمجھ لیں اور غریب ہندوستان کو۔ کلکتہ سرحد۔ کانپور اور الہ آباد کے ناگوار شر و فساد سے فرصت نصیب ہو جائے۔

لوگ ہنستے ہیں جو پیش آتی ہے یہ حالت کبھی　　"من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو"

لیکن اخلاقی نظر میں اس سے بہتر تو ہے وہ　　"من ترا حاجی بگویم تو مرا باجی بگو"

یہ ادبی ظرافت ہے۔

اس رباعی کا صحیح اطلاق زیادہ تر رسائل و اخبار کی موجودہ دنیا پر ہے جہاں کچھ ہستیاں ایسی نظر آئینگی جو ادبی تنقید اور علمی تبصرہ سے قطع نظر کرتے ہوئے ذاتیات پر حملہ کرنے کے لئے ہر وقت قلم بکف رہتے ہیں اور اپنی بے حجاب تحریریں اخلاق و تہذیب کے تمام پہلو فراموش کر دیتے ہیں۔ بعض لوگ اپنی معیشت کا ذریعہ صرف یہی سمجھتے ہیں کہ معاصرین کو گالیاں دی جائیں مرحوم کی رباعی ایسے حضرات کے لئے تازیانہ عبرت ہے۔ اخبار کے ناظرین سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ چوتھے

مصرعہ والا مرض لیڈروں میں بھی سرایت کرتا جارہا ہے۔ اللہ رحم کرے۔

مرد کو چاہیئے قائم رہے ایمان کے ساتھ تا دم مرگ رہے یاد خدا جان کے ساتھ
میں نے مانا کہ تمہاری نہیں سنتا کوئی سر ملانا تمہیں کیا فرض ہے شیطان کے ساتھ

یہ مذہبی ظرافت ہے۔

ان مصرعوں میں استقلال وصداقت کے سبق دیئے گئے ہیں بعض لوگ محض ان مجبوریوں سے کہ زمانہ کا رنگ بدل گیا ہے غیروں کی روشوں پر چلتے ہیں۔ صدق وصفا کے راستہ سے بھٹک کر بڑوں کی ہاں میں ہاں ملانے لگتے ہیں۔

کمیٹیوں سے نہ ہوگا کچھ بھی غرض اگر مشترک نہ ہوگی خیال ملت نہ ہوگا جبتک مفید ہرگز یہ بک نہ ہوگی
بہت بجا نوٹ لکھے گئے ہیں یہ اپنی پوتھی میں بھائی مانک غذا نہ ہوگی تو کیا جیوں گا دیا کرو تم ہزار ٹانک

ایسے مریض جنکی غذا صرف اطباء کی مقوی ادویہ تک محدود ہو کے دن چل سکتے ہیں دوائیں معاون ومحرک ہیں جو فطرت کی زنگ خوردہ مشین کو صاف کردیتی ہیں کبھی کوئی دوا کوئی نئی قوت نہیں پیدا کرسکتی یہی حال اصول کے درستگی کی ہے اگر بنیاد ٹھیک نہیں تو لکچروں کے قلعے اور سینا گرہ کے محل سب بیکار ہیں۔

خواہش ہے اگر تجھے غنی بننے کی دولت کی ہوس ہے اور دھنی بننے کی
شخصی حالت کو چھوڑ کر اے ہندی کوشش لازم ہے کمپنی بننے کی

یہ اقتصادی ظرافت ہے۔

ہندوستان کے تجارت پیشہ طبقہ کو خاص طور پر نصیحت کی گئی ہے کہ مشترک سرمایہ ومشقت سے کارخانے جاری کرکے وہ تمام منافع اور سہولیتیں قابو میں کرلی جائیں جو امریکہ وجاپان۔ جرمن وانگلستان کو حاصل ہیں۔ انفرادی حیثیت سے تمام ترقیاں محدود ہوجاتی ہیں۔ ہندوستان نعم فطری سے مالا مال ہے جسقدر لوازم تجارت وصنعت (Raw material) ہندوستان میں موجود ہے دنیا کے کسی حصہ میں نہیں۔ اگر اصل الحال اور محنت مشترک کرلی جائے تو ٹالین بافی تجارت انیہ وغیرہ سے کروڑوں روپیئے ایک دن میں حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

پاکیزگی نفس کی دشمن یہ مے ہے انساں کو خراب کرنے والی شے ہے
شیطان کی ہے پرائیوٹ سیکریٹری مسلم اور اسکو مُنھ لگائے ہے ہے

یہہ اسلامی ظرافت ہے۔

"ہے ہے" کی لفظی تکرار میں صدہا لطافتیں ملفوف ہیں نشہ کی حالت خمار کی کیفیت عبرت کا سوز و گداز۔ مُنھ کا بگڑنا۔ تھو تھو کرنا سب کچھ ان دو لفظوں میں ہے۔ ترک مے کے لئے کیا اچھی دلیل لائی گئی ہے کہ بیگم صاحبہ شراب مسٹر شیطان کے طبقۂ زار کی خاص الخاص سکریٹری ہیں۔

چند شعر تعلیمی ظرافت پر لکھ کر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں موقعہ ہوا تو اکبر کے کلام سے ظرافت کی اور بہت سی قسموں پر روشنی ڈالی جائیگی۔

مسلمانوں میں اب تعلیم انگلش رک نہیں سکتی کسی کے مغرب و مشرق کی سازش رک نہیں سکتی
وہ نزلہ رک نہیں سکتا یہ ہیچش رک نہیں سکتی بڑے بوڑھوں کی لیکن یہ بھی خواہش رک نہیں سکتی

مذاقِ قوم بیگانہ نہ ہو اللہ اکبر سے
یہہ نقشِ جانفزا مٹنے نہ پائے دل کے دفتر سے

آمین طالب الہ آبادی

# شب ہجر

سج اپنی دیکھتے تھے تن کر سنورنے والے یاں ایڑیاں رگڑ کر مرتے تھے مرنے والے
امید کی جو ڈہارس پاتے نہ مرنے والے اس رات ہو چکے تھے، جی سے گذرنے والے
کہتے تھے سننے والے سن سن کے شب کو نالے کٹ جائے رات تیری فریاد کرنے والے
لے لو قسم جو سویا ہوں شب کو اک ذرا بھی آنکھوں میں کٹ گئے سب گھنٹے گذرنے والے

ہر بار نام لیکر چونکا کہ غش ہوا پھر
بیمار کے نہیں تھے یہ ڈھب سر ہنے والے

طالب الہ آبادی

# زمزمۂ عندلیب

کیف بہار۔

دلا بہار درچمن رسید کیفِ آن نگر
ترنم ہزار رہا
خروشِ نغمہ بار رہا
فسانہ ہائے دردِ ہجر قال وقیلِ پُر اثر      دلا بہار درچمن رسید کیف آن نگر

زمست جوشہائے جُو کنم چہ طور ہا بیاں
برقصِ طاؤساں بہ بیں
کہ مستِ نغمہ ایں چنیں
"چہ مد وجزرِ آب جُو چہ لطفِ آفت وخیز آن      زمست جوشہائے جُو شود چہ طور ہا بیاں"

دلِ حزیں چرا نہ ماز یاد بردہیم غم؟
ہمہ جہاں چو مست شد
کشیدہ بادۂ خوشی
دگر بگو کہ ما چرا کشیم کلفتِ والم      بیا بیا دلِ حزیں زیاد دیم

نوائے طائراں چہ خوش، سرودِ جوئبار رہا
چہ دلکش است گوش کن
مئے سرور نوش کن
رباب وچنگ ودف بزن، گہے دِگر خوریم غم
شمر غنیمت اے حزیں زمانہ بہار رہا

سروجنی نائڈو ——— ترجمہ ——— حزیں لوگا نوی

# انشا کی شاعری

اگر انشا کی دنیائے شاعری میں کوئی مثال مل سکتی ہے، تو وہ عرب کا مشہور ظریف شاعر فرزدق ہے۔ جس طرح انشا کی تمام زندگی معاصرانہ کاوشوں، مقامی خانہ جنگیوں میں بسر ہوئی اسی طرح "فرزدق" کی جان بھی ہمیشہ رشک و حسد ہی میں مبتلا رہی۔ اگر انشا کی ذات رکاکت آمیز ظرافت کا گنجینہ تھی، تو "فرزدق" اپنی بذلہ سنجی و خباثت باطنی میں شہرۂ آفاق تھا۔ جسطرح انشا کے لئے مصحفی کی ذات ہجویہ اشعار کی بہترین محرک تھی، اسی طرح "جریر" فرزدق کی افزائش بغض کا باعث تھا۔ غرضکہ دونوں میں بعد زمانی و تشخیص جسمانی کے علاوہ کوئی فرق نہ تھا۔ اور اگر تناسخ اور آواگون چکر حقیقت آشنا ہے، تو اس کے ماننے میں کوئی شک نہیں کہ خاک عرب ہندی مجسمے میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس مختصر تقریب کے بعد اب میں بحث کی طرف لوٹتا ہوں۔ اس میں کلام نہیں کہ انشا علم و فضل میں یگانۂ دہر تھا۔ عربی و فارسی کے جملہ علوم متداولہ میں اسکو مہارت تامہ حاصل تھی۔ اس کا دماغ حدود و قیود سے آزاد تھا، مگر ان محاسن ظاہری و باطنی کے باوجود بھی اسکو مصحفی کی سی شہرت و قبولیت نہ ملی۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ اسکی فطرت ابتذالیہ نے اسکی شاعری کو سنجیدگی و متانت سے بہت کم روشناس ہونے دیا۔ انشا کی تمامتر کوشش مصحفی کے مقابلہ و محاہدہ میں صرف ہوتی تھی اس کے اشہب خامہ کی تگ و تاز اکثر اسی میدان میں محدود رہا کرتی۔ اسوقت میں انشا کی قبولیت پر کوئی فلسفیانہ مقالہ نہیں لکھنا چاہتا۔ مقصود محض انشا کی شاعری اور اس کا لوازم ہے۔ اس لئے قصداً اس مبحث کو نظر انداز کرتا ہوں۔ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ انشا کی طبیعت سنجیدگی کی طرف بہت کم مائل تھی، اسی وجہ سے اسکو مصحفی سے کوئی نسبت نہیں تاہم انشا کا سنجیدہ کلام اسکی ہمہ گیری اور محاسن شاعری کا بہترین ثبوت ہے۔

اگر انشا کا مطول دیوان، منتخب کیا جائے تو بہ مشکل تمام اسکی نسبت انشا کی طرف کی جا سکتی ہے۔ سب سے خاص بات جو انشا کے علاوہ متقدمین میں بہت کم پائی جاتی ہے "سلامت اور صفائی زبان" ہے۔ ذیل میں انشا کی ایک مسلسل غزل کے چند شعر درج کئے جاتے ہیں، جس کے پڑھنے سے اس پر داغ مرحوم کا دھوکا ہوتا ہے

ع

تم جو کہتے ہو مجھے تو نے بہت رسوا کیا　　کیا گنہ، کیا جرم کیا تقصیر میں نے کیا کیا

واسطہ، باعث، سبب، موجب، جہت کچھ بات بھی　　راز وہ کمبخت کیا تھا میں نے جو افشا کیا

کیا کہا کس نے کہا، کس نے سنا، کب، کس گھڑی　　کس جگہ، کس وقت، کس دم آپ کا چرچا کیا

کذب، بہتان، افترا، طوفان، غلط، محض دروغ　　میں تمہارا نام لے کب یہ سلا رویا کیا

مرحبا، شاباش، اے رحمت خدا کی، آفریں　　میرے حق میں تم نے باور اور کا کہنا کیا

ان شعروں کو دیکھکر یہ کہنا دشوار ہو جاتا ہے کہ یہ قدما کے نتایج افکار ہیں، خصوصاً انشا جیسے رند و بے پرواہ کے۔

چھیڑنے کا تو مزہ تب ہے کہو اور سنو　　بات میں تم تو خفا ہو گئے لو اور سنو

---

نگاہ ناز سے جھکے جہاں سب نیم بسمل ہے　　یہ وہ کافر، یہ وہ ظالم، یہ وہ خونخوار ظالم ہے

---

جو ہم نے کیا تھا شب، سو صبح کو سب بھولے　　بس اور تو کیا کہئے صدقے ہیں تغافل کے

چونکہ انشا جبلی طور پر ظرافت کا دلدادہ تھا، اس لئے اس کے کلام میں جا بجا شوخی جھلکتی رہتی ہے۔ اس صنعت خاص میں وہ مصحفی سے بدرجہا فائق تھا، جس کا ثبوت ذیل کے اشعار سے بخوبی مل سکتا ہے۔

ع

غصہ میں ترے ہم نے بڑا لطف اٹھایا　　اب تو عمداً اور بھی تقصیر کریں گے

---

مل خون جگر میرا ہاتھوں سے حنا سمجھے　　میں اور تو کیا کوسوں پر تم سے خدا سمجھے

اور اگر یہ رنگ خمریات سے مل جاتا ہے تو شعر میں اور چار چاند لگ جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو

ع

نہ کہہ تو شیخ مجھے زہد سیکھ مستی چھوڑ — تری پسند جدا ہے مری پسند جدا

---

مزا یہ دیکھیے گا شیخ جی رکے اُلٹے — جو اُن کا بزم میں کل احترام میں لے گیا

---

زاہد مرے مولا کے اسرار نہیں پاتا — غافل اسے کیا پائے ہشیار نہیں پاتا

---

حرم سے دیر میں یاں آب و دانہ لے آیا — برب کعبہ مرا اسمیں کچھ گناہ نہیں

---

مے سے تائب تھا ولیکن آج پی — ہاتھ لگ جائے تو چھوڑوں کس طرح

میں نے بعض لوگوں سے سنا ہے کہ جلیل صاحب کا یہ مطلع ۔ ع

کرکے توبہ توڑ ڈالی جائے گی — بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی

ایک اچھوتی تخئیل ہے، مگر شاید اِن کو یہ معلوم نہیں کہ یہ شعر تمامتر انشا کے اس شعر سے ماخوذ ہے۔

ع

گرچہ مے پینے سے کی توبہ ہے میں نے ساقی — بھول جاتا ہوں ولے تیری مدارات کے وقت

جرم و گناہ سے دامن تر کا استعارہ تو ایشیائی شاعری کا جزو لاینفک ہے شاید ہی کوئی شاعر ہو جس نے اس پامال مضمون کو نہ نظم کیا ہو، مگر بہت کم کی پرواز تخئیل انشا کے اس شعر تک پہونچی ہے۔

ع

شعاع آفتاب روز محشر سے سکھالیں گے — اگر دامان رندانِ سبو کش کچھ ہوا ترسا

ایسے ہی شعروں کو دیکھکر ماننا پڑتا ہے کہ شعرا بزم ازل کے فیض یافتہ ہیں۔ میدانِ حشر، جس سے آفتاب کا فاصلہ سوا نیزے سے زیادہ ہوگا، جس میں لوگ پسینوں میں ڈوبے ہوئے

اِدھر اُدھر پھریں گے۔ ایک طرف اگر نامۂ اعمال کی فکر ہو گی تو دوسری طرف امید و بیم کی کشمکش ہو گی۔ ایسے وقت رندوں کو مطلق کسی بات کا احساس نہ ہوگا، ہاں اگر انھیں کوئی خیال ہوگا، تو اس خطرناک موقع سے فائدہ اُٹھانے کا، یعنی اپنی تر دامنی کو تپش آفتاب سے سکھائیں گے۔

فی زمانہ حضرت ریاض خیرآبادی کی خمریات پسندیدہ عوام و خواص ہیں، مگر انشا کی خمریات سے انھیں کچھ بھی نسبت نہیں۔ حیرت تو یہ ہے کہ اس شوخ و غیر متین صنف میں انشا کی فطری خصلت ابتذال بالکل ناپید ہے۔

جگر کی آگ بجھے جلد جس میں وہ شے لا — لگا کے برف میں ساقی صراحی مے لا

---

برق چشمک زن ہے ساقی ابر ہے چھایا ہوا — جام مے دے تو کدھر جاتا ہے گھبرایا ہوا

---

بوقت صبح ہو یوں نشۂ شراب طلوع — کہ جیسے شرق سے کرتا ہے آفتاب طلوع

---

جام خجلت کُن خورشید ہمیں دے ساقی — دیکھ بر ہم زن ہستی ہے یہ خمیازہ صبح

---

اک جرعۂ شراب سے لب تشنہ ہم چلے — آباد ساقیا یہ ترا خانماں رہے

انشا جہاں لفظی محاسن میں اپنا نظیر نہیں رکھتا، اسیطرح وہ معنوی خوبیوں میں بھی عدیم المثال ہے۔ اکثر ایشیائی شاعروں کی طرح اس کی تشبیہیں استعارے محض تخیل پر مبنی نہیں ہوتے، اس کی تشبیہیں بالکل فطری اور زود فہم ہوتی ہیں۔

۵

دل میں سما رہا ہے یوں داغ عشق اپنے — جس طرح کوئی بھونرا ہو وے کنول میں بیٹھا

داغ عشق کو بھونرے سے، اور کنول کو دل سے تعبیر کرنا انتہائی لطافت ہے۔ اس تشبیہ سے ضمنی طور پر اور دو باتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ جسطرح بھونرا ہمیشہ کنول کی جستجو میں رہتا ہے، اسی طرح داغ عشق دل سے جدا نہیں ہوتا۔ دویم یہ کہ جس طرح بھونرے کی فریفتگی کنول سے

اسی وقت تک رہتی ہے، جب تک کہ وہ پژمردہ اور ژولیدہ نہیں ہوتا، اسی طرح داغ عشق مردہ قلوب سے وابستہ نہیں ہوتا اور اسی وقت تک دل کو منور کرتا ہے، جب تک کہ اس میں اس نور کے جذب کرنے کی صلاحیت باقی رہتی ہے۔

کیا یورپ کے پرستار، مغربی نغموں میں بھی یہ کیفیت دکھا سکتے ہیں؟ تشبیہہ واستعارہ کے مخالفین اس شعر کو پڑھیں اور اپنے دعووں پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ ؎

کیونکر جھڑیں نہ موتی دامن سے بادلوں کے باندھا انھیں ہے محکم بجلی کی اوڑھنی سے

ہمارا روزانہ کا مشاہدہ ہے کہ ہر وہ چیز جس میں مائیت ورقت پائی جاتی ہے، حرارت پانے سے بھاپ کے قطرات میں تشکل ہوجاتی ہے، اور بھاپ کے قطرے لطافت میں آب مطلق سے کہیں بڑھکر ہوتے ہیں، اس لئے ان کی تشبیہہ موتیوں سے بالکل حقیقت نما ہے۔ اس کلیہ کو پیش نظر رکھکر شعر کی معنویت پر غور فرمایئے اور شاعر کی جدت طبع کی داد دیجئے۔

انشا کی پرواز تخیل بھی قابل رشک ہے، اسکی فکر مادیت سے پراگندہ ہوکر پستی سے آلودہ نہیں ہوتی۔ اس کی فہم رسا مکان وزمان سے آزاد ہے، عام چیزوں کے مشاہدہ سے لطیف تخیل کی بنیاد انشا ہی کا حصہ ہے۔ ؎

برنگ گل کے بھلا میں کیونکر کروں نہ جیب شکیب ٹکڑے کنار میں اس کو تنگ کھینچے ہوا یہ مقدور کب قبا کا

---

مجھے چھیڑنے کو ساقی نے دیا جو جام الٹا تو کیا بہک کے میں نے بھی اسے سلام الٹا

ایک رند بزم شراب میں جاتا ہے، ساقی مزاحاً اسے الٹا جام دیتا ہے، جسپر وہ خلاف معمول الٹا سلام کرتا ہے کیا ترکی بہ ترکی جواب کسی معمولی دماغ میں آسکتا ہے۔

مضمون تراشی میں انشا کو خاص ملکہ تھا، اس کی جذب پسند طبیعت ہمیشہ کسی نہ کسی بات کی فکر میں رہا کرتی تھی آنکھ کا استعارہ نرگس سے اردو شعر وشاعری میں عام ہے، خصوصاً چشم سرمہ آلود کے بیان میں اردو شعرا نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، مگر انشا کی جودت خیال قریب قریب سب سے آگے بڑھی ہوتی ہے۔

۵

ٹک اسکے سرمۂ دنبالہ دار پر کر دھیان کہ ہے یہ نرگس شہلائے نازنیں کا سانپ

سبحان اللہ کسقدر لطیف خیال ہے، سرمۂ دنبالہ دار کو نرگس کا سانپ ٹھہرانا انشا ہی کے دماغ کا کام تھا۔ شاید ہی کوئی بدنصیب شخص ہو، جسنے چشم سرمہ آلود نہ دیکھی ہو، مگر ایک معمولی بات ہونے سے اس کی طرف بمشکل اعتنا کی جاتی ہے۔ یہ شعر اردو شاعری کی قدیم طرز کا بہترین نمونہ ہے۔

۵

سمجھ نہ حلقۂ کاکل میں کان کا موتی یہ من نکال کے بیٹھا ہے آفتاب میں سانپ

کتنا لطیف استعارہ ہے، حلقہ کاکل میں کان کے موتی سے وہی کیفیت رونما ہوتی ہے جو ایک سانپ کے من نکالنے سے۔ دوسرے مصرعہ میں انشا کا تخیل اور بڑھ گیا ہے، چونکہ کاکل کا میلان بالکل چہرے پر ہوتا ہے اور چہرہ کا استعارہ نور وضیا میں آفتاب سے کیا جاتا ہے اس لئے حلقہ کاکل میں کان کا موتی وہی تخیل پیش کرتا ہے جو آفتاب میں من نکالتے ہوئے سانپ سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ دیکھئے ایک پامال مضمون تشبیہ واستعارہ کی آمیزش سے کس قدر بلیغ ہو گیا ہے۔

کم مایہ ہے طپش سے یہ روشن ہو خلق پہ ابر بہار ہو نہ اگر عیب پوش برق

برسات میں بجلی کا چمکنا کسنے نہیں دیکھا۔ مگر ایک حساس دماغ ہی اس سے لذت اندوز ہو کر کسی نتیجہ پہ پہونچ سکتا ہے۔ بجلی کی تپش سے کم مائگی کا مفہوم صرف شاعر ہی کے ذہن میں آسکتا ہے، پھر ابر کو جو حقیقت میں برق کا پردہ دار ہے اصطلاحی معنوں میں عیب پوش کہنا انتہائی لطافت ہے۔ برق کی مناسبت سے "روشن ہو خلق پہ" کا ٹکڑا بہت خوب ہے۔ غرضکہ یہ شعر حسن التعلیل کا ایک مرقع ہے۔

لکھنوی ہونے کی وجہ سے انشا اکثر رفعت تخیل میں بہت دور جا پڑتے ہیں، اور اگر یہ رنگ حد اعتدال سے بڑھ جاتا ہے تو یقیناً بے لطفی پیدا ہو جاتی ہے، مگر اسپر بھی مضمون ہائے

"کمر و دہن" سے الگ رہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ نئے خیال والوں کو اس قسم کے اشعار بھلے نہ معلوم ہوں مگر فن تنقید کا تقاضا یہی ہے کہ ہر شاعر کو اسکے ماحول کے اعتبار سے دیکھنا چاہئے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مضمون آفرینی عہد انشا کی بہترین خصوصیات میں تھی۔ ؎

نزاکت اس کے یہ مکھڑے کی دیکھیو انشا — نسیم صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا

---

شب انکھڑیوں کا تری تصور خیال میں مجھکو اسقدر تھا — کہ بوئے نرگس سے پر ہے اب تک کنار و دامن مری دعا کا

---

دور تھی از بسکہ راہِ انتظار — تھک کے ہر پائے نظر دکھنے لگا

---

نکہتِ گل کے جھولنے کے لئے — ہے نسیمِ بہار کا جھولا

---

کب مقابل ترے مکھڑے کے ہو گو باد سحر — عارضِ گل پہ ملے لاکھ طرح غازۂ صبح

---

آبروئے ابر یاں منظور ہے — آہ میں دامن نچوڑوں کس طرح

---

دھوم اتنی ترے دیوانے مچا سکتے ہیں — کہ ابھی عرش کو چاہیں تو ہلا سکتے ہیں

---

یاں وہ آتش نفساں ہیں کہ بھریں آہ تو جھٹ — آگ دامانِ شفق کو بھی لگا سکتے ہیں

---

پئے تعظیم اشک اسطرح آہِ سرد اٹھتی ہے — کہ جیسے قطرہ افشاں سے بوئے گرد اٹھتی ہے

---

رہتے ہیں برنگ بو کوچہ میں رگِ گل کے　　لوٹیں ہیں بہاریں ہم یوں سامنے بلبل کے

---

معلوم نہیں روٹھے ہیں کس آئینہ رو سے　　پانی جو اُترتا ہے غنچوں کے گلو سے

---

ناصح مجھے مت چھیڑ کہ رکھتا نہیں ہرگز　　کچھ چاک گریبان سحر کام رفو سے

---

ہمارے ساتھ ترے چاند سے مکھڑے کے بن دیکھے　　رہا کل ماہ تاباں رات بھر اختر شماری میں

---

نہیں یہ عشق تجلی ہے حق تعالیٰ کی　　جو راہِ زینۂ بام نظر سے اُتری ہے

---

مندرجۂ بالا اشعار سے انشا کا مخصوص رنگ (جو ان کے زمانہ میں رائج تھا) جھلک رہا ہے ممکن ہے کہ دورِ حاضر کی جدت طرازی ایسے اشعار کو اردو کے لئے باعث ننگ قرار دے مگر سخن سنج اصحاب کو جو لطف اسمیں مل سکتا ہے وہ روکھی پھیکی کہانی میں کہاں میسر ہے۔
ان اشعار میں خاص بات سلاست وروانی زبان ہے، ایسے خیالات عالیہ کو ایسی سلجھی زبان میں ادا کرنا انشا کی قادر الکلامی نہیں تو کیا ؟

اردو شاعری پر ایک خاص اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس کا سرمایہ تغزل، ابتذال وسوقیت سے بھرا ہوا ہے۔ ایک حد تک یہ اعتراض بجا ہے، مگر جس طرح ہر قاعدہ میں مستثنیات ہوا کرتی ہیں، اسی طرح اس میں بھی ہیں۔ بحمد اللہ انشا کا دامن اس غیر فطری داغ سے پاک ہے۔ ؎

پہونچے ہے یہ کوئی اس گل تلک انشا کیا دخل　　بلبل اس رشک تمنا میں مری جاتی ہے
ہاں مگر بھیس میں مالن کے محل تک اس کے　　کبھی جاتی ہے تو بادِ سحری جاتی ہے

اللہ رے پردہ، اگر باد سحر بھی اس گل سے ملنا چاہے تو اس کو مالن کا بھیس بدلنا پڑے گا، اور ظاہر ہے کہ حسینوں کے لئے مالن اسباب آرایش فراہم کرتی ہے، اس لئے وہ عموماً پسندیدۂ عوام و خواص ہوا کرتی ہے۔ دوسرے یوں بھی حقیقت میں مالن ہی گل تک باریاب ہوسکتی ہے۔ غرضکہ شعر ظاہری، معنوی اعتبار سے بے نظیر ہے۔

زبان و تخیل کے علاوہ تغزل میں محاکات کا ہونا بھی ضروری ہے، کسی واقعہ یا کیفیت کو اسطرح بیان کرنا کہ بلا قصد سامع کے سامنے ایک تصویر آجائے، کمال تغزل ہے۔ انشا نے اس میدان میں بھی خوب خوب گل کھلائے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ ۵

جوان رعنا بحسن و خوبی پری کا عالم غرض گدا کا
برون ہے وہم و قیاس سے بھی کروں جو تعریف اس صنم کی

حسن میں پری اور غرض میں گدا۔ کیا خوب سہل ممتنع، اجتماع ضدین غرض جو کچھ بھی کہئے بجا ہے

اے باد سحر محفل احباب میں کہیو
دیکھا ہے جو کچھ حال تہ دام ہمارا

---

لہریں لیتا ہے سمندر عالم سیماب کا
دیکھئے آکر جھکولا چادر مہتاب کا

اگر خاموش راتوں میں چاند کی ضیا پاشیوں کا یکسوئی سے مشاہدہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ نور کی کرنیں مستقیم و مستقل دائرہ یا مرکز خاص سے وابستہ نہیں، بلکہ ان میں ایک اضطرابی کیفیت نمایاں رہتی ہے۔ یہی حالت بعینہٖ گرمی کی چلچلاتی دھوپ کی ہوتی ہے۔ چنانچہ انشا کے شعر کی بنیاد اس عام مشاہدہ پر ہے۔ ذیل کے شعر میں محاکات کے ساتھ الفاظ کا انتخاب دیکھئے۔

ہے شب وصل کھلے کاش نہ دروازۂ صبح
کم نہیں شور قیامت سے کچھ آوازۂ صبح

---

آئی جو یاد لغزش مستانہ یار کی
ریزہ ہو چھلک ہی پڑا یاں ایاغ ال

---

ہمصفیران چمن دیکھیئے کیا ہوتا ہے آج صیاد پھر آیا قفس و دام لئے

مندرجہ بالا شعر کا انداز بیان ایک مکمل محاکات کا حامل ہے۔ "دیکھیئے کیا ہوتا ہے" سے امید و بیم کا اجتماع کچھ عجیب لطف دے گیا۔ لیکن دوسرے مصرعہ نے اس نام نہاد کشمکش کو مٹا دیا، اور وہی ناامیدی و حسرت کا پہلو غالب رہا۔ "آج صیاد پھر آیا قفس و دام لئے" مصرعہ نہیں، پوری کہانی ہے۔ لفظ "پھر" نے مصرعہ میں جان ڈال دی ہے۔ ص

جسدم کہ ترے محو تجلی کو غش آیا لوگوں نے کہا حضرت موسیٰ کو غش آیا

ترصیع الفاظ ملاحظہ فرمایئے۔ ص

موج نسیم سر پہ اڑاتی ہے آج خاک شاید کسی اسیر سلاسل نے غش کیا
دریائے معرفت کے تموج کے شان پر معمورۂ خراب کے ساحل نے غش کیا

انشا کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کا قلم اکثر سخت زمینوں پر چلتا ہے۔ ص

غم و درد و تاسف و یاس و الم سے دلا مجھے آہ فراغ کہاں
مری جانے بلا، خراب یہ کیسے غم بادہ کدھر ہے ایاغ کہاں
مجھے جانب باغ نہ لیجئے چلو یئے سیر فسردہ ہے طبع یہاں
جسے نگہت گل نہ خوش آوے بھلا وہ مزاج کدھر وہ دماغ کہاں

اردو شاعری کا ایک فرقہ "دیوانہ بزعم خویش ہشیار" ہمیشہ جذبات کے پیچھے پڑا رہتا ہے اور جذبات بھی کیسے؟ حزن والم کے۔ جن شعروں میں جنازہ اٹھایا جائے دیوار زنداں خون سے رنگین ہو جائے، ہچکیوں کا تانتا نزع کے بعد بھی نہ بند ہو، وہی بہتر ہوتے ہیں۔ ایسے حضرات انشا سے سبق حاصل کریں کہ وہ کتنے سادے الفاظ میں اپنے درد والم کا فسانہ سناتا ہے۔ ص

کہ تو اے چرخ بھلا تجھ سے کسی طرح کبھی دل کے ارمان ہمارے بھی نکل سکتے ہیں

گرچہ کچھ اپنے بگڑنے میں رہا کیا باقی پھر ابھی آپ سنبھالیں تو سنبھل سکتے ہیں

---

یہ جانے ترحم ہے اگر سمجھے تو صیاد میں اور پھنسوں اسطرح اس کنج قفس میں

ذیل میں ایک مشکل زمین کا مطلع درج کیا جاتا ہے جس سے آپ کو انشا کی قادرالکلامی کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔ ہ

فروغ مے سے ہو وے کیونکر ایاغ روشن مراد حاصل مثل یہ مشہور ہے جہاں میں چراغ روشن مراد حاصل

زندگی اور اس کے لوازم کس خوبی سے ان دونوں شعروں میں نظم ہوئے ہیں۔ ہ

جو لوگ تشریف لے سدھارے عدم کو ان کی خبر ملے کیا سنو اچنبھا کہ جیتے جی ہی ملا نہ ہم کو سراغ اپنا

یہ دو روزہ نشو نما کو تو نہ سمجھ کہ نقش بر آب ہے یہ سراب ہے یہ حباب ہے فقط ایک قصۂ خواب ہے

جی تو نہیں چاہتا کہ انشا کا "محیر العقول" کلام نظروں سے اوجھل ہو، مگر طوالت کے خیال سے محض چند مست کن شعر لکھ کر "تمت بالخیر" کا کلمہ پڑھتا ہوں۔ ہ

مست جاروب کشی کرتے ہیں یاں پلکوں سے کعبہ کب پہونچے ہے میخانہ کی ستھرائی کو

---

کیا کام ہم کو سجدۂ دیر و حرم کے ساتھ مستوں کا سر جھکے ہے صراحی کے خم کے ساتھ

اور جو سچ پوچھئے تو انشا کی خمریات کا حاصل ذیل کا شعر ہے۔ ہ

مجھے آفت آکے نہ گھیر لے کہ گناہ میں نے بہت کئے مجھے ایک کشتیٔ بادہ دے ارے اے جہاز کے ناخدا

جہاز بھنور میں ہے۔ لوگ سراسیمہ ہیں۔ ایک رند بلانوش اپنے کو سب سے زیادہ گنہ گار سمجھ کر موجودہ آفت سے ہراساں ہے۔ اسے یقین ہے کہ اب وہ چند لمحوں کا مہمان ہے ایسے نازک وقت میں اس کی حسرت پکار اٹھتی ہے، بجائے توبہ و استغفار کے لب پہ یہ الفاظ ہوتے ہیں ؟ مجھے ایک کشتی بادہ دے ارے جہاز کے ناخدا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ جتنے شعر اس مضمون میں

لکھے گئے ہیں، غالباً انشا کی خصوصیات شاعری کے اعلیٰ ترجمان ثابت ہونگے میرا خیال ہے کہ اگر انشا کا مطول دیوان منتخب کیا جائے تو بہت سے اشعار دل و دماغ کے لئے سرمایۂ راحت فراہم کریں گے، اور جو بدظنی عام طور سے انشا کی طرف سے ہے دور ہوجائے گی میں نے محض اللہ کا نام لیکر یہ سلسلہ شروع کردیا ہے، دیکھئے کب تک انجام پذیر ہو۔

اسرار احمد

# غزل

دل میں ہے بند رازِ غم اشک ہے ترجمانِ دل
خو گرِ ضبط سے کوئی آئے سُنے بیانِ دل

شبنمِ صبحدم سنبھل قطرۂ چشمِ تر نہ بن
عشقِ چمن میں اب ترا لٹتا ہے کاروانِ دل

اپنی جھلک دکھاوے اب حسنِ ازل حیا نہ کر
دل یہ نثار عشق ہے، تجھ یہ فدا ہے جانِ دل

عشقِ مجاز کے لئے حسنِ بتاں کو چھوڑ دو
ذوقِ جمال سرمدی سے کبھی امتحانِ دل

عیب و خطا سے بچ گیا، عفو و عطا سے بھر گیا
کشمکشِ حیات میں جس نے سُنی اذانِ دل

جلوۂ حسن یار میں کتنے ہوے ہیں اختلاف
نور ہے داستانِ برق، طور ہے آستانِ دل

حسنِ ادا کو کیا کہوں، ذوقِ نظر کو کیا کروں
لوٹ کے لے چلا کوئی آج مرا جہانِ دل

تارِ فلک سے ٹوٹ کر قدموں پہ سجدہ ریز ہوں
جلوۂ حسن سے ترے چمکے جو کہکشانِ دل

حافظؔ وقت دردوغم ساعت پہ سکوں کہاں
مجلسِ سوزِ عشق میں دل سے سنو بیانِ دل

حافظ غازیپوری

# ہر کس بخیال خویش خبطے دارد

کہاوتوں کی یہ اہم خصوصیت ہے کہ مختصر سے الفاظ میں جو وسیع مفہوم بیان ہوجاتا ہے وہ اور کسی زیادہ موثر طریق سے ادا نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر مندرجہ بالا مثل کو لیجئے کہ کس قدر مختصر سیدھا سادھا جملہ ہے مگر اُسی کے ساتھ اپنا مفہوم ادا کرنے میں کامیاب اور پُر اثر ہے۔

انسان کی یہ کچھ عجیب خاصیت ہے کہ جو کچھ وہ خود کرتا ہے اوسکو سراہتا اور جو اور کرتے ہیں اُسے بُرا سمجھتا ہے۔ اسی مضمون کو قرآن پاک میں اس طرح ادا کیا گیا ہے۔ کل حزب بمالدیھم فرحون یعنے جماعت ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے حال میں مست ہے۔ ان اوراق میں ہم اس مسئلہ پر فلسفیانہ بحث کرنا نہیں چاہتے۔ بلکہ صرف اسکا عملی پہلو پیش کرکے بتائیں گے کہ اسکے جراثیم کہانتک ہمارے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہیں اور اوس کی وجہ سے ہم کس قدر تلاش حق، توفیق اصلاح اور قوت عمل سے محروم ہیں۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہہ سب خود بینی و خود پرستی کا کرشمہ ہے۔ اگر انسان اپنے اعمال واشغال پر منصفانہ تنقیدی نظر ڈالے تو کبھی یہہ گمراہ کن خیال اسکے دماغ میں پیدا نہیں ہوسکتا۔

تمہیں خیال ہوگا کہ تمنے کسی دوسروں کے خیالات کو اپنے خیالات سے مختلف پاکر اکثر کہدیا ہوگا کہ "ہر کس بخیال خویش خبطے دارد" یعنے دوسروں کو تو خبط ہے اور تمہیں نہیں۔ حالانکہ جس طرح تم دوسروں کو خبط ہونا بتلا رہے ہو اُسی طرح وہ بھی تمہیں خبط ہونا کہہ سکتے ہیں۔ جب تم یہہ مثل استعمال کرتے ہو تو از راہ خود بینی یہ خیال کرلیتے ہو کہ دوسروں کو خبط ہے اور تمہیں نہیں۔

ایک انگریز مضمون نگار کسی موقعہ پر لکھتا ہے کہ جس طرح انسان کسی بچہ کو غصہ کی حالت میں کتے کا بچہ کہتا ہے اسی طرح کتا جب خفا ہوتا ہے تو اپنے بچہ کو انسان کا بچہ کہتا ہے

ہمارے نزدیک کتے کا بچہ ہونا بدترین بات ہے۔ مگر کتے غالباً اسکے برعکس خیال کرتے ہونگے۔ ایک دفعہ ایک خاندانی بھیک مانگنے والا فقیر اپنے بیٹے سے خفا ہو کر کہنے لگا کہ نالائق بدبخت کم ہمت۔ نوکری چاکری یا مزدوری کر کے اوقات بسر کرے تو کر لے۔ ورنہ بھیک مانگ کر تو تجھسے پیٹ پالا نہ جائیگا۔ ذرا غور تو کرو ہم اسکے مقابلہ میں ایسے موقعہ پر اپنی اولاد سے کیا کہتے ہیں

کسب معاش کے ذرائع پسندیدہ چار ہیں صنعت۔ تجارت۔ ملازمت اور زراعت۔ مگر کیا ایک دوسرے کی تحقیر و تذلیل نہیں کی جاتی۔ ملازمت غلامی کا طوق ہے۔ تجارت بنیوں اور مہاجنوں کا پیشہ ہے۔ زراعت تو صرف گنوار آدمی کیا کرتے ہیں۔ رہی صنعت و حرفت۔ سو ہر ایک پیشہ رذالت و دناوت کا مترادف ہے۔

ایک مسند حکومت کے زینت دینے والے صاحب فرمانے لگے کہ وکالت بھی کوئی چیز ہے۔ جسوقت حاکم کرسی پر بیٹھا اور وکیل جنگلہ میں کھڑا ہوتا ہے اوس وقت اوسکی حالت بیچارگی قابل دید ہے۔ وکیل صاحب نے جواب دیا کہ وکیلوں کو جو آزادی حاصل ہے وہ حاکموں کو خواب میں بھی نصیب نہیں۔ جب حاکم اپنے بالادست افسر کے سامنے ہوتا یا اسکے حکم کی تعمیل میں اپنے ضمیر کے خلاف فیصلہ کرتا ہے تو اوس وقت اسکی حالت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ مدرسین کے بات ان دونوں صاحبوں کا خیال ہے کہ لڑکے انکی عقل چر جاتے ہیں۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ حکام مجوزین کی عقل و کلا چر جاتے ہیں اور وکلا کی موکلین۔

ڈپٹی کلکٹر خود کو تحصیلدار سے بہتر سمجھے تو کوئی تعجب کی بات نہیں مگر ایک تحصیلدار صاحب کو میں نے ایک دفعہ یہ کہتے سنا کہ تحصیلدار اپنی تحصیل کا کلکٹر ہوتا ہے اور اس لئے ڈپٹی کلکٹر سے کہیں بہتر۔ تعلیم یافتہ اصحاب جاہلوں کو جس قدر برا کہیں ٹھیک ہے۔ مگر تعجب کی بات تو یہہ ہے کہ جاہل لوگ اپنے نزدیک صاحب علم کو نکو سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اُس نے پڑھکر اپنا دماغ اور خراب کیا۔ انگریزی داں اصحاب پرانے تعلیم یافتہ حضرات کے نسبت کہتے ہیں کہ یہہ لوگ قدامت پسند ہیں

انکی نظر محدود۔ اور انکو کیا خبر کہ آجکل دنیا میں کیا ہو رہا ہے ۔ پرانے تعلیم یافتہ اصحاب انگریزی داں نوجوانوں کے بابت کہتے ہیں کہ یہہ نئی روشنی والے آزادی پاکر مذہب سے بے نیاز اور اس لئے راندۂ درگاہ ہوجاتے ہیں ۔ یہہ لوگ تہذیب مغربی کی کورانہ تقلید کو روشن خیالی سمجھتے اور سلف کے کارناموں پر پانی پھیرنا چاہتے ہیں ۔

مذہبی آدمی غیر مذہبی شخص کو جس نگاہ سے دیکھتا ہے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ۔ مگر غیر مذہبی آدمی اوسے مکار و ریاکار سمجھتا ہے ۔ ایک طرف ڈاڑہی وغیرہ چار ابرو کا صفایا دینی ولحدی ہے ۔ تو دوسری طرف لمبی ڈاڑہی دہوکے کی ٹٹی ہے ۔

مالدار کے نزدیک غریب ومفلس جس قدر حقیر ہے ظاہر ہے ۔ لیکن غریب کے نزدیک مرد تونگر قارون کا رشتہ دار ہے ۔ مال زیادہ خرچ کرنے والے " مال مفت دلِ بے رحم " کے ایسے فقرے سنتے ہیں ۔ اور کفایت شعارانہ زندگی بسر کرنیوالے بخیلوں کے زمرہ میں شامل ہوتے ہیں ۔ صاحب استطاعت ہوتے ہوئے حج نہیں کرتے تب تو دنیادار شقی کہلاتے ہیں ۔ اور اگر حج کر آئے تو (نعوذ باللہ) حاجی پاجی کے ذیل میں محسوب ہونے لگے ۔

اگر میں ذوق کا شائق ہوں تب تو اسکی سلاست زبان شستگی الفاظ ۔ استعمال محاورہ وغیرہ اوسکی خوبیاں ہیں ۔ ورنہ اوسکے خیالات معمولی اور زبان سوقیانہ ہے ۔ اور اس لئے وہ شاعر کہلائے جانیکا مستحق نہیں ۔ اگر تم غالب کے طرفدار ہو تو کہو گے کہ اس سے بہتر اردو میں کوئی شاعر نہیں ہوا ۔ بقول ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کے ۔ ہند کی مقدس کتابیں دو ہیں ۔ وید اور دیوان غالب ۔ مگر منکرین غالب کہتے ہیں کہ عجب مہمل گو تھا ۔ شعر کیا کہتا تھا چیستاں کہتا تھا ۔ تلامذۂ دبیر ۔ شاعری کو شاندار الفاظ اور زوردار تراکیب میں محدود کرتے ہیں ۔ انیسی کہتے ہیں کہ واہ ۔ شاعری کے لئے علوئے تخیل کے ساتھ فصاحت وبلاغت بھی لازمی ہے ۔ جو دبیر کے یہاں مطلق نہیں ۔

پچھلے دور میں اردو کے چار مشہور نثار گذرے ہیں ۔ مولوی نذیر احمد ۔ حالی ۔ آزاد ۔ شبلی ۔

ہر ایک کا حامی اپنے اپنے انتخاب و پسند کی تعریف اور دوسروں کی قدح و تحقیر کرتا ہے ایک شخص مولوی نذیر احمد کی زبان میں لوچ شیرینی اور فصاحت پاتا ہے اور دوسرے کے نزدیک اونکی زباں سوقیانہ ہے۔حالی کا حامی اونکے زور قلم کا قائل ہے تو اونکا منکر انکے طرز کو خشک و بے مزہ خیال کرتا ہے۔اسی طرح آزاد پرست آزاد کی انشا میں وہ شوخی و ندرت پاتا ہے جو اوروں کی تحریر میں نہیں ہے۔لیکن انکا مخالف کہتا ہے کہ انکے طرز میں اس قدر تصنع و آورد ہے کہ انکی نثر شاعرانہ نثر بنگئی ہے۔معتقد شبلی کا شبلی کے نسبت اعتقاد ہے کہ "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" مگر منکر اعجاز شبلی کہتا ہے کہ اونکے طرز میں کسی قسم کی استواری ہی نہیں پائی جاتی۔

شعرا کو دیکھئے۔ایک صاحب فرماتے ہیں کہ جناب من۔بندہ تو سلاست زبان۔اور استعمال روزمرہ کا قائل ہے کوئی ایسی سلیس اور بامحاورہ زبان تو استعمال کرکے بتاوے۔دوسرے صاحب یوں گوہر ریز ہوتے ہیں کہ شاعری درحقیقت مضمون آفرینی و خیال بندی ہے۔یہ خوبی اور ونکے کلام میں کہاں؟ تیسرے صاحب کا ادّعا ہے کہ کمال شاعری محاکات و واقعہ نگاری ہے جیسے تم میرے کلام کے سوا کسی دوسرے ہمعصر کے اشعار میں نہ پاؤگے۔چوتھے صاحب کا خیال ہے کہ میں گل و بلبل کی شاعری کو پسند نہیں کرتا۔میں جدت کا دلدادہ اور طرز جدید کا مخترع و موجد ہوں۔لکیر کا فقیر ہونا کچھ خوبی نہیں۔ایک قسم کے مضمون کو بار بار الفاظ بدل بدل کر بیان کرنا کیا کمال شاعری ہے اور کیا خدمت زبان؟ قدامت پسند شعرا کے نزدیک جدید شاعری ہیچ ہے۔وہ ڈاکٹر اقبال کو شاعر ہی نہیں سمجھتے۔اونکا عقیدہ ہے کہ جو شاعر طرز قدیم کی غزل نہیں کہہ سکتا وہ شاعر نہیں ناظم ہے۔خوش الحان شاعر کو اپنے تغنم و ترنم پہ ناز ہے لیکن دوسرے کہتے ہیں کہ یہ اپنے ردی اشعار کو چمکا کر دکھانے کا ہت کنڈہ ہے۔شاعروں کے نزدیک معیار علم و فضیلت شاعری ہے۔وہ غیر شاعر کو نالائق سمجھتے ہیں۔مگر غیر شاعر انکے نسبت کہتے ہیں کہ انکو

سوائے شعر موزوں کر لینے کے کوئی ٹھوس قابلیت نہیں ہوتی۔ اور شعر گوئی انکو کسی کام کا نہیں چھوڑتی۔ خود بینی وخود ستائی۔ تعلی وبلند پروازی۔ بددماغی ونخوت اس طبقہ کی خصوصیات ہیں۔ غرضکہ۔ ہرکس بخیال خویش خبطے دارد۔

یہی حال انشا پردازوں کا ہے ہر شخص اپنے طرز کو سراہتا اور دوسرے کی روش کو ناقص سمجھتا ہے بعض اصحاب رنگین وشوخ عبارت کے دلدادہ ہیں اور بعض سادگی وعدم تصنع کو پسند کرتے ہیں بعض افراد پیچیدہ ترکیب مغلق الفاظ اور بڑے بڑے جملے استعمال کرنیکو کمال انشا پردازی خیال کرتے ہیں بعض اسکے خلاف ہیں۔ پھر باعتبار مضمون دیکھئے۔ افسانہ نویسوں کے نزدیک بہترین انشا پردازی افسانہ نویسی ہے۔ مورخین مضامین تاریخی کو پسند کرتے ہیں اور ارباب تحقیق وتدقیق علمی مضامین کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ ادبی مذاق رکھنے والے اصحاب ادبی رنگ کے سوا کسی چیز کو خاطر میں نہیں لاتے۔ بعض اصحاب کے نزدیک اردو کی خدمت اسی میں ہے کہ اسے عربی الفاظ اور فارسی تراکیب سے سرتاپا گراں بار کر دیا جائے بعض کہتے ہیں کہ نہیں حتی المقدور فارسی اور عربی کا کوئی لفظ استعمال نہ کرو۔ ادیبوں اور انشا پردازوں کا دعویٰ ہے کہ ادبی تنقید انکا ہی کام ہے نہ کہ مضامین جمع کرکے رسالہ مرتب کرنے والوں یا لڑکے پڑھانے والوں کا۔ ٹیچر اور اڈیٹر کہتے ہیں کہ آپ نے ادب اور انشا پردازی استاد کے فیض اور رسالوں کے مطالعہ سے نہیں سیکھی تو آخر کہاں سے حاصل کی۔ بچہ بڑا ہونے پر اگر اپنی نادانی سے والدین کا احسان بھول جائے تو یہ سعادتمندی اوسی کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے وہ دیکھنے والوں کے آنکھ میں دھول نہیں ڈال سکتا۔ بہرحال۔ کل حزب بما لدیھم فرحون۔

انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب کو دیکھئے کہ انمیں ہر ایک خود کو دوسروں پر کیونکر ترجیح دیتا ہے اگر کوئی ایف۔ اے پاس ہے اور دوسرا۔ بی۔ اے۔ آخر الذکر تو اپنے تئیں ترجیح دے ہی گا۔ لیکن ایف۔ اے پاس کو دیکھئے وہ کیا خیال کرتا ہے "گو اگرچہ میں ایف۔ اے ہی ہوں مگر

میری قابلیت بی۔ اے سے زیادہ یا یہ کہ میں ایف۔ اے فلاں یونیورسٹی کا اور وہ بی۔ اے فلاں تھرڈ کلاس یونیورسٹی کا" اگر دونوں بی۔ اے ہیں تو ہر ایک اپنی اپنی ترجیح کے لئے کوئی نہ کوئی وجہ ضرور پیدا کرلیگا۔ یعنے جس پہلو سے فرق ہوگا اسی پہلو کو باعث ترجیح قرار دیگا۔ مثلاً اگر ڈویزن کا فرق ہے تو ڈویزن کو اور اگر کالج و یونیورسٹی کا اختلاف ہے تو اس اختلاف کو۔ اور نہیں تو اسی کو کہ ہم پرانے زمانہ کے گریجوٹ ہیں اس کے مقابلہ میں جدید گریجوٹ کہتے ہیں کہ معیار تعلیم روز بروز بڑھ رہا ہے اس لئے ہمیں فوقیت ہے اگر اتفاق سے دونوں سب باتوں میں برابر ہیں۔ مثلاً ایک کالج سے۔ ایک ہی سال۔ ایک ہی ڈویزن میں۔ اور ایک ہی قسم کے مضامین لیکر بی۔ اے پاس ہوئے ہیں۔ تب بھی اپنے فرضی وخیالی فرق کے بنا پر ترجیح کے اسباب پیدا کرلینگے۔ مثلاً ایک خیال کریگا کہ میں ذہین ہوں اور دوسرے نے کتابیں رٹ کر امتحان پاس کیا ہے۔ دوسرا خیال کریگا کہ میاں اتفاق سے پاس ہوگئے۔ پڑھا وڑھا خاک نہ تھا۔ غرضکہ ہر کس بخیال خویش خبطے دارد۔

ایک شخص قومی کاموں میں دلچسپی لیتا ہے تو وہ دوسروں کو نام رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ لوگوں میں حس باقی نہ رہا مگر دوسرے لوگ خیال کرتے ہیں کہ اسے مالیخولیا ہوگیا ہے کہ قوم کی خدمت کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ میاں قوم کی کیسی خدمت۔ اپنا کوئی خاص مطلب ہوگا۔ ورنہ وہ اور قومی خدمت۔ استغفر اللہ۔ حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری کی طبابت اور ڈاکٹری نہ چلی تو مریض قوم کی طرف متوجہ ہوگئے۔ مولانا محمد علی۔ شوکت علی اگر قوم کے روپیہ کو بیدردی سے اپنی ضروریات پر خرچ نہیں کرسکتے تو فرسٹ کلاس میں کیونکر سفر کرسکتے ہیں۔ غرضکہ کل حزب بما لدیھم فرحون۔

---

مگر با ایں ہمہ اگر بنظر غور بہ نگاہ تجسس دیکھا جائے اور رشتۂ انصاف کو ہاتھ سے

نہ چھوڑا جائے تو روز روشن کی طرح ظاہر ہوجائیگا کہ بعض صورتیں تو ایسی ہیں کہ دونوں طرف کو بُرا نہیں کہا جاسکتا۔ ہر چیز اپنی جگہہ پر اچھی ہے۔ مثلاً تجارت۔ زراعت۔ صناعت و ملازمت وغیرہ ذرائع کسب معاش سب اپنی اپنی جگہ بہتر ہیں۔ مگر جو باتیں متضاد ہیں ان میں ایک صورت ہی صحیح ہوسکتی ہے۔ مثلاً مذہبی ہونا یا غیر مذہبی۔ عالم ہونا یا جاہل۔ باکار ہونا یا بیکار۔ ایثار کا مادہ رکھنا یا استیثار کا۔ ان سب صورتوں میں صرف ایک صورت صحیح ہوسکتی ہے اور دوسری غلط۔ رہا یہ کہ کیونکر معلوم کیا جائے کہ کونسی صورت صحیح ہے اور کونسی غلط۔ یہہ معلوم کرنے کے لئے انسان کو عقل دی گئی ہے۔ جس کے ذریعہ سے ہم صواب و غلط۔ حق و باطل جائز و ناجائز میں فرق کرتے ہیں۔ یہہ سچ ہے کہ ہر شخص کی عقل اس پایہ کی نہیں ہوتی مگر جب سے بنی نوع انسانی قائم ہے اوسکے دماغی و عقلی نتائج کا ذخیرہ ہمارے پاس مختلف شکلوں میں موجود ہے۔ ہر چیز کو ان نتائج سے پرکھکر معلوم کرسکتے ہیں کہ درحقیقت کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ جو لوگ سمجھ بوجھ ہی نہیں رکھتے۔ یا تعصب اور خود بینی کے باعث بصیرت و بصارت سے محروم ہوجاتے ہیں وہ کچھہ نہیں سمجھتے۔ سمجھنا کیا معنے۔ گمراہ ہوکر غلط راستہ اختیار کرلیتے۔ اور اپنی حماقت سے خود کو راہ راست پر خیال کرتے ہیں۔

انسان کا فرض ہے کہ جو کچھہ وہ کرے۔ اسپر بغیر رو رعایت کے ناطرفدارانہ و منصفانہ تنقیدی نظر ڈالے اور خیال کرے کہ جو کچھہ میں کر رہا ہوں صحیح ہے یا غلط۔ عام مسلمات زمانہ کے مطابق ہے یا نہیں۔ کہانتک مذہب کے خلاف جارہا ہوں۔ پھر جب وہ اپنے تئیں جادۂ صواب سے دور پائے تو فوراً تلافی مافات کی طرف توجہ کرے۔ انسان برائی کو اپنے فہم کے مطابق نیکی سمجھکر اصرار کرتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ جو کچھہ وہ کرتا ہے ٹھیک ہے۔ اور دوسرے اگرچہ نیک کام ہی کیوں نہ کر رہے ہوں۔ مگر چونکہ اسکی طبیعت کے خلاف ہے اس لئے وہ برا ہی کر رہے ہیں۔ تاوقتیکہ ہماری یہ عادت قبیحہ نہ بدلے گی ہم کچھہ ترقی نہیں

کر سکتے۔ ہمیں غور وفکر کا مادہ پیدا کرنا چاہیئے۔ اور مشاہدہ کی عادت ڈالنی چاہیئے۔ بلا وجہ معقول اپنے رائے اور رویہ پر اصرار کرنا ہٹ دھرمی ہے۔ جو انسان کے مرتبہ سے کہیں پست تر ہے۔ دوسروں کی عیب بینی ونکتہ چینی آسان مگر اس سے کیا فائدہ کہ اپنی آنکھ کا تو شہتیر بھی نظر نہ آئے اور دوسرے کی آنکھ کا تنکا بھی محسوس ہو جائے۔ وما توفیقی الا باالله العظیم۔

زبیدا حمد

# مالی

## رگذشتہ سے پیوستہ

## ۵

میں بے چین ہوں، میں دور کی چیزوں کے لئے مر رہا ہوں۔ موہوم فاصلہ کے دامن کو بوسہ دینے کے لئے میری روح بیتاب ہے۔

اے دور والی بزرگ ہستی! آہ تیری بانسری کی دلکش آواز میں بھول جاتا ہوں کہ میں پر پرواز نہیں رکھتا اور یہ کہ میں ہمیشہ کے لئے اس جگہ مقید کر دیا گیا ہوں۔

---

میں مشتاق ہوں وخبردار ہوں، میں ایک نئے ملک میں اجنبی ہوں۔

تیری سانس میرے دل میں ایک موہوم امید پیدا کر دیتی ہے۔
میرا دل تیری آواز سے اتنا ہی آشنا ہے جتنی کہ خود اپنی۔
میری روح بیتاب ہے! آہ تیری بانسری کی آواز!
میں بھول جاتا ہوں ہاں میں ہمیشہ بھول جاتا ہوں کہ نہ تو میں راستہ سے واقف ہوں اور نہ میرے پاس پردار گھوڑا ہے۔

---

میں بہت ہی کاہل ہوں، میں اپنے دل ہی دل میں گھلتا رہتا ہوں۔
بیکار گھڑیوں میں دھوپ کے دھندلکے میں مجھے تیرا جلوہ آسمان کے نیلگوں رنگ میں کیسا صاف نظر آتا ہے۔
اے انتہائی کنارے! آہ تیری بانسری کی دلکش آواز میں بھول جاتا ہوں ہاں ہمیشہ بھول جاتا ہوں کہ جس مکان میں میں تنہا مقیم ہوں اس کے دروازے بند ہیں۔

---

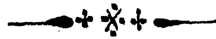
## ۵۶

پالو چڑیا قفس میں تھی اور آزاد چڑیا جنگل میں
جب وقت آیا تو دونوں ملیں۔ یہ نوشتہ تقدیر تھا۔
آزاد چڑیا نے کہا "اے میری پیاری آ، ہم دونوں جنگل میں اڑ چلیں"۔
قفس والی چڑیا نے کہا "آؤ ہم دونوں اسی قفس میں رہیں"۔
آزاد چڑیا نے کہا "قفس کے تیلیوں کے اندر اتنی گنجایش کہاں کہ کوئی پر پھیلا سکے"۔
قفس والی چڑیا نے جواب دیا "افسوس، فضا میں اڑ کر مجھے نہ معلوم ہوگا کہ میں کہاں بیٹھوں"۔

---

باقی آیندہ

# گوہر عصمت



گذشتہ سے پیوستہ

بابی - یہ لو سرکار آرہے ہیں - دیکھو خبردار ہنسنا نہیں -

مگر سرکار والاتبار اس سج دھج سے تشریف لائے کہ دیکھنے والوں کو بے اختیار ہنسی آہی گئی -

پیٹرڈین - کیا میں کچھ دیر میں پہونچا ہوں - (حسب معمول طرز گفتگو سے) شوربہ ؟ کیا تم نے ابھی شوربہ کا نام لیا تھا - ڈیسیا تم یہ سنکر خوش ہو گی کہ پتیلہ بالکل محفوظ ہے یہ پتیلہ مری آخری ایجاد ہے - یعنی ایک مخصوص اور "قابل نقل" برقی اثر کا بہترین ذریعہ اسکا مقصد اصلی یہ ہے کہ . . .

بابی - (سلسلہ گفتگو کو قطع کرنے کے لئے) - یہ لیجئے مچھلی حاضر ہے -

پیٹرڈین - مچھلی ؟ کیا تم نے ابھی مچھلی کا نام لیا تھا ؟ -

غرض سرکار نے اثناء طعام میں کئی بار اپنی زبردست ایجادوں کی مفصل گفتگو چھیڑی مگر بابی ہر بار مقراض سخن ہوتا رہا - کھانے کی ہر چیز ڈیسیا کی امید سے زیادہ خراب ثابت ہوئی - فارغ ہونے کے بعد پیٹرڈین صاحب نے اپنا چرٹ روشن کیا اور ٹہلنا شروع کیا - انکے ابرو عجیب طرز سے ہل رہے تھے گویا کہ وہ اپنے دل سے باتیں کر رہے تھے -

پیاری ڈیسیا - تم نے میری آخری مگر زبردست

تحقیقات کے متعلق کچھ سنا ہی ہوگا۔ یہ میری محنت
کا عمدہ بلکہ عمدہ سے بھی زیادہ اچھا پھل ہے۔
تمھیں معلوم ہوگا کہ برقی قوت کی اشاعت میں
صرف یہ بات رکاوٹ پیدا کرتی ہے کہ لوگ اُسے
"قابل نقل" صورت میں نہیں لا سکتے۔ میری ایجاد
نے اس مشکل کو آسان کر دیا ہے۔ میں تمھیں سمجھائے
دیتا ہوں" یہ کہکر بوڑھا موجد اپنی معصوم لڑکی
کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اسکا چہرہ محویت اور خوشی
کی تصویر بن گیا تھا اور انگلیاں لٹے ہوئے بالوں
میں بار بار پھرنے لگیں۔ قوت بیان اپنا پورا کام
کر رہی تھی اور سمجھ میں نہ آنے والے لغوی مصطلحات
اور مخصوص الفاظ کا دریا موجزن تھا۔ آخر کار
اُس نے چونک کر کہا۔ ڈیسما میرے ساتھ آؤ۔ میں
ذرا اور تفصیل سے سمجھا دوں۔ دعوت وحشت انگیز
تھی مگر دوشیزہ نے فطری ہمدردی سے متاثر ہو کر
والد کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدیا۔

ڈیسما۔ اچھے ابّا۔ مجھے ضرور سمجھا دیجئے۔ یہ
مضمون میرے لئے بہت دلچسپ ہے۔ میں اچھی
طرح سے سمجھ لینا چاہتی ہوں۔

سرکار۔ تم ضرور سمجھ لوگی۔ تمھیں اپنی ماں کا
حسن اور باپ کا فہم و ادراک وراثت میں ملا ہے
پیٹر ڈین اور بہن بھائی تینوں سرکار والے
[illegible] کمرہ میں داخل ہوئے۔ مختلف قسم کے تلون

اور عجیب وضع کے آلوں کی طرف بار بار اشارہ
کر کے فاضل موجد بہت دیر تک زبان فنّی میں سرگرم
تقریر رہا۔ مگر ڈیسما کی سمجھ میں ایک حرف بھی نہ آیا۔
آخر کے کچھ فقرے ناظرین کی تفریح طبع کے لئے
درج کئے جاتے ہیں۔

ڈیسما اس وسیع کمرے میں پوشیدہ خزانوں کی
کلیدیں موجود ہیں۔ ایسی انوکھی ایجادیں اور
اعلیٰ اختراعات ہیں جو مکمل ہو جانے کے بعد سیکڑوں
ہزاروں بلکہ کروروں کو بھی سستی ہونگی مجھے
دولت کی پرواہ نہیں ہے مگر میں تم دونوں کی آسائش
کی فکر میں جانفشانیاں کرتا ہوں۔ میری محنتوں کا
صلہ اتنا ہی کافی ہوگا کہ میں مرتے وقت اپنے
بچوں کو خوشحال چھوڑ جاؤں یہ کمرہ سونے کی کان
ہے مثلاً یہی ایک پتلہ یہ کہکر اپنے عجیب و غریب
پتلہ نما آلہ کو ہاتھ میں اُٹھا لیا۔

مشین کو حرکت دینا چاہا مگر کسی اندرونی خرابی
کی وجہ سے پرزے رُک گئے اور فاضل موجد نقص
کے دفع کرنے میں اتنا کچھ محو ہو گیا کہ اُسے اپنے
بچوں کی موجودگی یاد نہ رہ گئی۔

بابلی۔ (ڈیسما کے شانہ پر ہاتھ رکھ) چلو واپس
چلیں وہ پہروں کے لئے دنیاء تصور میں پہونچ گئے

واپس ہونے کے وقت روشندان سے ہوکر
پورے چاند کی کچھ دلفریب کرنیں سیڑھیوں پر

اپنا نظر نواز عکس ڈال رہی تھیں جسپر نگاہ پڑتے
ہی ڈیسما بے ساختہ کہنے لگی۔
"بابی کیا اس سہانی رات میں ہم لوگ تھوڑی
دور تک سیر کے لئے نہ چلیں گے؟
**بابی** ضرور چلیں گے اور دور تک چلیں گے۔
ڈیسما اپنے چاروں طرف نہایت دلچسپی سے
نگاہیں ڈال رہی تھی۔ اسٹریٹن ولڈ بہت خوشنما
قصبہ ہے یہاں کی شاہراہ صنوبر کے دو رویہ قطاروں
میں عجیب حسن سے ہوکر گذری ہے۔ اور آج کی
رات خمدار پتیوں کے قلعہ نما گچھوں سے نور کی موجیں
چھن کر فرش سبزہ کو دھوپ چھاؤں کی چادر بنا رہی
ہیں۔ ؎

گھنے پتوں سے چھن کر فرش پر جب چاندنی پہونچے
کہیں صبح وطن ہو اور کہیں شام غریباں ہو

نظارہ کی دیدہ نوازیاں اور سبک ہوا کی عنبر
بیزیاں اپنے شباب پر تھیں۔ دوشیزہ کی معصوم
طبیعت آپ سے آپ شگفتہ ہوئی جاتی تھی وہ سمجھ
رہی تھی کہ گویا خیالی پرستان کی سیر کر رہی ہے
اور موجودہ منظر کی طرح اس کی ہستی بھی موہوم ہے
ڈیسما اپنے امنگوں میں کھوئی ہوئی آگے کی طرف
بڑھی ہوئی چلی گئی۔ آخر کار سڑک کے داہنے
جانب کی ایک صاف و سفید عمارت نے اسکی توجہ
اپنی جانب مبذول کرلی۔ جسکے سڈول ستون حامے
آجلے تھے اور شاندار صدر دروازہ پر پیتل کی چمکدار
قلعی کی ہوئی تھی۔
**دوشیزہ** ۔ کیوں بابی یہ کونسی جگہ ہے۔
**نوجوان** ۔ یہ محل صنوبری کے داخلہ کا دروازہ
ہے۔ ایک نئے آدمی نے اس عمارت کی تعمیر کی ہے
مالک کا نام بھونڈر مرشن ہے اور بہ حیثیت آدمی
کہلایا جاتا ہے۔ عام طور سے خیال کیا جاتا ہے
کہ اسکے پاس بے اندازہ دولت موجود ہے۔ محل
صنوبری زنجباری طرز کا بنا ہوا ہے۔ ساری عمارت
بیداغ سفید پتھروں کی ہے۔ اور اندر سے اتنا
سجا ہوا ہے جیسے لندن کے بڑے قہوہ خانہ آراستہ
ہوتے ہیں۔
یہ کہکر دونوں اس عالیشان مکان کے سامنے
مڑ گئے۔ اور ڈیسما نے اپنے ایک سربفلک عمارت
کو چاندنی میں چمکتے ہوئے دیکھا۔
**ڈیسما** ۔ مکان تو نہایت بدقطع ہے؟۔ اور خود
مسٹر مرشن کس طرح کا انسان ہے۔
**بابی** ۔ ہلکے گندمی رنگ کا آدمی ہے۔ بلکہ رخسار
سیاہی مائل ہیں۔ شہریوں کی طرح ہوشیار ہے۔
جبتک وہ باتیں کرتا رہتا ہے اوسکی آنکھیں مخاطب
سے چار نہیں ہوتیں تاکہ کسی کو اوسکے خیالات کا
اندازہ نہ ہوسکے۔
**ڈیسما** ۔ کیا تم سے ملاقات ہے؟

بابی۔ ہاں میں اس عزت سے مشرف ہو چکا ہوں مگر پہلی ملاقات اچھی تھی انھوں نے دوستانہ برتاؤ نہیں کیا۔ کیونکہ ہمارا چھوٹا سا مکان انکے عالیشان محل کے سامنے جھوپڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم غریب ہیں اور مسٹر مرشن کے طبقہ والے انسانوں کی قدر، اونکی زبردست مکانوں اور بھری ہوئی تھیلیوں سے کرتے ہیں۔

ڈیسما۔ (ناداں بچوں کے لب ولہجہ میں) کیا واقعی! مگر کیوں بابی تمھاری غربت اور جائے رہائش کی کم حیثیتی۔ تمھارے پاکیزہ حالات اور عالی شان صنعات میں کیا کمی لاسکتی ہے۔

بابی۔ اس ذکر کو جانے دو۔ آؤ تمھیں اس سے زیادہ قابل دید مقام کی سیر کرائیں۔

دونوں ایک تنگ راستہ سے گذر کر اچانک ایک دلفریب سایہ دار گذرگاہ پر پہونچ گئے جسکی حفاظت آہنی دروازوں سے کی گئی تھی۔ دروازے سے تھوڑے ہی دور کے فاصلہ پر اندر کی طرف اینٹوں کا ایک ڈھیر تھا جسپر ہر طرف عشق پیچاں کی جالدار بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اور اُسکے سُرخ پردے چاندنی ہی کے ہمرنگ ہو کر چمک رہے تھے۔

ڈیسما۔ نہایت خوبصورت ہے۔

بابی۔ صدر دروازہ تو بند ہے مگر ٹھیرو! ذرا سے فاصلہ پر ایک دوسرا چھوٹا دروازہ ہے۔ میں تمھیں اُسکے ذریعہ سے گذرگاہ تک پہونچا دونگا۔ جہانسے تم خود عمارت کو باسانی دیکھ سکوگی۔

یہ کہکر نوجوان بھائی نے ایک چھوٹا سا چوبی دیواری دروازہ کھولا اور معہ اپنے بہن کے کائی جمی ہوئی پگڈنڈی سے اصلی گذرگاہ تک پہونچا۔ جس کے دونوں جانب صنوبر کے درختوں کی سلسلہ وار قطار اس شان سے تھی۔ جیسے کہ جانباز سپاہیوں کی دورویہ جماعت چپ چاپ کھڑی ہوئی راستہ کی باقاعدہ نگرانی کر رہی ہو اور یکایک ایک موڑ پر پہونچکر پورا مکان صاف صاف دکھائی دینے لگا۔

## باب ۶

یہ وسیع اور قدیم عمارت سرخ اینٹوں کی تھی۔ جو دست برد زمانہ سے سیاہ ہو گئی تھی اور اوس کے چاروں طرف عشق پیچاں اور رنگارنگ خودرو بیلوں کے نازک حاشیے ٹکے ہوئے تھے۔ درودیوار کی گہری سیاہی میں اکثر جگہ سنگ مرمر کے شفاف پتھروں کی جھلک عجیب لطف دے رہی تھی۔ اور خاصکر اوپر کے زینہ کی بے عیب سپیدی ضوافگن چاندنی میں تازہ آسمانی برف کی طرح چمک رہی تھی۔

بابی۔ کہئے کیسی عمارت ہے؟

ڈیسما۔ کیا کہنا نہایت ہی دلفریب ہے۔ بالکل تصویر معلوم ہوتی ہے۔

بابی - ہاں خوبصورت تو ضرور ہے۔

ڈوسیما - نہیں پیارے بابی یہ محض خوبصورت ہی نہیں ہے بلکہ جادو انگیز بھی ہے مگر یہاں ایسی گہری خاموشی کیوں چھائی ہوئی ہے؟ کھڑکیوں میں بالکل اندھیرا ہے اور خوبصورت دودکش سے دھواں بھی نہیں نکلتا۔ اس میں کون رہتا ہے۔

بابی - کوئی نہیں - آؤ اس نشست پر بیٹھ جائیں

ڈوسیما ٹرین صنوبر کے ایک سایہ دار درخت کے نیچے بنچ پر بیٹھ گئی اور اپنے ہاتھوں پر رُخساروں کا سہارا دیئے ہوئے آگے کی طرف جھک کر دیکھنے لگی

دوشیزہ - کوئی نہیں! یہ کیسی بات ہے؟ اور اسکا نام کیا ہے۔

بابی - لیف مُور۔

دوشیزہ - کیا ہی پیارا نام ہے۔ اور اسکا مالک کون ہے۔

بابی - یہ جگہ لارڈ جانٹ کی ملکیت ہے۔

دوشیزہ - (بیخودی میں) واہ کیا نرالا نام ہے۔

بابی - ہاں اور اسکی زندگی بھی نرالی ہے۔

دوشیزہ - کیا تم سے ملاقات ہے؟

بابی - میں نے ابھی نہیں دیکھا۔ اک زمانہ سے یہاں نہیں آئے۔

دوشیزہ - کیا عجیب بات ہے۔ خیال تو کرو کہ کوئی شخص ایسی دلفریب جگہ کا مالک ہو اور اس میں سکونت نہ اختیار کرے۔

بابی - ہاں بات تو تعجب خیز ہے مگر اوس کے قبضہ میں اس سے بھی زیادہ دلچسپ اور خوبصورت مقامات ہیں کیونکہ صاحب موصوف بے انتہا دولت والے مگر آزاد منش رئیس ہیں۔

دوشیزہ - کیسے آزاد منش - اُنکا شغل کیا ہے۔

بابی - میں اچھی طرح سے واقف نہیں ہوں مگر ایک بات تو یہ ہے کہ وہ زبردست سیّاح ہیں - وہی ہیں جنھوں نے جائن جبیں کا پتہ لگایا ہے۔ یہ تحقیق جو بالآخر مہذب اقوام کے لئے نہایت مفید اور لاجواب چیز ٹھہری اُنھیں کی محنت کا نتیجہ تھی سیاحت کے معاملہ میں وہ شخص بالکل چھلاوہ ہے صبح کو کہیں شام کہیں غرض ہر جگہ موجود ہے۔ مگر دنیا والے اسکا نام عزت سے نہیں لیتے۔

دوشیزہ - (معصومیت سے) کیا تمھارا مطلب ہے کہ وہ بُرا آدمی ہے۔

بابی - جی ہاں - میرا تو یہی خیال ہے۔ وہ جواری ہے۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں ہے مگر اُس نے ایک مرتبہ زار روس کے بھتیجے سے ۵ ہزار پونڈ کی بازی جیتی یا ہاری تھی۔

دوشیزہ - یہ تو بہت بڑی رقم ہوئی - بیشک جوا بُری چیز ہے مگر اس معاملہ میں تو دونوں کی حالت یکساں تھی۔

بابی۔ درست مگر صرف یہی برائی نہیں بلکہ انھیں اور بھی بہت سی خرابیاں موجود ہیں۔

دوشیزہ۔ (نیچی نگاہوں سے) اور بہت سی خرابیوں سے کیا مطلب ہے۔

بابی۔ ہر طرح کی اگر نہیں۔ ہم ناانصاف نہ رہینگے وہ شراب خوار نہیں ہے۔

ڈسیما۔ ہاں یہ عادت نہایت تباہ کن ہوا کرتی ہے۔

بابی۔ ابھی دو تین ہی برس ہوئے ہیں کہ وہ ان تمام برائیوں میں مبتلا ہوا ہے ورنہ اس سے پہلے نہایت فرشتہ خصائل انسان تھا اس نے عنوان شباب ہی میں جائداد اور خطابات کی دولت حاصل کی اور اپنے فرائض قابل تقلید انداز سے برابر اہتمام دیتا رہا۔ مگر خدا جانے کیا ہوا کہ اچانک نہایت تیزی سے اس نے زبردست طریقہ سے اپنا وقار کم کرنا شروع کیا اور ابھی سے بے غرتی بڑھانا شروع کیا۔

ڈسیما۔ واقعی پیچیدہ باتیں ہیں مگر کیوں بابی کیا ہم مداخلت بیجا کے مجرم نہیں ہو رہے ہیں

بابی۔ ہرگز نہیں کیونکہ میں مسٹر برایٹ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ جو لارڈ صاحب کا کارندہ ہے۔

ڈسیما۔ وہ تو لارڈ صاحب کی عزت کرتا ہوگا

بابی۔ بہت کچھ جب میں قریب والی جھیل پر مچھلیوں کا شکار کیا کرتا ہوں تو اکثر اسکی زبان لارڈ صاحب کی تعریف میں گھنٹوں تک جاری رہتی ہے۔

ڈسیما۔ تو پھر ان میں کوئی نہ کوئی صفت ضرور ہوگی۔

بابی۔ ہاں برائٹ کا بیان ہے کہ لارڈ صاحب بڑے ستودہ صفات نوجوان تھے۔ مگر کسی پوشیدہ صدمہ کے بعد انکی یہ حالت ہوگئی ہے اور غالباً کوئی عورت اس پوشیدہ صدمہ کا راز ہے۔

اچھا اب اٹھئے اور واپس چلئے بہتر ہے کہ ہم لوگ ٹھیک وقت سے پہونچ جائیں ورنہ یقیناً سرکار بہادر سارے مکان کو نذر آتش فرمادینگے۔ انھوں نے علم جر ثقیل کے رو سے اجزاء اجسام رواں کو خاص طور سے ترتیب دیکر ایک ایسی عجیب قوت ایجاد فرمائی ہے جو آلات حرب سے کہیں زیادہ مہلک ہے اور اسکا سچا اثر دشمن کو چشم زدن میں خاک سیاہ کر دیتا ہے۔

بہن بھائی اُٹھے اور پہلے والے راستہ سے ہوتے ہوئے چوبی دروازے سے باہر آئے اور تھوڑی دور چلے تھے کہ یکایک ڈسیما نے ایک پستہ قد آدمی کو محل صنوبری کے دروازہ پر کھڑا ہوا پایا۔ ڈاڑھی منڈی ہوئی تھی اور چہرہ سے چالاکی و ہوشیاری ٹپک رہی تھی جیسے ہی دونوں قریب پہونچے مسٹر مرشن نے بابی کو پہچان کر سلام کے لئے نہایت غرور اور سرد مہری سے

ہاتھ اٹھایا۔ اتنے میں ڈسیما بھی سایہ سے نکل کر
چاندنی میں آئی اسکا جادو فریب حسن صاف صاف
دکھائی دیا۔ نگاہ پڑتے ہی اس کے انداز بدل گئے
اور اس نے دو تین قدم بڑھ کر بابی سے مصافحہ
کرنے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

مسٹر مرشن۔ مزاج شریف (مخاطب تو بابی
سے تھا مگر اسکی آنکھیں دوشیزہ کے جادو نگاہ
چہرہ پر جمی ہوئی تھیں) بابی نے بھی نہایت سرد مہری
سے جواب دیا اور آگے کو بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ
مسٹر مرشن نے ایک سوال کر کے اسے روک لیا

مسٹر مرشن۔ کیا آپ لوگ تفریح سے واپس آرہے ہیں:

ڈسیما نے محسوس کیا کہ اُس کی حسین آواز
میں بھی چہرہ کی طرح چستی و چالاکی موجود تھی۔

بابی۔ جی ہاں
یہ میری بہن ہے اور آپ مسٹر مرشن ہیں

مسٹر مرشن نے پھر سلام کیا اور کہنے لگا

مسٹر مرشن۔ میں انھیں جانتا ہی نہ تھا
میرا خیال تھا کہ شاید آپ کی کوئی ہمشیرہ نہیں ہیں

بابی۔ یہ آج ہی آئی ہیں

مسٹر مرشن (ڈسیما سے مخاطب ہو کر)
آپ تازہ وارد ہیں۔

ڈسیما۔ آج ہی شام کو آئی ہوں۔

مسٹر مرشن۔ ابھی تو آپ سے مقام کی پسندیدگی
کا سوال قبل از وقت ہوگا۔ مگر مجھے امید
ہے کہ آپ ضرور پسند فرمائینگی کیا آپ کسی غیر ملک
میں تھیں۔

ڈسیما۔ میری تربیت میری خالہ کے یہاں ہوئی
ہے اور خود ڈسیما کا لہجہ بھی اچھا نہ تھا کیونکہ متکلم
کی نگاہ یا چہرہ میں کوئی ایسی چیز ضرور تھی جس
سے اسکی پاکیزہ طبیعت پر برا اثر ہو رہا تھا۔

مسٹر مرشن خوب یاد آیا۔ بابی ڈین میں آپ
کے والد کو اور آپ کو کسی شب میں دعوت کے لئے تکلیف
دینے والا تھا

بابی۔ میرے والد کبھی گھر سے باہر کھانا کھاتے
ہی نہیں

مسٹر مرشن تو پھر آپ اور مس صاحبہ قدم رنجہ فرما کر
عزت بڑھا سکتے ہیں اگر آپ اجازت دیجئے تو میں
خود حاضر ہو کر تاریخ کا فیصلہ کر لوں۔

ڈسیما (اپنے سادہ انداز سے) شاید! بشرطیکہ
والد یا بھائی......

مسٹر مرشن۔ بہتر ہے کہ "ہاں" کہدیجئے اور تاریخ
اور تاریخ مقرر کر دیجئے کیوں بابی ڈین آمدہ سہ شنبہ
بالکل ٹھیک ہے؟ میں خود آ کر آپ کے والد کو بھی
شرکت کے لئے مجبور کرونگا۔

بابی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ دعوت دینے کا یہ
طریقہ غیر مہذب ہے اسکے چہرہ کا رنگ تبدیل

ہو گیا اور اس تبدیلی کو دیکھکر مرشن نے بھی اپنی غلطی محسوس کی اور اپنی نادانی پر فوراً ہی پشیمان ہو گیا۔

مسٹر مرشن۔ اچھا خدا حافظ میں بذریعہ تحریر اطلاع دونگا۔

اور حد سماعت سے دور ہوکر ڈسیما نے کہا

"واقعی عجیب و غریب انسان ہے۔

بابی۔ بے شک نہایت نامعقول ہے ہم لوگوں کو دعوت قبول کرنے کیلئے خواہ مخواہ مجبور کر رہا تھا۔

ڈسیما۔ کیا ہم لوگوں کو جانا چاہیے۔

بابی۔ نہیں۔ مگر کیا تم پسند کروگی؟

ڈسیما۔ ہرگز نہیں میں کیوں پسند کرنے لگی

بابی۔ مگر یہ مذاق اچھا خاصا مذاق ہوگا۔ خیر دیکھیں تو سہی کہ دعوت کس ٹھاٹھ کی ہوتی ہے۔ ہم لوگ تو مکان پر پہونچگئے۔ میں اپنے کمرے میں جاتا ہوں تم اپنی خوابگاہ میں جاکر آرام کرو۔

ڈسیما۔ فوراً ہی اپنے کمرے میں پہونچی اور مسہری پر لیٹتے ہی جوانی کی گہری نیند سوگئی اور صبح کو بیدار ہوئی تو بالکل گلاب کے تازہ پھول کیطرح سرسبز و شاداب تھی۔

## باب ۷

پیچھے نگاہیں کوئی بے اختیار اٹھادے
دلچسپ آج اے دل اتنی تو داستان ہو

ڈسیما نے اپنی صبح کا کچھ حصّہ خالی الذہن موجد کے کمرے میں گذارا اور کچھ دیر ماما اور سارا جین سے باتیں کرتی رہی۔ اسکے بعد ایک طویل خط اپنی پیاری خالہ پالائن کو لکھا اور آخرکار سوا چار بجے حسب وعدہ اس دروازہ پر پہونچی۔ جہاں سے ہوکر بہن بھائی گذشتہ شب "لیف مورا دنیو" تک پہونچے تھے۔

جھیل کے کنارے نوجوان بھائی اپنی بہن کا منتظر تھا۔ اسکے ہاتھوں میں بنسی تھی اور لبوں میں سگرٹ

بابی۔ مگر اسکا خیال رکھئے گا کہ میں سخت محنت میں مصروف ہوں

آیئے بیٹھ جایئے

ڈسیما اپنے بھائی کے پہلو میں بیٹھ گئی اور چند لمحوں تک "فلائی بک" کے کچھ اوراق دلچسپی سے دیکھتی رہی اس کے بعد اٹھی اور "ادیو" سے گذر کر دیوار کے قریب وحشی پھولوں کو چننے میں محو ہوگئی۔

بابی۔ کی آنکھیں نیم وا اور وہ لیٹا ہوا استراحت آمیز شکار کے مزے لے رہا تھا کہ یکایک سنسناہٹ کی آواز نے چونکا دیا۔ اس نے نظر اٹھائی اور ایک شریف جوان کو دیکھا کہ آہنی دروازہ زور سے ہلا رہا ہے۔

بابی۔ ہی اہی!! پھاٹک تو مقفل ہے مگر آپ (انگلی سے اشارہ کرکے) اس چوبی دروازہ سے اندر آسکتے ہیں۔

"شکریہ" یہ کہکر معزز جوان بتاتے ہوئے دروازہ سے اندر آیا اور بتانے والے کے پہلو میں آکر کھڑا ہو گیا۔

**بابی۔** پھاٹک تو ہمیشہ مقفّل رہتا ہے۔

**معزز جوان۔** مجھے اجنبی ہونے کی وجہ سے معلوم نہ تھا۔

**بابی۔** کیا آپ مکان کو دیکھنے کے لئے تشریف لائے ہیں واقعی ہر حصہ قابل دید ہے اور خصوصاً تصویر خانہ۔

**معزز نوجوان۔** کیا اس مکان میں آپ ہی رہتے ہیں۔؟

**بابی۔** جی نہیں میں تو نہیں رہتا مگر اس مکان کے گوشہ گوشہ سے واقف ضرور ہوں

**اجنبی۔** غالباً آپ "سٹرادٹ" پر قسمت آزمائی کرنا چاہتے ہیں۔ ذرا اپنی کتاب مجھے بھی دکھائے کیونکہ میں بھی شکاری ہوں۔

**بابی۔** نے اپنی "فلائی بک" جلدی سے دیدی اور ڈسیما کو پگڈنڈی پر بلانے کے لئے زور سے سیٹی بجاتا ہوا اپنے راستہ پر چلا گیا۔

بابی کے چلے جانے کے بعد معزز نوجوان ہال پر بیٹھ گیا اور اس نے ایک خوشبودار سگریٹ روشن کر لیا۔ ابھی سلائی جل ہی رہی تھی کہ ڈسیما عجیب و غریب انداز سے آتی ہوئی دکھائی دی اور اجنبی کی یاس انگیز آنکھیں ۔ ۔ ۔ ۔ بے زبانی سے کہنے لگیں۔

خرام ناز اتنا تو ہو دلکش
لپٹ جائیں نگاہیں نقش پا سے

دوشیزہ اپنے پھولوں کو سجانے میں مصروف تھی۔ بالکل قریب پہونچکر اس نے اجنبی کو حیرت آمیز نگاہوں سے دیکھا اور آگے بڑھنے ہی کو تھی کہ معزز جوان نے جھک کر تعظیمی سلام کیا یکایک ڈسیما بھی کھڑی ہو گئی اور اسکے نازک لبوں سے بے اختیار ایک خفیف سا نعرۂ حیرت نکل گیا۔ کیونکہ اس نے عجائب خانہ والے قوی اور معزز شریف جوان کو پہچان لیا۔ اجنبی نے پہلے ہی نگاہ میں پہچان لیا تھا مگر وہ منتظر رہا کہ دوسری طرف سے کیا سلوک ہوتا ہے۔ ڈسیما کے رخسار پر ایک ہلکی سی سرخی اور آنکھوں میں چھوتی روشنی جلوہ گر رہی مگر وہ ان دونوں باتوں سے چشم پوشی کرتے ہوئے آگے بڑھ گئی لارڈ جانٹاشیر دل سپاہیوں کی طرح سیدھا کھڑا ہوا مسکرا رہا تھا۔ گویا کہ ایسے دانستہ وارنے بجائے گھائل کرنے کے اوسے اور بھی محظوظ کیا تھا۔

ڈسیما پہلے کی طرح اپنے چنے ہوئے پھولوں کو درست کرتی ہوئی راستہ سے گذر رہی تھی اوسکا خوبصورت چہرہ بے حد سنجیدہ تھا۔ لیکن شاید اُس

نازک موقع پر نازک انگلیاں کنپ رہی تھی۔ کیونکہ
اس نے ایک ایسے شخص کو ہدف تغافل کیا تھا
جو گلاب باڑی میں اسپر احسان کرچکا تھا۔ اسی
وجہ سے بہت سے پھول کف سیمیں سے سرک کر
زمین کی گود میں جارہے ہے - دوشیزہ رک گئی اور
ترشے ہوئے لبوں کو خوشنما دانتوں نے ہلکے ہلکے
داب کر گرے ہوئے پھولوں کو اٹھانے لگی
اجنبی نے بھی آگے بڑھکر قابل قدر مدد دی۔

معزز آدمی نے زرد کلیاں نذر کرتے ہوئے
نہایت سنجیدگی سے پوچھا "کیا آپ مجھے بھول
گئیں"

ڈسیما۔ نہیں (اور خوشنما چہرہ کے رگوں
میں لہو تیزی کے ساتھ دوڑ گیا)

شریف جوان۔ نہیں بھولیں! پھر اس
سلوک کی کیا وجہ تھی۔

ڈسیما (ادھر ادھر شرمیلی نگاہوں سے دیکھکر)
میں۔ میں۔ نہیں بتا سکتی۔

شریف جوان۔ مگر معاف فرمائیے۔ مجھے
آپ سے پوچھنے کا حق حاصل ہے یوں سمجھئے کہ اگر
خود آپ سے میں نے یہی سلوک کیا ہوتا تو کیا آپ
مجھ سے سبب نہ دریافت کرتیں۔

ڈسیما۔ ہاں کیوں نہیں (لفظ سا ہو کھنچ گئے
اور دو گسی آنکھوں کا حسن دوبالا ہو گیا)

شریف جوان (رحم خیز لب و لہجہ میں) آپ جس
بات کی وہ سردوں سے متوقع ہیں دوسرے بھی آپ
سے اس بات کے امیدوار ہونگے۔

ڈسیما۔ (بے چین آواز میں) تو کیا مجھے بتانا
ہی ہوگا۔

شریف جوان۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں

ڈسیما۔ میری خالہ (اُف کاش کہ آپ نے مجھ
سے نہ پوچھا ہوتا) نہیں چاہتیں کہ میں آپ کی واقف
بنوں

ش۔ ہاں ایسے سلوک کے لئے یہ وجہ بہت کافی
ہے مگر میں انکے حکم کا سبب دریافت کرنا چاہتا ہوں

ڈسیما۔ کیونکہ آپ (اب میں نہیں کہہ سکتی اور
وہ گلے تک سرخ ہو رہی تھی)

ش۔ یعنی میں آپ جیسی حور خصلت کے مقابلہ
نہایت بُرا انسان ہوں۔

ڈسیما نے اپنا سر جھکا لیا۔

ش۔ شکریہ میں نے خاصہ جواب پالیا۔ اچھا خدا
حافظ۔

ڈسیما مڑکر چند ہی قدم گئی تھی کہ پھر واپس ہوئی
(اور اسکی پاکیزہ روح روشن آنکھوں میں جھلک رہی
تھی۔)

ڈ۔ آخر آپ ایسے بُرے کیوں ہیں؟ (لہجہ نہایت
درد انگیز تھا اور الفاظ بمشکل ادا ہو رہے تھے)

آپ میرے ساتھ تو نہایت مہربانی سے پیش آئے تھے۔

**ش**۔ اس کا جواب نہایت طول طویل ہے اچھا ایک لمحہ ٹھہرئے میں فیصلہ کروں کہ آیا آپ کو بتانا مناسب ہے یا نہیں۔

## باب ۸

آلہی خوش رہیں وہ جو ہمیں دیوانہ کہتے ہیں

**دوشیزہ** کی معصوم آنکھیں سوچنے والے کے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں اور انہیں بے چین صبر جلوہ فزا تھا۔

**شریف جوان**۔ میں آپ کو سب کچھ تو نہیں بتا سکتا مگر اپنے صفائی کے خیال سے کچھ لفظیں ضرور عرض کرونگا۔ کیونکہ ہر مجرم سزا پانے کے پہلے جج کے سامنے صفائی پیش کر سکتا ہے۔

**دوشیزہ** (اقراری لہجہ میں) ہاں۔

**شریف جوان**۔ بہتر تو پھر ہم لوگ بیٹھ جائیں اور اس خاموش ساحل کو ایوان عدالت تصور کریں۔

**ڈ**۔ بھیا میرا انتظار کرتے ہونگے۔

**ش ج**۔ وہ بھولا فرشتہ آپ کو بالکل بھول چکا ہوگا۔ آج سے پہلے بھی ہم لوگ ایک ساتھ بیٹھ چکے ہیں اور غالباً گذشتہ موقع پر کسی کو کوئی مضرت نہیں پہونچی۔

ڈسیما ریتلے فرش پر رونق افروز ہوگئی اور جوان بھی تھوڑے فاصلے سے بیٹھ گیا اور خالی الذہن ہوکر عالم تصور میں محسوس کیا کہ سامنے والی دوشیزہ سفید و شفاف پیراہن میں ملبوس ہے اور گویا سارے کپڑوں میں صرف ماشی رنگ کا غنچہ نما گلوبند ایک رنگین چیز ہے۔ گلوبند سے نظر اوٹھتے ہی اسکی آنکھیں کسیکی سرگین آنکھوں سے چار ہوگئیں جنکا فطری گہرا رنگ اسوقت جادو آفرینی کر رہا تھا شباب کی دلفریبیوں سے کہیں زیادہ چہرہ کی نرمی و نزاکت نے اسے بے چین کر دیا۔ دوشیزہ کی سچی معصومیت اور اچھوتی پاک باطنی غضب کی موثر تھی ان باتوں سے متاثر ہوکر اسنے کہنا شروع کیا۔

**ش جوان**۔ غالباً آپ کی خالہ لیڈی بالائن نے آپ کو میری برائیاں بتائی ہیں۔

**ڈ**۔ ہاں۔

**ش ج**۔ کیا انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ میں کن خطاؤں کا مجرم ہوں۔

ڈسیما نے اشارے سے نفی کا جواب دیا

**ش ج** لیڈی بالائن نہایت ہی مذہب پرست خاتون ہیں کیا وہ نہیں ہیں

**ڈ**۔ ہاں وہ نہایت نیک بلکہ مجسم نیکی ہیں''

**ش ج**۔ میں نے بھی یہی سنا ہے۔ اب میرا خیال یہ ہے کہ لیڈی بالائن کی جیسی نیک خواتین ایسی

ہستیوں کو جو کم نیک ہوں زبردست مجرموں کی طرح خیال کرتی ہونگی۔

ڈ۔ نہیں میری خالہ......اتنا ہی کہکر چپ ہو گئی۔

ش ج۔ آپ نہیں کہنا چاہتی ہیں مگر اقرار کرنے کو فطرتاً مجبور ہیں تو کیا لیڈی پالائن کی ایسے عیش پرست انسان کو جسکی زندگی کا مقصد صرف لہو لعب رہ گیا ہو، کیا کچھ نہ سمجھیں گی انکی نگاہوں میں اسکی ہستی دنیا کی سوسائٹی کا مجرم اور پشت زمین کا بوجھ ہوگی اور انکے پاکیزہ خیال سے ایسا انسان اس مصروف دنیا میں زندہ رہنے کا مستحق نہوگا۔

ڈسیما۔(بے دلی سے) ہاں

ش ج۔ اور ایسے عیش طلب کے لئے لیڈی پالائن سخت سے سخت لفظین استعمال فرمائینگی مثلاً اگر کوئی شخص تاش کے پتے تفریحاً کھیلتا ہو تو خاتون موصوفہ اسے جواڑی یا قمار پرست انسان سے تعبیر کرینگی

ش ج۔ اگر وہ شخص رقص و سرود کی محفلوں میں شریک ہوتا ہو تو موصوفہ اسے دنیا پرست اور نفس امارہ کا پیرو فرمائین گی۔

ڈسیما۔ ہاں۔

ش ج۔ تو پھر مجھے افسوس ہے کہ لیڈی صاحبہ کے نقطہ نگاہ سے میں نہایت بڑا انسان ہونگا شرف رکھتا ہوں مگر مس ڈین......

وہ اس خیال سے رک گیا کہ آیا ایسی شیرین صورت معصوم جج کے سامنے اسے اپنی صفائی دینا چاہئے یا نہیں

ڈسیما۔ آپ اور آگے کیوں نہیں کہتے؟

ش ج۔ میں معافی چاہتا ہوں (خفیف سا چونک کر) گویا کہ سلسلہ خیال ٹوٹ گیا ہو، میں بعض وقت خود ایسے خیالات میں کھوجایا کرتا ہوں۔ ہاں میں یہ کہنے جا رہا تھا کہ ایسے شخص کے لئے کوئی کام کرنا ناممکن سا ہے جس نے کبھی کچھ سیکھا ہی نہ ہو۔ اور میری حالت بالکل یہی ہے۔ بدقسمتی سے میرے والدین اور مربیوں نے میری تعلیم و تربیت کے متعلق ہمیشہ لاپرواہی برتی نہ مجھے دماغی تعلیم دی گئی نہ دستکاری سکھائی گئی۔ نہ تو میں بول سکتا ہوں نہ کاٹ سکتا ہوں میں اتنا بھی نہیں پیدا کر سکتا جو ایک کم قیمت جام شراب کے لئے کافی ہو سکے یہ بات قابل افسوس ضرور ہے مگر کیا کیا جائے میں محض آرام طلبی کر سکتا ہوں مگر وہ بھی ہمیشہ نہیں بلکہ (آہ سرد بھر کر) شاذ و نادر (اسکے لبوں اور آنکھوں سے تبسم کا اظہار ہو رہا تھا مگر اسمیں درد و غم کی جھلک صاف نمایاں تھی) مجھے صرف اسی قدر عرض کرنا تھا اور یہ ظاہر کر دینا تھا کہ مجھ سے آپکا یہ سلوک کس قدر نامناسب تھا۔

ش ج۔ مجھے اقرار ہے کہ میں نہایت "برا ہوں" اور آپ فرشتہ خصلت ہیں۔

ڈیسیما۔ حقیقتاً کوئی بھی فرشتہ خصلت نہیں ہے۔

ش ج۔ اچھا خیر مگر مس صاحبہ کیا آپ کے خیال میں "برے" انسان کے لئے کوئی امید نہیں ہے کیا آپ کی رائے میں بدکار انسان کبھی نیکوکار نہیں ہو سکتا۔

ڈیسیما۔ (یہ الفاظ اوس کے کلیجے سے پار ہو گئے) نہیں نہیں امید تو ہمیشہ ہے اور اصلاح ہر حالت میں ممکن ہے۔

ش ج۔ اور کیا آپ کے خیال میں نیکوکار ہستیوں کا یہ فرض نہیں ہے کہ بھٹکے ہوؤں کو صحیح راستہ دکھائیں شاید بدقسمت بدکار نادانستہ راستہ بھول گئے ہوں اور کسی کا مددگار و رہنما ہاتھ انھیں راہ مستقیم پر واپس لاوے۔ کیا آپکی رائے میں نیک اصحاب کا صرف یہی فرض ہے کہ وہ بدکاروں کو دور سے کھڑے ہوئے گمراہی کے وسیع میدانوں میں سرگرداں دیکھیں اور اس کج مج راہ میں چلنے سے نہ روکیں جبکا سرا طبقہ جہنم تک پہونچا ہے۔

ڈیسیما۔ (آہستہ سے مگر کسیقدر غصّہ سے) میں نے اسکے متعلق کبھی غور نہیں کیا۔

ش ج۔ میرا بھی یہی شبہ تھا مگر اس شان کی آپ اکیلی ہی نہیں ہیں بلکہ بہتیرے نیک نفس حضرات اپنے وہم میں گمراہوں سے ہمیشہ کے لئے مایوس ہو جاتے ہیں

ڈیسیما۔ (نسوانی ہمدردی سے متاثر ہو کر) نہیں نہیں یہ بات ہرگز نہیں۔

ش ج۔ شکر ہے آپ اس طبقہ میں نہیں ہیں اور پھر ممکن ہے کہ وہ بدکار شخص اتنا برا نہو۔ کیونکہ لیڈی یالائن جیسی نیکی مجسم ہستیاں مبالغہ پسند ہوتی ہیں میں اتنا برا نہیں جتنا بدنام ہوں۔ اور آپ میرے ساتھ اتنا بڑا اسلوک نہ کیا کریں جبکا میں واقعی مستحق نہیں ہوں کون جانتا ہے کہ اگر آپ کو میری زندگی در دبھری کہانی معلوم ہوتی تو...... (وہ چپ ہو کر اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔ وہ اپنے آخری الفاظ کو واپس لینا چاہتا تھا مگر ڈیسیما اوسکی طرف منتظرانہ انداز سے دیکھ رہی تھی) ہاں میں یہ کہہ رہا تھا کہ مجرم اپنی صفائی پیش کر چکا اور اسکی استدعا ہے کہ تجاہل عارفانہ ایسی سخت سزائیں آیندہ سے خاص تخفیف کی جائے۔

## باب ۹

دوشیزہ۔ اب میں آیندہ آپ سے کبھی آنکھیں نہ چراؤنگی۔

اجنبی۔ اور بہت ممکن ہے کہ اس عنایت

کا موقع ہی نہ آئے کیونکہ ہم لوگ اگر ہمیشہ کے لئے
نہیں توکم سے کم ایک زمانہ کے لئے جدا ہو رہے
ہیں۔

دوشیزہ۔ کیا آپ کہیں باہر جا رہے ہیں؛
کیا آپ یہاں کہیں قریب نہیں رہتے؛

آخری سوال سے دانستہ انجان بنکر
شریف جوان۔ میں ایک عرصہ کے لئے
دور دراز ممالک میں جا رہا ہوں۔

ڈیسیما۔ یہ سفر تو نہایت نفیس ہوگا کہنے کو
کہہ تو دیا مگر ڈیسیما نے اپنے دلمیں ایک پوشیدہ بےچینی
محسوس کی کیونکہ مخاطب نے عجائب خانہ میں اس
پر بڑی مہربانیاں کیں تھیں اور اسوقت بھی اُسے
نہایت موثر پیرایہ میں اپنی صفائی پیش کی تھی۔

شریف جوان۔ نفیس؟ ہاں ہاں ضرور
ہوگا میں کہہ سکتا ہوں کہ آپ اس سے خوب محظوظ
ہوتیں۔

ڈیسیما (سوالیہ انداز سے) اور کیا آپ نہ ہونگے؟
شریف جوان۔ اتنا نہیں کیونکہ بہت سی
چیزوں کی طرح میرا جی اب سیاحت سے بھی بھر
چکا ہے مجھے اسکی وجہ خود معلوم نہیں مگر میں اچھا
خاصہ خود سستا بنگیا ہوں کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ آپ
یہاں کیسے آگئیں۔

ڈیسیما۔ زمین سے اٹھکر صنوبروں والے
راستہ سے جھیل کیطرف (جواب دیتے ہوئے)
روانہ ہوگئی۔ دفعتاً میرے والد نے مجھے بلا بھیجا
ہمارا چھوٹا سا خوبصورت مکان وڈنا پس شاہراہ
کے کنارے ہی ہے جو ہر موسم میں سدا بہار عشق
پیچاں سے ڈھکا رہتا ہے اور اسکے سامنے پرانی
وضع کا ایک پائیں باغ ہے۔ شاید آپ اسی طرف
سے گذرے بھی ہوں۔

شریف جوان۔ میں نے دیکھا ہے۔ مکان
واقعی خوبصورت ہے۔

دونوں پہلو بہ پہلو چلتے رہے اور محل لیف مور کے
متعلق باتیں کرتے ہوئے پگڈنڈی سے گذر کر چھوٹی
سی پہاڑی کے ڈھلوان تاج نما چوٹی تک پہونچ
گئے۔ جسکی وادی میں نوجوان بانی مچھلیوں کے
شکار میں بالکل غرقاب تھا اور بیتاب لہروں کو اپنی
بے خودی سے اور زیادہ بےچین کر رہا تھا۔

شریف جوان۔ اترنے کے وقت ذرا ہوشیار
رہئیگا۔ یہ پہاڑی اندازہ سے زیادہ ڈھلوان ہے
کم اگی ہوئی گھاس پھسل جانے کے لئے کافی ہے
جی چاہے تو میرے شانہ پر سہارا دے لیجے

ڈیسیما۔ جی نہیں آپ کا شکریہ۔ میں آسانی
سے اتر جاؤنگی اور گرنے کا خدشہ بھی نہیں ہے

ڈیسیما نے اترنا شروع کیا اس کے قدم سبک
تھے مگر مضبوط۔ یکایک اسکے پاؤں کے نیچے سے ایک

پتھر کا ٹکڑا لڑھک گیا اور وہ ڈگمگا کر گرنے لگی مگر
اجنبی عین وقت پر پہونچ چکا تھا اور اسکے مضبوط
ہاتھوں نے دوشیزہ کو شانہ سے پکڑ کر گرنے سے
بچا لیا۔ ڈیسیما ایسی نادان لڑکیوں کی طرح اطمینان
سے مسکرا رہی تھی جو اپنے دل کے آپ مالک
ہوں اور جنکی رگوں میں کسی مرد کے ہاتھوں سے
مَس ہونیکے وقت برقی اثر نہ دوڑتا ہو

**دوشیزہ۔** یہ میرے شیخی بگھارنے کی سزا
ہے میں قریب گر ہی چکی تھی۔

مسکراتے ہوئے خوبصورت چہرہ کی طرف
وہ خود بھی مسکرا اٹھا۔

**شریف جوان۔** بہتر ہے کہ میرے شانہ
تھام لیجئے۔

**ڈیسیما۔** جی نہیں میں ابھی دوڑ کر اُتری جاتی
ہوں اور اجنبی کی گرفت سے چھٹتے ہی وہ
تیزی سے اترنے لگی

**دوشیزہ۔** واہ بابی کیا تم لارڈ جانٹ کی
ساری مچھلیاں شکار کر لوگے۔

**بابی۔** (بغیر کسی طرف دیکھے ہوئے)
ہش چپ ایسی تیزی سے نہ بولو نہیں تو جھیل
کی ساری مچھلیاں چوکنا ہو جائینگی۔ لڑکیاں بھی
عجیب خوفناک اور نادان ہستیاں ہوتی ہیں زد
سے دور رہو ورنہ پانی میں پھینکتے وقت نوکیلی کٹیا
تمہارے لباس یا بالوں میں الجھ کر رہ جائیگی۔

**شریف جوان** (ٹوکری کو کھولکر) کچھ ہاتھ آیا

**بابی۔** بہت کچھ مگر سب چھوٹی چھوٹی ہیں
وہ دیکھئے سامنے کی جھاڑی میں ایک بڑا ٹراوٹ
موجود ہے۔ میں دس منٹ سے اسکی فکر میں ہوں
مگر ابھی تک نہیں ملا۔

**اجنبی۔** آپ وہاں تک پہونچتے ہی نہیں

**بابی۔** جی ہاں یہی بات ہے کٹیا بالکل سیدھی
جاتی ہے مگر مچھلی سے ایک گز ادھر گرتی ہے۔ لیجئے
آپ تو کوشش کیجئے۔ اجنبی نے ایک منٹ بات
کرنے کے بعد ہاتھ میں چھڑ لیکر بنسی پانی میں پھینکی

**اجنبی** لیجئے۔ وہاں تک تو پہونچ گئی دیکھئے مچھلی
بھی صاف دکھائی دے رہی ہے

**بابی** (جوش انگیز خوشی سے) اور وہ پھنس
بھی گئی واہ کیا اعلےٰ درجہ کا نشانہ تھا۔ اجنبی نے
بنسی واپس دینا چاہا مگر نوجوان شکاری نے
استقلال سے اپنا سر ہلایا۔

**بابی۔** جی نہیں آپ نے شکار کیا ہے آپ
ہی کنارے لائیے۔ واہ کیا لطف ہے۔ ڈیسیما
ادھر آؤ اور مچھلی کا شکار دیکھو۔

ڈیسیما دوڑ کر کنارے پہونچی اور دلچسپ
تماشہ دیکھنے لگی۔ اسے ذرا بھی اندازہ نہ تھا کہ
اجنبی کس دقت کے ساتھ زبردست مچھلی کو پانی

میں کھلا رہا ہے مگر وہ جوش بھرے نظارہ میں
ہمہ تن اپنے بھائی کی شریک تھی۔
شکاری اپنے صید کو کنارے کھینچ لایا
بابی نے اسے فوراً بنسی کی قید سے رہا کرکے
اپنے جال میں لپیٹ لیا اور ڈیسما بے ساختہ
بول اٹھی۔
**ڈیسما** - کیا پیاری چیز ہے
**اجنبی** - آپ کا شکریہ اور اس نے لانبی
چھڑی بابی کے حوالہ کی
**بابی** - (جناب والا آپ نہایت مشاق
ہیں اگر یہیں کہیں ٹھرے ہوں تو میں یہاں کے
کا۔پرواز مسٹر برائٹ سے شکار کھیلنے کی اجازت
دلوادوں۔یہ وہ خود ہی آگئے
اتنے میں ایک، پستہ قد گداز بدن پہاڑی
سے اتر کر انکے قریب پہونچ گیا جس کے چہرہ
سے زندہ دلی کے آثار صاف ظاہر تھے۔
**بابی** - (مسٹر برائٹ سے) ذرا اس مچھلی کو تو
دیکھئے۔ یہ میری بہن ڈیسما ہے۔ آپ مسٹر
برائٹ ہیں اور اس شریف جوان نے اسے شکار
کیا ہے اسکے بعد نوجوان بابی بے ساختہ کہہ
اٹھا دالیہ یہ کیا ماجرا ہے اکیونکہ مسٹر برائٹ نے
اجنبی کیطرف مڑ کر دیکھا تو اسکا چہرہ حیرت آمیز
خوشی سے سرخ ہوگیا تھا اور لبوں سے بے ساختہ
مائی لارڈ کا نعرہ نکل گیا۔

باقی دارد

# دربار اکبری



ہم نے "اکبر" کے ایڈیٹوریل نوٹ بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۵ء میں لکھا تھا کہ "پنڈت بگ نراین صاحب ممبر کونسل نے ایک قرارداد اس امر کی پیش کی ہے کہ صوبہ جات متحدہ میں علوم مشرقیہ کا ایک ایسا محکمہ قائم کرنا چاہیئے جس میں غیر زبانوں سے اردو اور ہندی میں ترجمے کئے جائیں" خدا کا شکر ہے کہ اس تجویز پر ہمارے صوبہ کی حکومت نے اپنی توجہ مبذول کی ہے۔ چنانچہ آنریبل وزیر تعلیمات نے سال رواں کے بجٹ میں ۲۵ ہزار روپیہ دیسی زبانوں کی توسیع و ترقی کے لئے منظور کیا ہے اور اگر ضرورت ہوئی تو آپ ایک لاکھ روپیہ تک اس سلسلہ میں خرچ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ آنریبل وزیر تعلیمات رائے راجیشور بلی کی علمی کوششیں ہر طرح سے قابل تحسین و تشکر ہیں۔ ہم ان کی اس ادبی خدمت پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔



اس گراں قدر عطیہ کے صحیح مصرف کا فیصلہ کرنے اور اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے ضرورت ہے کہ اردو ہندی کے اہل الرائے اصحاب کا ایک جلسۂ عام آنریبل وزیر تعلیمات کی صدارت میں اس صوبہ کے دارالسلطنت الہ آباد میں آئندہ نومبر یا دسمبر میں منعقد کیا جائے۔ ہم فی الحال مندرجہ ذیل تجاویز پیش کرتے ہیں۔ موقر رسائل زمانہ و سہیل کی جن تجاویز سے ہمیں کچھ اختلاف ہے ہم نے انہیں نہیں لکھا۔

۱۔ ہز اکسلنسی گورنر صوبہ کی سرپرستی میں ایک دارالعلوم قائم کیا جائے اس کے صدر

آنریبل وزیر تعلیمات ہوں۔صوبہ بھر کی یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر صاحبان۔ڈائرکٹر صاحب سررشتہ تعلیمات۔یونیورسٹیوں کے شعبۂ اردو ہندی کے پروفیسران۔سکریٹری صاحب بورڈ آف انٹرمیڈیٹ وہائی اسکول ایکزامیشن ممبر بنائے جائیں۔ان اصحاب کے علاوہ اس دارالعلوم میں صوبہ کے بہترین انشاپردازو معزز اردو وہندی رسائل واخبارات کے مدیران بھی بطور ممبر شامل کئے جائیں۔موخرالذکر ممبران کی نامزدگی آنریبل وزیر تعلیمات فرمائیں گے۔

اس دارالعلوم کے اغراض ومقاصد حسب ذیل ہونے چاہئیں۔

(الف) مختلف زبانوں کی قابل قدر کتابوں کے اردو وہندی زبانوں میں ترجمے کرانا۔

(ب) دیسی زبانوں کا ایک مکمل کتب خانہ قائم کرنا۔

(ج) صوبہ جات متحدہ کے بہترین تصانیف وتالیفات پر انعامات وخطابات دینا۔

(د) صوبہ کے علمی رسائل واخبارات کی مالی امداد وعلمی انجمنوں کی سرپرستی کرنا۔

(ہ) اردو وہندی کے لغات تیار کرانا۔

(و) اخبارات ورسائل کو زبان کی فروگذاشتوں پر توجہ دلانا اور زبان کی ترقی کے متعلق مفید مشورے پیش کرنا۔

امید ہے کہ گورنمنٹ جلد از جلد ہندوستانی دارالعلوم قائم کرکے ہمیں مزید شکریہ کا موقع دیگی کیونکہ یہ اس کا ایک نہایت مہتمم بالشان کارنامہ ہوگا۔



اس میں کوئی شک نہیں کہ جسقدر ہمارا علم بڑھتا جائیگا اسی قدر نئے نئے الفاظ اور محاورات ہماری زبان کے ذخیرہ میں شامل ہوتے جائیں گے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کوئی لفظ سامعہ کے لئے کرخت اور کوئی محاورہ سنجیدہ اور شستہ مذاق کے لئے بارہو تو وہ بھی خواہ مخواہ زبان میں داخل کرلیا جائے۔اردو زبان میں عربی اور فارسی الفاظ کی بھرمار سے ہندو تو الگ رہے

اچھے خاصے تعلیم یافتہ مسلمان بھی پڑھنے سے گھبراتے ہیں - چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

صہبائے اخضرین کی جبین زرپاش میں تبسم سحر کی حنا رنگ جھلکیاں مسکرا رہی ہیں......
فضائے عسکری چشم کا نغر گہریں سواد صبح افروز کی شعلہ گوں شراب اڑ رہی ہے..... موجۂ نسیم معطر کی سحر چکاں لرزشیں دامنوں کی عنبر نواز جنبشوں سے سبزۂ نیلیں پہ بادۂ سلسبیل کی احمریں قطرے برسا رہی ہیں۔

زمزمۂ عندلیب کی ترنم چکانیاں سازہوا میں محلول ہو ہو کر سماعت منتظر کو جذب بیخودی کا خطاب دی رہی ہیں وغیرہ وغیرہ"۔

خیر سے یہ طرز تحریر ہماری ایک انشا پرداز خاتون کا ہے جو اردو کے ایک رسالہ میں شائع ہوا ہے - ہم اپنی معزز خاتون کی خدمت میں انہیں کی ایک بہن کی الفاظ میں (جو مذکورۂ بالا رسالہ میں شائع ہوئے ہیں) صرف اتنی گذارش کرنے کی جرات کرتے ہیں کہ "کیا ستائش کی جاسکتی ہے اس حریم رنگین کی رنگینیوں کی جہاں خدائے میکدہ سجادہ مقدس کی تقدیس آفرینیوں میں عصیاں فروش ہو" آپ مضامین لکھیں اور ضرور لکھیں ہم اس کے مخالف نہیں لیکن مضامین سلیس - عام فہم اور بامحاورہ اردو میں ہوں تاکہ اردو ملک کی متحدہ زبان کہلائی جاسکے "لفاظیات" سے عیوب فن اور زبان کا خیال نہیں رہ جاتا۔



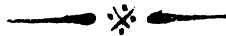
ہماری بدقسمتی سے بقرعید کے دن الہ آباد میں ہندو مسلم فساد رونما ہوا لیکن کوتوال شہر قابل صد آفریں ہیں جن کی مستعدی اور حسن انتظام سے فساد بڑھنے نہ پایا ورنہ خدا جانے کیا حشر ہوتا - اس فساد کا اثر "اکبر" پر جو کچھ ہوا ظاہر ہے متواتر ۱۵ دن تک پریس بند رہا - اور اس لحاظ سے "اکبر" اس مرتبہ دیر میں شائع ہوا۔



اگر ایک طرف اردو کے کچھ انشا پرداز عربی فارسی کے مغلق الفاظ کے استعمال سے ہماری زبان کو نقصان پہونچا رہے ہیں تو دوسری طرف اکثر اصحاب ہندی و سنسکرت کی بے جوڑ بندشوں سے اردو زبان کا کوئی خاص معیار قائم نہیں ہونے دیتے۔ ہم ایک اردو ماہواری رسالہ سے چند نمونے پیش کرتے ہیں۔

"اور یاد رکھو کہ استکتا کے بھاؤ تمہارے دل سے ظاہر ہونے چاہئیں۔ نہ کہ زبان سے؟ ہر وقت اپنی آنکھوں کے سامنے یہ مہاواک رکھو کہ "نکٹ مجھے سو بہرا کیوں کرے" اس سپنج کرنے سے تم تھوڑے عرصہ میں ہی حقیقی اکثر جگہ آستک بن سکو گے۔ آنند!!" "اسی طرح اور بہت سے اشلوک ہیں جن میں ظاہری لباس وغیرہ کا کھنڈن کر کے اور یوگ کے لوازمات و بھرنگ سادھنوں کو ہیچ بتلا کر انترنگ سادھنوں کی فضیلت بیان کی ہے"۔

جو اصحاب اس قسم کی ہندی نما اردو سے ہماری زبان کا "کھنڈن" کر رہے ہیں ان کی خدمت میں التماس ہے کہ وہ براہ کرم اردو پر رحم کریں اور اپنے مضامین اردو رسائل کے بجائے ہندی "ماسک پتر" (رسائل) میں شائع کرایا کریں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ ہمیں ایسی اردو کی ضرورت نہیں ہے۔



ہمیں خود احساس ہے کہ "اکبر" کی کتابت دیدہ زیب نہیں ہوتی لیکن جو اصحاب الٰہ آباد سے واقف ہیں ان کو خوب معلوم ہوگا کہ اس کی کیا وجہ ہے۔ الٰہ آباد میں جو دو چار اچھے کاتب ہیں بھی، وہ گورنمنٹ و انڈین پریس میں مستقل طور پہ کام کرتے ہیں ان کے علاوہ جو کاتب ہیں وہ ہمارے حصے میں آئے ہیں۔ اگر کوئی مہربان خوشنویس لکھنؤ سے الٰہ آباد آنا چاہیں تو ہم معقول معاوضہ پیش کرنے کے لئے تیار رہیں جس کا فیصلہ خط و کتابت سے ہو سکتا ہے۔

مدیر

# بزم احباب



**سہیل** | انجمن اردوے معلی علی گڈھ کا سہ ماہی رسالہ ہے۔ اس کے مرتب ملک کے مشہور انشا پرداز رشید احمد صاحب صدیقی ایم۔ اے (علیگ) ہیں جن کا نام ہی رسالہ کی خوبیوں کا کفیل ہے۔ اپریل نمبر ہمارے پیش نظر ہے' شذرات کے تحت میں جشن جوبلی دار دو مسلم کانفرنس پر عجیب انداز سے تبصرہ کیا گیا ہے۔

"اسلامیات" یعنی علوم اسلامیہ عربیہ پر صاحب زادہ آفتاب احمد صاحب و علامہ اقبال کی قابل قدر رائیں درج کی گئی ہیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ یہ حضرات علوم اسلامیہ سے انتہائی دلچسپی رکھتے ہیں اور ان کا دردمند دل ہمیشہ علوم عربیہ کی ارتقاء کا متمنی رہتا ہے' مگر بہتر ہوتا کہ ان کی آراء عالیہ کے ساتھ ملک کے دوسرے سر برآوردہ عربی حضرات کے مشوروں سے استفادہ کیا جاتا۔

"فارسی شاعری اور اس کی قدامت" پروفیسر شیرانی کا مسلسل مضمون ہے اور ہر لحاظ سے پر از معلومات ہے۔ ادبی رسائل کو ایسے مضامین کی سخت ضرورت ہے۔

"پیام اقبال" رشید صاحب کا تنقیدی مضمون ہے۔ اقبال پر اب تک جتنے مضامین لکھے جا چکے ہیں' بلاشبہہ "پیام اقبال" سب پر فائق ہے۔ "شالامار" کی لفظی تحقیق قابل قدر ہے۔

"اردو کے اسالیب بیان" سہیل کے معیار سے گرا ہوا ہے' معنوی نقائص کے علاوہ لفظی لغزشیں قابل افسوس ہیں اور "اونچی دوکان پھیکا پکوان" والا مضمون ہے۔

ذیل میں چند جملے لکھے جاتے ہیں۔

"نوخیز اردو سرستان علم وادب کے لئے نا و نوش بلند کرتے ہوئے اور سرع
چمن میں میں خزاں کے بعد لیکہ پھر بہار آئی
کا نغمۂ پر ترنم گاتے ہوئے داخل ہوتی ہے"۔

الفاظ مخطوطہ میں تذکیر کے بجائے تانیث درست ہے اس لئے کہ اس کا تعلق اردو سے ہے جو مونث ہے۔ "نغمۂ پر ترنم" کی ترکیب بھی خالی از علت نہیں، نغمہ تو خود ترنم آمیز صدا کو کہتے ہیں۔ اپنی آبیاریوں کے ذریعہ۔ یہ جملہ نثر جدید کی خصوصیات کا آئینہ ہے۔ "ذریعہ" کے بعد "سے" کا حذف بالکل خلاف محاورہ ہے۔

اردو زبان کے لفظیات۔ یہاں بھی "کے" کے بجائے "کی" ہونا چاہیئے۔

اردو نثر میں کوئی کتاب لکھی گئی ہیں یا لکھی جا سکتی ہیں "کوئی" کے بعد جمع کا استعمال اردو میں صحیح نہیں ہے۔ میر غفر غنی کی ایک کسی کے ساتھ باتیں بھی پیش کی ہے اس کو صحیح اردو میں یوں ادا کرنا چاہیئے "میر غفر غنی نے جو باتیں ایک شخص کے ساتھ کی تھیں، ان کو بھی پیش کیا ہے"۔ بعض جملے تو اتنے بڑے ہیں کہ اردو کی لطافت اس کا بار نہیں سنبھال سکتی۔ مثلاً "ابھی نثر اردو ایک نونہال کی طرح اپنے چھوٹے سے گہوارے میں ان تمام عظمتوں سے بے پروا ہے جو مستقبل قریب میں اس کے گلے کا ہار بننے والی ہیں کہ بعض سیاسی ضرورتوں کی بنا پر فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آتا ہے"۔ غرضکہ یہہ مضمون جا بجا لفظی لغزشوں سے پر ہے۔ تذکیر و تانیث کا بہت کم خیال رکھا گیا ہے، طرز ادا میں انگریزیت نمایاں ہے۔

"رجائیت، قنوطیت" کو دیکھ کر بے اختیار "دعائیت، وفائیت اور الٰمیت لکھنے کا جی چاہتا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ فاضل مرتب آیندہ سے ایسی تحریروں کو رسالہ میں جگہ دینے سے حذر فرمائیں گے اس لئے کہ ایک ہی مچھلی تالاب کو گندہ کر دیتی ہے۔

اس مضمون کو قطع نظر کرتے ہوئے سہیل ہر طرح سے اُردو کا بہترین رسالہ ہے اور "اردو" سے کسی حالت میں کم نہیں، بلکہ بعض حیثیات سے اس سے بڑھا ہوا ہے سالانہ قیمت ؏ فی پرچہ ۶ ر کاغذ نفیس، کتابت وطباعت پاکیزہ =



**اخبار جیول** ہر انگریزی مہینہ کی یکم و پندرہ تاریخ کو زیر ادارت جناب مدن دین حسرت سیالکوٹ سے شائع ہوتا ہے۔ دوسرا نمبر مورخہ ۱۵ جون ۱۹۲۶ء خاصکر برائے تنقید موصول ہوا ہے۔ چونکہ ایڈیٹر صاحب شاعر ہیں آپ کی ایک نظم علی قلم سے دوسرے صفحہ پر شائع ہوئی ہے اس کی سرخی "ایک امیدوار کونسل کی ملک سے درخواست" ہے۔ ذیل کا اقتباس ہم نذر ناظرین کرتے ہیں۔

مرے یار کچھ تو کرو رحم تم میری بابت تمہیں کچھ فکر ہی نہیں

مجھ پہ جو گذرتی ہے اب روز و شب تم کو حال زبوں کی خبر ہی نہیں

ملک کے واسطے میں گیا جیل تھا مجھ کو لگتا تو پیارا یہ گھر ہی نہیں

ہم کو حیرت ہے کہ ہم اس کو نظم کہیں یا نثر۔ اردو شاعری میں بلینک ورس (بے قافیہ نظم) کو رواج دینا اچھا ہے لیکن سرے ہی سے بے سُر ہو جانا اردو زبان کو کند چھری سے حلال کرنا ہے۔ ملک کے علمی رسائل کو زبان کی فروگذاشتوں پر توجہ دلانے کی سخت ضرورت ہے ورنہ اردو زبان کا کوئی خاص معیار نہ قائم ہو سکے گا۔ خبریں معمولی شائع ہوتی ہیں۔ اخبار

کی لکھائی چھپائی خراب۔ چندہ سالانہ عہ ملنے کا پتہ: منیجر اخبار جیون شہر سیالکوٹ۔

**نیرنگ خیال** لاہور کا ماہوار مشہور رسالہ ہے اس کے قلمکار حکیم محمد یوسف حسن صاحب ہیں۔ جون کے پرچہ میں ۷ تصاویر ہیں جن میں سے اکثر دیگر رسالوں میں پیشتر بھی شائع ہوچکی ہیں۔ "عورت اور اس کے حقوق" قابل قدر مضمون ہے۔ ایڈیٹر صاحب کا فسانہ اچھا خوب ہے۔ "حسن معصوم" جناب حفیظ جالندھری کی کامیاب نظم ہے لیکن اس سے پیشتر رسالہ پیام ہستی امرتسر میں شائع ہوچکی ہے۔ ضرورت ہے کہ صرف مضمون نگاروں کے ناموں پر ہی اکتفا نہ کیجائے بلکہ اصل رسالہ کا بھی بقید نمبر حوالہ دیا جائے ورنہ قدیم یا جدید کا احتمال رہے گا۔ "نشاط روح" (مجموعہ کلام جناب اصغر گونڈوی) پر جو تبصرہ جناب سہیل نے کیا ہے اور اسی مجموعہ کے ساتھ شائع ہوچکا ہے اب نیرنگ خیال میں مکرر شائع ہو رہا ہے۔

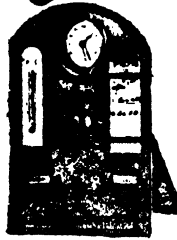
لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ کاغذ معمولی حجم ۷۰ صفحے قیمت سالانہ ے ر جو حجم کو دیکھتے ہوئے کم ہے۔ نمونہ کا پرچہ ۵ ر۔ ملنے کا پتہ۔ منیجر نیرنگ خیال۔ بارود خانہ۔ لاہور۔

**سر تاج** ماہوار زنانہ رسالہ ہے جو امتیاز فاطمہ بیگم عرف ناجیہ تاج بیگم صاحبہ کی ادارت میں شائع ہوتا ہے اس میں عورتوں کی دلچسپی کے لائق مضامین شائع ہوتے ہیں۔ مگر ہمیں اس کی زبان سے اختلاف ہے جیسے "لیکن یہ ہمارے لئے کسی صورت روا نہیں کہ ہم نقاب شرعی آلٹ کر کھلے سر لونڈوں کے مانند نیکریں پہنکر ساقین عریاں کئے ہوئے ہاتھ میں بلّا اُٹھائے ہوئے کرکٹ فیلڈ میں بھاگتی پھریں" "ایک کرایہ کی موٹر پکڑی" ان میں سے بعض غلطیاں ممکن ہے کہ سہو کاتب ہونگی تاہم زبان کی صحت کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ کیونکہ اس رسالہ کے سرورق پر لکھا ہوا ہے "تعلیم یافتہ خواتین کا ماہوار علمی۔ ادبی و اخلاقی رسالہ" لکھائی چھپائی عمدہ۔ حجم ۳۲ صفحے چندہ سالانہ للعہ ر نمونہ کا پرچہ ۶ر۔ ملنے کا پتہ۔ منیجر رسالہ سرتاج۔ لاہور۔

سلیم اللہ

# کلنڈر زنبیل واچ

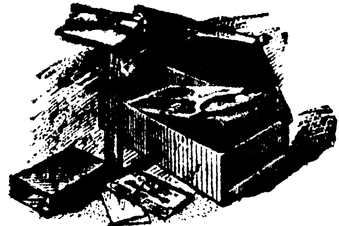
گارنٹی دو سال قیمت صرف
یہ گھڑی کیا ہے عمرو عیار کی زنبیل ہے۔
مہینہ معلوم ہوتا رہے گا۔ حرارت
وقت بہت سچا دیتی ہے۔ پنسل اور پیڈ
یا جس میز پر رکھ دیجائے



۸ؔ؎ علاوہ محصول ڈاک
اس میں قیامت کے دن تک تاریخ۔ وقت اور
دھوپ اور رات کی گرمی سردی کا پتہ چلتا ہے۔
یادداشت لکھنے کے لئے موجود۔ جس کمرہ میں
اُس کی زینت بن جائے۔

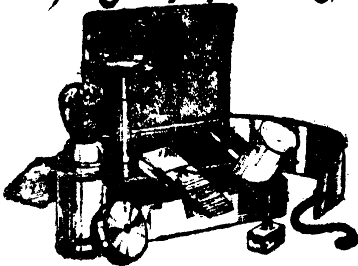
# "VALET"
## Auto Strop
## Safety Razor

## سنہری ویلٹ کا بے مثل سیفٹی استرہ



یہ جگمگاتا ہوا استرہ بات کی بات میں اپنا کام کر گذرتا ہے دیکھنے میں بہت حسین اور کام دینے میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ ۳ عدد پھل ساتھ ملتا ہے جو ۶ مہینہ تک کام دیتے رہتے ہیں۔ پھر قیمت کو پوچھئے تو صرف ۵ؔ؎ جو خوبیوں کے لحاظ سے بالکل کم ہے۔

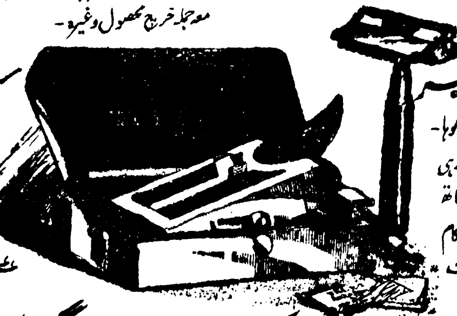
## نقرئی ویلٹ کا لاجواب سیفٹی استرہ



دس برس تک کام لیجئے اور پھر جس جوہری کے یہاں چاہے اپنے دام کھرے کر لیجئے اس کے ساتھ ۱۲ عدد پھل ہیں۔ بکس جرمن سلور کا ہے اور اتنا چمکدار کہ آنکھ نہیں ٹھہرتی۔ اسکے استعمال سے چہرہ گلاب کے پھول کی طرح تر و تازہ رہتا ہے۔ پھوڑے پھنسیاں۔ داغ۔ دھبے سب مٹ جاتے ہیں۔ ہم دعوی کرتے ہیں کہ اگر آپ اسکو نقلی استرہ ثابت کر دینگے تو ہم پوری قیمت واپس دیدینگے۔ قیمت صرف ۱۲ؔ؎ معہ جملہ خرچ محصول وغیرہ۔

## روپہلی ویلٹ کا بے نظیر

نہایت ہلکا۔ بہت پائدار۔ خالص لوہا۔ غائب ہو جاتے ہیں جیسے کبھی جلد پر تھے ہی ویلٹ کا اصلی سیفٹی ریزر ہے اسکے ساتھ ہیں اور ایک ایک پھل دو دو مہینہ کام اسپرنگ دار اور نکل کا ہے قیمت صرف



## سیفٹی استرہ

ذرا سا ہاتھ پھیریے اور بال اسطرح نہیں۔ یہ استرہ دنیا کی مشہور کمپنی جانچ کئے ہوئے بارہ پھل رہتے دیتا ہے۔ اس کا خانہ روپہلا اور عہ۹ؔ؎ علاوہ محصول ڈاک۔

## امپائر ٹریڈنگ کمپنی نمبر ۳۷ جانسین گنج الہ آباد

# "آئین اکبری"

(۱) "اکبر" ہر ماہ کے اخیر ہفتہ میں شائع ہوگا

(۲) "اکبر" کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ حضرت لسان العصر اکبر مرحوم کے غیر مطبوعہ کلام و خطوط شائع کئے جائیں

(۳) "اکبر" میں تمام ایسے عالمانہ و محققانہ مضامین شائع ہونگے جن میں ادبی رنگ غالب ہو

(۴) "اکبر" للعہ بارہ مہینے اور ۱۲؁ میں چھ ماہ کے لئے جاری کیا جائیگا نمونہ کے لئے ۲ کا ٹکٹ آنا ضروری ہے

(۵) جو اصحاب ایک سال کے لئے پانچ خریدار دینگے اُن کی خدمت میں صرف پانچ روپیہ نقد یا ایک سال کے لئے رسالہ "اکبر" مفت حاضر ہوگا

(۶) مضامین کے متعلق جملہ خط و کتابت جناب مدیر کے نام اور دیگر امور و ترسیل زر منتظم کے نام ہونی چاہیئے

(۷) جواب طلب امور کے لئے ایک آنے کا ٹکٹ ارسال فرمائیے۔ جو مضامین شائع نہ کئے جائیں گے ۲ کا ٹکٹ آنے پر واپس کئے جا سکتے ہیں۔

# نرخ نامہ اشتہارات

| تعداد طبع | ایک صفحہ |
|---|---|
| ۱۲ | سعہ۹ |
| ۹ | سعہ |
| ۶ | عسہ |
| ۳ | ععہ |
| ۱ | للعہر |

منتظم "اکبر" الہ آباد

مطبوعہ دی اسٹار الکٹرک پرنٹنگ ورکس نمبر ۲۴ شیو چرن لعل روڈ الہ آباد

پرنٹر سید محمود الحسن بی۔ اے (علیگ)

پبلشر حبیب الرحمٰن صاحب فاضل ادب